

اضافہ شدہ

میتھز اور سائنس



پروگریسو بکس

تالیف
جناب ڈاکٹر ذی الدین صاحب
ایم اے پی ایچ ڈی لندن ایڈیٹر ایبٹ آباد
مہاشعبہ فلسفہ جامعہ شہانہ جید آباد دکن



پست اور معرست

اضافہ شد

تالیف
جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم ای پی ایچ ڈی (لندن) پریسٹریچٹ لار
صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

پر و گریو پبلشرز

۴۰-بی۔ اردو بازار لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرآن اور تعمیر سیرت

مصنف ————— ڈاکٹر میرولی الدین

بار اول ————— 1988ء

بار دوم ————— 2012ء

پرنٹرز ————— حاجی حنیف پرنٹرز

ناشر ————— چوہدری غلام رسول

میاں جوادر رسول

قیمت ————— 300/- روپے

ملے کے پتے

ملٹ پبلی کیشنز

لیصل مسجد اسلام آباد Ph: 051-2254111
E-mail: millat_publication@yahoo.com

اسلام بکس ٹریڈ

۱۲ سٹیج بخش روڈ لاہور 042-37112941

شوروم ملٹ پبلی کیشنز دوکان نمبر 5 مکہ سنٹر نیو اردو بازار لاہور 0321-4146464

پوسٹ مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون 042-37124354 فیکس 042-37352795

پروگریسو بکس

اَنْسَا

مرشدی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام جن
کے فیضانِ توجہ اور برکاتِ تربیت سے اس خدمت کے
لائق ہوا۔

عمرِ حریص در طلبِ کیمیا گزشت
مارا قبولِ اہل نظر کیمیا بس است

میر ولی الدین

مصنف کی دوسری کتابیں

تراجم

- ۸۔ رہنما قرآن
- ۹۔ تاریخ فلاسفہ اسلام
- ۱۰۔ تاریخ مسائل فلسفہ
- ۱۱۔ مقدمہ فلسفہ حاضرہ
- ۱۲۔ فلسفہ کی پہلی کتاب
- ۱۳۔ مقدمہ مابعد الطبیعیات

- ۱۔ قرآن اور تصوف
- ۲۔ فلسفہ کیا ہے؟
- ۳۔ رموز اقبال
- ۴۔ مراقبات
- ۵۔ قنوطیت یا فلسفہ یاس
- ۶۔ ابطال مادیت
- ۷۔ رسالہ اخلاقیات

فہرست مضامین

صفحہ ۹	تہیہ
۱۳ "	عبارت و استعانت
۲۲ "	توحید الوہیت
۱۰۹ "	صاحت
۱۲۲ "	نیکی علم ہے
۱۳۰ "	تسلیم کا مقصد
۱۳۰ "	انسانِ کامل
۱۳۵ "	امام غزالی کا فلسفہ مذہب
۱۵۳ "	تصحیح فکر
۱۵۹ "	احساس
۱۶۷ "	قانونِ تجاذب اور تعمیر سیرت
۱۷۴ "	قرآن اور سیرت سازی
۱۹۷ "	قوتِ ایمانی اور ظہورِ غیب
۲۱۲ "	ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے
۲۲۸ "	کامیاب زندگی کا قرآنی تصور
۲۵۳ "	قرآن اور علاجِ خوف
۲۶۵ "	عزتِ زندگی
۲۶۵ "	دار سے جان نہ
۲۸۳ "	قرآن اور علاجِ حزن
۲۹۳ "	زندگی میں غم کیوں ہے
۳۰۳ "	قرآن اور علاجِ غضب
۳۱۴ "	دعا کا فلسفہ
۳۲۳ "	دعا اور دفعِ بلا
۳۳۱ "	اسرارِ حج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کتاب کے بعض مقالات ۱۹۴۲ء میں "ادارہ اشاعت اسلامیات" حیدرآباد دکن کے زیر اہتمام "قرآن اور سیرت سازی" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، پھر شہ شدہ ان میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب ۱۹۵۶ء میں یہ ایک مکمل اور ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ گویا یوں کتاب چاہے کہ "قرآن اور سیرت" ۱۹۴۲ء کی قرآن اور سیرت سازی سے لب لباب علیحدہ جدید تالیف کی صورت میں سامنے آئی ہے۔

۱۹۴۲ء کے انقلاب سے ملک میں جو حالات رونما ہوئے ان کی موجودگی میں اردو کی کسی ضخیم علمی اور مذہبی کتاب کا شائع کرنا آسان نہیں رہا، پوری فضا بالوسیوں اور تاریکیوں میں گھری ہوئی ہے اور وہ خود اس کے بولنے والے اور اس کی آغوشِ شفقت میں تربیت پانے والے ہیں۔ نکالا دینے پتے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد دکن جس کے چتے چتے سے کبھی دل آویز اور دو تالیفات کے چتے اُبلاتے تھے آج ایک ویرانے میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے ادبی اور علمی مرکز یا تو انقلاب کی موجوں میں لپٹ کر فنا ہو گئے ہیں اور یا ان میں خاک اُڑ رہی ہے۔

لیکن سخت جان ندوۃ المصنفین جس کا وجود کسی حکومت یا ریاست کے اقتدار و سطوت کے وابستہ نہیں تھا، تباہی و بربادی کی تمام منزلوں سے گزرنے پر بھی اس لائق ہر کلاس کی نگرانی میں یہ دعائیت میں ڈوبی ہوئی پُرافادہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

"قرآن اور سیرت سازی" کے تعارف کے سلسلہ میں مولوی محمد اسحاق صاحب بی ایس سی ڈیپ ایڈیشن نے "ادارہ اشاعت اسلامیات" کے معتمد کی حیثیت سے جو دیباچہ لکھا تھا، ماضی کے مٹے ہوئے نقوش کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس جگہ اسی دیباچہ کا ضروری حصہ نقل کیا جا رہا ہے۔

"مکمل صاحب المارہندہ کی تعارف کے حجاج نہیں، صاحب موصوف مذہب اور دنیوی

کے زندہ پیکر ہیں اور ان کے فیضِ صحبت سے بیسیوں طالب علم صبیحۂ اشرف میں رنگے جا رہے ہیں رات دن کے اس مشغلہ سے ان کو انسانی کردار کی تعمیر کا ایسا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس کی نفسیاتی کمزوریوں اور امراض کی تشخیص کر کے قرآن کے ذریعہ ان کے بہترین علاج تجویز فرماتے ہیں، مزید برآں اپنے مقالات میں جا بجا احادیث اور صوفیائے محققین کے اقوالِ نظم و نثر سے بکثرت استہداد فرماتے ہیں۔ اور باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) بار ایٹ لا اور جامعہ عثمانیہ میں مغربی فلسفہ کے صدر شعبہ وغیرہ سب کچھ ہیں لیکن مقالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوفِ قرآنی کے کسی رمز شناس عارف کے قلم سے یہ سطور نکلی ہیں۔

بہر حال یہ کتاب فلسفہ، تصوف اور ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔

میں اس تعارف میں اتنا ہی باضافہ کر سکتا ہوں کہ فاضل دیباچہ نگار نے محترم ڈاکٹر صاحب سے جن خصوصیتوں کو منسوب کیا ہے، میرے ذاتی مشاہدے میں بھی یہ تمام خصوصیات میری دلی الدین کے پیکر میں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، موصوف اس دور کے اہل درجہ کے روحانی فلسفی اور متفکر ہیں، اور ملتِ گم گشتہ کی نبض پر ایک ماہرینِ طبیب کی حیثیت کے ہاتھ رکھنا جانتے ہیں مجھے اُمید ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساسِ کمتری، بے یقینی اور تذبذب کی ظلمتوں میں پھٹے ہوئے ہیں یہ گراں قدر تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط و مستحکم کرنے میں "چراغِ راہ" کا کام دیگی۔

عتیق الرحمن عثمانی

یکم ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

تمہید

پیش نظر کتاب بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت مختلف موضوعوں کے اظہار خیالات پر مشتمل ہے مختلف اوقات میں مختلف تصورات کو واحد نصب العین کے زیر اثر پیش کیا گیا تھا اور اب انہیں یکجا حاضر کر دیا گیا ہے لیکن نصب العین کی غنیت ہی وہ وحدت ہے جو اس کثرت میں متجلی ہے اور انہیں ایک شیرازہ میں باندھ رکھا ہے۔ اس نصب العین کو یہاں مختصراً پیش کرنا مقصود ہے، عہد حاضر کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ دین معاملہ ہے ان چندنا کامیاب افسردہ دل، آشفتمانغ ضعیفوں کا جن کے ہاتھ سے دنیا نکل چکی ہے، جن میں متلع ذہنی سے محظوظ ہونے کی قابلیت باقی رہی ہے اور نہ خواہش، یہ سرت و شادمانی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے ہیں اور حزن و غم کے آغوش میں ان کے دن گزر رہے ہیں۔ دنیا میں کامیابی، کامرانی، مسرت و راحت کا حاصل کرنا ذہنی اصول کے عاقلانہ استعمال ہی سے ممکن ہے ذہنی اصول کو ان میں کیا دخل ہے۔ شاید قبر کے اس طرف ان کا کام پڑتا ہو تو ہو!

پیش نظر اوراق میں اس مقالہ کو اس کی تمام تفصیلات میں رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصولاً بتلایا گیا ہے کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے سیرت کی تعمیر ضروری ہے اور جب تک سیرت کی تعمیر قرآنی اصول پر نہ ہو دنیا میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ چین اور طمانیت کا جمع ہونا ممکن نہیں! کامیابی محض مال یا پی کا نام نہیں، بلکہ مراد ہے طمانیت روح اور پردہ قلبی کا جو محض مالیات کو کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ واضح کیا گیا ہے کہ ذہنی عقل و عاقل

میں روشنی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حرص و ہوس سے آزاد ہو کر علم وحی کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور حقیقت میں عاقل و بالغ وہی ہے جو ہوس سے آزاد ہے۔

خلق اطفال اندر جست خدا نیست بالغ جز ہیدہ از ہوی (رومی)

کامیابی و کامرانی، مسرت و طمانیت اس مردِ حق کا انعام ہے جس نے اپنی عقل کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل پر قربان کر کے اپنی ذات میں تقویٰ کے اوصاف پیدا کر لیے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کو جہاتِ دینی و دنیوی میں کافی تصور کر لیا ہے۔ الیس اللہ بکاف عبداً۔

عقل سرباں کن پیش مصطفیٰ جسی اللہ گو کہ اللہ ام کفے

زمین خسرو جاہل ہی باید شننا دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد این عس رازیدہ در خانہ نہ شد (مثنوی)

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی طریقہ سے تسخیر جہات میں کامیابی حاصل کی تھی، ان کے شکوہ و جلال سے سلاطین کا نپ اٹھے تھے، انہوں نے حریت و آزادی کا تسلط دنیا میں قائم کر دیا اور جبر و استبداد کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی اسبوحہ پر ایک بار پھر زندگی کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے، ناوران اوراق کا مقصد عمید حاضر کے نوجوانوں کو اس کی طرف دعوت دینا اور اس کی تفصیلات کو ان پر واضح کرنا ہے۔

خود مولف کو اس اسبوحہ کی طرف کچھ سال قبل ایک عارف تامم للعرفت نے بلایا اور اپنی تباہ فیض ترجمان سے اس کی تفصیلات کو سمجھایا اور سات سال کے دوران میں مختلف اوقات میں ہر جنسی کی کلی وضاحت فرماتے رہے۔ مغربی و مشرقی فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے جس دماغ نے تربیت پائی تھی، اور جس کی عقل کو بقول اقبال "تقیہ سے فرصت

میرا اشارہ ہے مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ کی طرف جو ۲۲۔ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ اپنے فراتوں
مغزوں چھوڑ کر زمینِ اعلیٰ سے ہلے فرس و درمیان و جنت نعیم۔

تھی اور جو بالآخر عقل کی گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز آ گیا تھا اس صاحبِ جنون نے اپنے ایک نکتہ سے کہ عقل تابع وحی ہو کر ہی اپنے بتوں سے نجات پاسکتی ہے، لات و منات کی بندگی سے آزاد ہو سکتی ہے۔ اس کو دل نیا زمند و نگاہ پاک باز کا شیدا کر دیا جو حصول معرفت کا واحد طریقہ ہے۔ اس نکتہ کے قلب میں اترنے کے بعد وہی ہوا جس کی اقبال نے خریدی تھی۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جساں دیگر شود

اس روحانی انقلاب کے بعد جہان جیسا نظر آنے لگا اس کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اولاً اصول موضوعہ کو پیش کیا گیا ہے، ان کو اپنی ہمت اور اختیار کے استعمال سے عمل میں لانے کی تاکید کی گئی ہے، پھر انہی اصول کو مختلف مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ سیرت سازی کے لیے خوف و خزن و غضب کے ذبیحہ کے لیے، کامیاب زندگی کے لیے، طمانیت و بردباری کے حصول کے لیے ان نسخوں میں سے اکثر کو معارف کے صفحات میں پیش کیا گیا، اور اہل ملک نے ان کو پسند بھی فرمایا ہے۔ یہاں یہ سب یکجا حاضر ہیں، اس دل کی سوغات ہیں جو عقل کا غلام نہیں!

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبریل نے

(اقبال)

جو عقل کا غلام ہے وہ دل نہ کر قبول!

مگر زبان عقل کی ہے، تصورات و تعلقات سب عقلی ہی ہوتے ہیں اور انہی میں فصاحتِ روحانی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ لہذا مقصود مفہوم ہے نہ کہ زبان جو محض ذریعہ ہے۔

والسلام علی من اتبع الهدی!

۲۷ مارچ ۱۹۳۵ء

میر ولی الدین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عبادت و استعانت

اے مردِ مہل تمناہمہ تو سے دربر من مایہ سوداہمہ تو
 ہر چند بہ روزگار درمی نگریم امروز ہمہ قوی و فردا ہمہ تو (ابوسیدہ ص ۸۸)

انسان بلکہ تمام حیوانات کی زندگی کا پہلا قانون جلبِ منفعت و دفعِ مضرت ہے، تحفظِ ذات اور تولیدِ نسل دونوں کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ ان چیزوں کو طلب کرے جو اس کی زندگی کے خطوطِ حیات میں مددِ معادن ہیں، اور ان چیزوں سے گریز کرے جو اس کو عدم کی طرف لے جاتی ہیں، یا قوتِ حیات کی تحدید کا باعث ہوتی ہیں۔ اشیاء کی ابتدائی تقسیم اسی نقطہ نظر سے کی جاتی ہے، اشیاء یا تو نافع ہیں یا ضار، مفید ہیں یا نقصان رساں، اچھی ہیں یا بُری! عضویت پر جب ان کے اثرات کا رتبہ ہوتا ہے تو لذت، محبت، فریفتگی یا اطاعت پیدا ہوتی ہے، یا الم، نفرت، خوف اور وحش۔ ان میں سے ایک بالطبع محبوب ہے، مرغوب ہے، تو دوسری فطرۃً غیر محبوب و نامرغوب، ایک کے حصول کا وہ کوشاں ہوتا ہے تو دوسرے سے گریزاں انسان کی زندگی کا تار و پود ہی جذبات ہیں، ان کا زور مردِ افکن ہوتا ہے۔ ان کے شر و شور سے اس کو فرصت ملتی ہے اور نہ نجات، یہاں تک کہ زندگی کے مقررہ دن ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے:

من بلغ بہاں راقعے دیدم پس مرغش ز ہوا و پوسے دیدم و پس
 از صبح وجود تا شبان گاہ عدم چون چشم کشودم نفسے دیدم و پس
 (سجالی استرآبادی)

اپنی زندگی کے مختصر قیام میں ہر شخص اشار کی تغیر و حدوث کا اچھا مشاہدہ کرتا ہے، کائنات میں ایک دائمی تغیر جاری ہے، کوئی شے ساکن نظر نہیں آتی، سکون و ثبات فریبِ نظر معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ذرہ کائنات میں ایک ٹپ سی نظر آتی ہے، کارخانہ وجود کو کہیں قیام نہیں، شان وجود ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے، قمری تجلی ہر شے کو ہر لحظہ فنا کر رہی ہے اور حالی تجلی ہر لحظہ وجود بخش رہی ہے۔

ہستی کہ عیاں نیست دو آن در سخاں در شان و گریوہ کند ہر آنے
 این نکتہ بجز کل یوم ہو قی مشان گریادت از کلام حق بر ہانے جاہی

اشار کے اس تغیر و تبدل، تلکون و حدوث، فنا پذیری و زوال کی جہت جب چشم بصیرت رکھنے والے انسان پر نمایاں ہو جاتی ہے تو اپنے اپنے فقر و احتیاج کی وجہ سے ذل و افتقار یا بندگی کی نسبت جو ان سے قائم کر رکھی تھی، وہ یکدم کٹ جاتی ہے، ذواتِ خلق کا فقر اس کی نظروں میں واضح ہو جاتا ہے، اور اس کو اس ذات کی تلاش ہوتی ہے، جو حدوث و تغیر سے منزہ ہے، جو قائم بالذات ہے..... جو واجب و قدیم ہے، صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہے، فعال ہے سائے جہان کی مالک و حاکم و مولیٰ و رب ہے۔

اب مذہب یا دین کا حاصل بھی اتنا ہی ہے، کہ ذل و افتقار کی نسبت (جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ذواتِ خلق سے قائم نہ کی جائے اور احتیاج اور مرادات میں استعانت ذواتِ خلق سے نہ کی جائے، بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذات اللہ ہے، یہی مفہوم ہے اس دعوتی کلمہ طیبہ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ" کا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات قابل عبادت و مستحق استعانت (الہ) نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی فقر یا احتیاج کو رفع کرنے کے لیے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الہ" قرار دیتا ہے، خواہ یہ چیز عناصر سے ہو یا حادثات سے

نبات سے ہو یا حیوانات سے، فوق الفطرت ہو یا فوق البشر، ان سے رفع احتیاج کے لیے آفات طلب کرتا ہے، اور استعانت کے لیے ان سے ذل و افتقار کی نسبت قائم کرتا ہے، اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پر نافع اور ضار خیال کرتا ہے، اور یہی خیال اس کو اپنے سے کم تر مخلوق کے لگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

جو اس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لیے دین حق کا پیغام محمد عربی (فداہ ابی و امی) نے عالم کو سنایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر، فطرت کا شہکار ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا۔ اس کی گردن اگر جھک سکتی ہے تو اسی ایک ہمہ خیر، ہمہ داں و ہمہ بین و ہمہ توان مہستی کے آگے، جس کے دست قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، جو جملہ صفات کمالیہ سے متصف ہے، اور تمام عیوب سے منزہ اور مبرا ہے، یہی ہستی ہماری الہی ہے، یہی قابل عبادت ہے، یہی مستحق استعانت ہے، یہی ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہماری رب ہے، مولیٰ ہے، عالم ہے، اسی کے ہم مخلوق ہیں، مملوک ہیں، مرہب ہیں، عبد ہیں، محکوم ہیں، اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں، اور اسی سے تمام حاجات و مرادات میں بھیک مانگتے ہیں، یہی ذات غنی ہے اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں، اس کے فقیر ہو کر ہم سائے عالم سے غنی ہیں۔

یہ پیغام صدقِ محض ہے، ہماری عزت نفس کے عین مطابق ہے، حق و خلق کے رابطہ کا سچا اظہار ہے! اس کو مان کر انسان حقیقی معنی میں انسان بنتا ہے، بے خوف، بے جگر مجاہدین کی امید و بیم کا مرکز وہی ایک اللہ ہوتا ہے، جو سائے عالم کا مالک اور حاکم ہے اب مجاہدین کی زندگی کی ہر نبش اسی مالک و حاکم کے حکم کے تحت ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام کی تعمیل میں، امر کے امتثال میں وہ ایک جان دیتا ہے، تو ہزار جان پاتا ہے۔ اس کا ضعف قوت ہے، اس کی ذلت عزت ہے، اس کا فقر غنا ہے بدل جاتا ہے موجودات عالم میں سے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ **لَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُواْ اِيْنَ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ**۔ کا حکم اس کو سارے عالم سے

لے کر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو۔

بے خوف کر دیتا ہے، نہ وہ کسی سے اُمید ورجا رکھتا ہے، اَلَيْسَ اللهُ بِكَافٍ عَبْدًا اس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے، ذواتِ خلق سے اُمید و بیم کی نسبت کتنے ہی وہ نفس مطمئنہ حاصل کر لیتا ہے، اور اپنے رب سے راضی ہو جاتا ہے، اللہ کو راضی رکھ کر وہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے، اب وہ غنی عن اشیء ہے، کوئی چیز اللہ سے بتر ہو سکتی ہے، جس کے حصول کی وہ خواہش کرے، اب سب کچھ اسے حاصل ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے لَكَيْدًا تَأْسُوا عَلٰی مَا فَاَنكَرُوا وَلَا تَعْرِضُوْا لِمَا اَنَّا كَرِهْنَا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اسی کو حاصل ہے، وہی مخاطب ہے اس قول کا: اَلَا تَتَّقُوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ ۗ

دیکھو! الہ کے فہم نے اس کو کیل سے کیا کر دیا، یا تو وہ ایک حیر اور ذلیل جانور کی طرح ہر ایک سے ڈرتا اور لرزتا تھا، ہر ایک کو نافع و ضار قرار دیتا تھا، ہر عبودیت ختم کرنا تھا، ہر دعا و اعانت کا خواہاں تھا، ان ہی کی عبادت و عبودیت میں زندگی گزار رہا تھا۔ مشوش پریشان حیران بخود ضعیف اور مطلوب بھی ضعیف "ضَعُفَ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوْبِ" یا اب علم رسالت کے جاننے اور ماننے کے ساتھ ہی لا کی تم شیر ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنے جاہل ساتھیوں سے قرآن کے الفاظ میں پوچھتا ہے:

اَفْغَيَّرَ اللهُ تَأْمُرُوْنِيْ اَعْبُدُ اَيْهَا الْجَاهِلُوْنَ ۗ

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

غیر اللہ کی عبادت و عبودیت کا جو اوہ گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے، عمر میں پہلی مرتبہ تحریت محسوس کرتا ہے، خوف کا بھاری پتھر اس کے سینے سے اٹھ جاتا ہے، اپنے حقیقی مولیٰ کے آگے جھکا جاتا ہے، اور ان کو رحیم پاتا ہے، كَاذِبًا لِّمُؤْمِنِيْنَ سَرِيْحًا كِي بَشَارَتِ

۱۔ کیا اللہ بندہ کے لیے کافی نہیں۔

۲۔ تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا، اور نہ بیٹھنی کر واس پر جو تم کو اس نے دیا ہے۔

۳۔ تم ہی بلند ہو اللہ تم سے سنا کر ہے۔

۴۔ لے جا لو کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا امر کرتے ہو۔

اس کو ہر طرح مطمئن کر دیتی ہے، اب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ اپنا
 کے بعد شانِ رحمت ہی سے پیش آئینگے، ان کے علاوہ رحیم ہونے کے حاکم و حکیم ہونا، اس
 کے دل کو اور قوی کر دیتا ہے، وہ انہیں اپنے ہر امر میں متصرف سمجھتا ہے اور ان کے فعل
 کو سراسر حکمت سے مملو دیکھتا ہے، ان ہی کے حکم کے مطابق ان کو اپنے کاموں میں وسیل
 بناتا ہے فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ان کا فرمان ہے كَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا کہہ کر وہ آزادی وطمینان
 کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے، اب کہاں یہ اور کہاں وہ جاہل جو غیر اللہ سے دل
 افتقار کی نسبت جوڑ رہا ہے۔ صحیح ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ
 وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ لِي (الفاطرہ)

دین کا اجمال، عبادت و استعانت، اس کا حاصل، تحفظ توحید۔ اب اس اجمال کی کسی قدر
 تفصیل ضروری ہے۔

عبادت غایتِ تدلل کا نام ہے جس کا اظہار محبوبِ حقیقی کے آگے کیا جاتا ہے۔ اس کے
 معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں، نماز کے تمام اعمال و ارکان پر غور کرو۔ عبادت
 یا اظہارِ ذلت کا مفہوم بخوبی تمہارے دل نشین ہوگا، عابد نماز کا قصد کر رہا ہے، مصلے کی
 طرف بڑھ رہا ہے، زبان پر ہے۔ اِنِّیْ ذٰہِبٌ اِلَیْ رَبِّیْ سَیِّدِیْنِ۔ دل غیر حق سے پاک
 ہی، حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بزرگی کا مستحق نہیں سمجھتا، اور اسی فہم کے ساتھ تکبیر تحریمۃ العدا کبر
 کہتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے رو برو ہو کر کہتا ہے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ
 وَالْاَرْضِ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ دل پوری طرح متوجہ حق ہے، ورنہ جانتا ہے
 کہ جھوٹ کی سزا کیا ہے یُنَادِیْ عَوْنَ اللّٰهِ وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ اب نیت میں بھی خلوص سچو حق تعالیٰ

لے برا نہیں اندھا اور دیکھتا اور نہ اندھیرا اور اُجالا اور نہ سایہ اور لوہ اور برا نہیں جیسے اور نہ مردے
 لے میں اپنے رب کی طرف چلا ہوں وہ میری ہدایت کریگا۔
 لے دعا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دینا۔

ہی کے لیے نماز پڑھ رہا ہے، عاشقانہ ایمان کے پیدا ہونے کے لیے پڑھ رہا ہے، عادت کے
 تحت نہیں، انہی کے حول و قوت سے پڑھ رہا ہے، ثناء میں حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت
 و جبروت کا اظہار کر رہا ہے، اور توحید کا اقرار لاکہ غیرک سے ہو رہا ہے، اب حضوری
 میں دست بستہ نظر بھی کیے ذلت و مسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے، زبان پر جاری ہوا حمد
 اللہ اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ عالم میں کوئی ذات مستحق حمد نہیں، سوائے محامد و محاسن کی
 وہی ایک ذات لاشریک لہ سزاوار ہے، جب رَبِّ الْعَالَمِينَ کہتا ہے تو جانتا ہے کہ لا سرت
 سواہ، ربوبیت اسی کو زیبا ہے، عالم تمام اس کا مرہوب ہے۔ الرحمن الرحیم کہتے وقت عالم
 رحا میں داخل ہوتا ہے، رحمت و کرم کی امید دل میں پیدا ہوتی ہے، جانتا ہے کہ رحمانیت
 کا تعلق تو ساری کائنات سے ہے، رحیمیت خصوصی شے ہے، اور مومنین سے مختص گان
 بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا، مَا لِكَ يَوْمَ الدِّينِ کہتے وقت عالم خوف کا مشاہدہ کرتا ہے، روز قیامت
 حق ہے، اور یہ وہ دن ہے کہ اس کی شان میں فرمایا گیا يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا۔ اس امید
 بیم کی حالت میں عرض کرتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ حق تعالیٰ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں، ذل
 و افتقار کا رشتہ آپ ہی سے جوڑتے ہیں، وَايَاكَ نَسْتَعِينُ آپ ہی سے استعانت کرتے ہیں، جانتے
 ہیں کہ لا فاعِلٌ فِي الْوَجُودِ اِلَّا اللهُ ماسوی اللہ سے بالکل اعراض کر کے آپ ہی کی طرف بالکل
 رجوع ہوتے ہیں، ہم آپ کے سوا استعانت کی جہت سے غیر کو کیوں پکاریں جب کہ ہمیں یہ
 سنا دیا گیا ہے اور ہم نے بھی تجربہ سے اس کی توثیق کر لی ہے کہ آپ کے سوا کسی میں حول و قوت
 نہیں لا حول ولا قوۃ اِلَّا بِاللّٰهِ اس لیے کہ وہ نہ نہیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر، اس مدح و
 ثنا و اقرار عبودیت کے بعد التماس و دعا اهدنا الصراط المستقیم حق تعالیٰ راہ مستقیم کی تہا
 فرمائے، نَفْسٌ دہوی سے چھوٹیں، آپ کا قرب نصیب ہو، صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
 غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ اہل ایمان کی راہ پر چلنا نصیب ہو جو نبی و

لہ جس دن نہ کر سکے کوئی نفس، کسی نفس کا کچھ۔

اولیاء کی راہ ہے، یہی اہل انعام ہیں وَالَّذِينَ اتَّعَى اللَّهُ عَلَيْهِمَ الْبُيُوتَ وَالصَّالِحِينَ وَالشَّاهِدِينَ
وَالصَّالِحِينَ۔ مغضوبین وصالین کی راہ نہیں جنہوں نے غیر اللہ سے عبادت و استعانت کا
رشتہ قائم کر کے ہمیشہ کے خسارہ میں اپنے کو مبتلا کر لیا۔ اُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ الَّذِينَ خَسِرُوا
أَنْفُسَهُمْ!

اس حمد و ثنا، التماس و دعا کے ساتھ وہ کلام ربانی کی چند اور آیتیں احکام خداوندی
کے معلوم کرنے، تکرار سے ان کو اپنے ذہن میں جملنے، ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں کمانے
اور حق تعالیٰ سے ہر گوشی کرنے کے لیے پڑھتا ہے، اور پھر فوراً پیشی میں جھک جاتا ہے، گو اپنے
رحمان و رحیم آقا کے پیٹ میں موندی سے دیتا ہے، اس طرح اپنی ذلت کا مزید اظہار کرتا
ہے، اسی حالت میں اس کی زبان سے اس کے مولیٰ کی تقدیس و تزیین و تمجید جاری ہوتی ہے
اپنی بے ماگی، فقر و ذلت کا احساس قلب میں واضح طور پر موجود ہوتا ہے، جب سر اٹھاتا
ہے تو حق تعالیٰ اسی کی زبان سے فرماتے ہیں سَمِعَ اللَّهُ لَعْنَتَ حَيْدَا اس طرح اس کا مرتبہ
بلند کرتے ہیں۔ جو سر معروض حقیقی کے آگے جھکتا ہے، وہ مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتا، وہ
سب سے بلند ہوتا ہے، ممتاز ہوتا ہے، بے نیاز ہوتا ہے، وہ ایک لاقیمیت جو ہر چیز پر
مستحق ہے۔ من رکن الی المولیٰ و مال الیہ احرق ما لله بنورہ حتی یصیرہ جوہراً لا قیمت لہ
اس سرفرازی کے شکر یہ ہیں وہ حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے، اور پیروں پر گر جاتا ہے، پیر کو لیتا ہے
اور اس طرح غایت تذلل کا اظہار کرتا ہے، زبان پر آقا کی عظمت و رفعت و علو کا اقرار جاری
ہوتا ہے! اس اظہار تذلل میں وہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک پاتا ہے و جعلت قرۃ عینی فی القلۃ
یہ آنکھ کی ٹھنڈک اس کو اپنے محبوب مولیٰ کے مشاہدے سے ہو رہی ہے، یہی اس کا کمال ہے
یہی اس کی معراج ہے۔ الصلوٰۃ معراج المؤمنین۔

سے جو اپنے مولیٰ کی طرف جھکتا ہے، اور اس کی طرف بائیں ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنے نور سے جلا دیتا ہے، یہاں تک
کہ وہ لاقیمیت جو ہر چیز پر جاتا ہے۔

سے میری آنکھ کی ٹھنڈک نمازیں رکھی گئی ہے۔ (لسانی باب عشرۃ النساء)

معبود کا نہ صرف خیر محض ہونا ضروری ہے بلکہ اس کا ہمہ توان یا قادر مطلق ہونا بھی لازمی ہے، یہ اپنی لامحدود قوت اور لامتناہی طاقت کی وجہ سے ہماری حفاظت کرتا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کرتا ہے، مرادوں کو بر لاتا ہے، اس کے اعتصام کے بعد ہمیں اس کی نصرت و اعانت کا قطعی یقین ہو جاتا ہے، شرک کے مسئلہ کی توجیہ سے عاجز ہو کر نتائج (Pragmatic) لے خدا کے ہمہ توان ہونے کا انکار کر دیا، لیکن جو خدا قادر مطلق نہ ہو، وہ معبود حقیقی کب قرار دیا جاسکتا ہے، جو خود شر پر غالب نہ ہو ہماری مدد کیسے کر سکتا ہے، ہمارا مولیٰ اور نصیر کیسے ہو سکتا ہے۔ شرکی توجیہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ہم اپنے معبود کو فعال مطلق ہمہ توان مانتے ہیں، افعال و آثار کا مرجع اسی کو قرار دیتے ہیں، حول و قوت کا اسی کو مبدی سمجھتے ہیں، اسی لیے اس سے استعانت چاہتے ہیں، اور اس کے "نعم المولیٰ ونعم النصیر" ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ اعتصموا باللہ ہو مولکم نعم المولیٰ ونعم النصیر!

جب قوت صرف اسی کو حاصل ہو لا قوۃ الا باللہ حرکت کا بھی وہی مبدی ہو لا حول ولا قوۃ الا باللہ تو فعل جو حرکت و قوت ہی کا نتیجہ ہے، صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہوتا ہے اور ذاتِ خلق سے اس کی بالکل نفی ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھنے ہی اس کی بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے، اور وہ لا تتحرك ذرة الا باذن اللہ کے معنی سمجھ جاتا ہے، غیر اللہ سے استعانت کی نسبت کاٹ کر اسلم عبدی و استسلم کامصلح بن جاتا ہے!

اپنے رب سے استعانت کے طریقے کیا ہیں؟ بصیرت محمدیہ نے جن طریقوں کی تعلیم فرمائی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

اپنی حاجتوں اور مرادوں میں حق تعالیٰ سے دعا کرو۔ دعا کا حکم ہے، اور اجابت کا وعدہ

۱۔ زمانہ جدید کے فلسفیوں کا ایک گروہ جن میں ولیم جیمس، ایچ جی ویلس، برنارڈ شاو وغیرہ داخل ہیں۔
 ۲۔ تمہیں اپنے مولیٰ کا اعتصام چاہیے، وہی تمہارا اچھا مولیٰ ہے، اور اچھا دعا گزار۔
 ۳۔ کوئی ذرہ بغیر اللہ کے حکم کے حرکت نہیں کرتا۔

ادعونی استجب لکم فی تعالیٰ جو دعویٰ محض ہے، عطا محض ہے، ان میں بخل کا شائبہ نہیں، یا یوسیٰ محرومی
 ان کی درگاہ سے نہیں، تشریح کے لیے فرما رہے ہیں۔ لا تائسوا من روح اللہ۔ وہ حکیم بھی ہیں
 ان کا ہر فعل حکمت رکھتا ہے، وہ ہمارے خیر کو ہم سے بہتر جانتے ہیں، اگر وہ ہماری کسی دعا کو قبول
 نہیں فرماتے ہیں تو اسے نہ قبول فرمانے ہی میں ہمارا فائدہ ہے، اسی لیے کہا گیا ہے منع
 عطاء مرد کا کمال اس میں ہے کہ ان کے منع کو عطا جانے، کسی عاشق نے اسی جذبہ کے
 تحت کہا ہے:

اگر مراد تو ہے دوست نامرادی است مراد خویش دگر بار من خواہم خواست
 سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے لا ابالی علیٰ ای حال اصبر علیٰ ما
 اکره او علیٰ ما احب لانی لا ادری الخیر لہما۔ حق تعالیٰ خود بہترین تعلیم فرما رہے ہیں اور
 ایک نہایت دقیق نکتہ کی تعلیم فرما رہے ہیں:-

عَسَىٰ اَنْ تَكُوْهُوَ اَشْيَا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَّ عَسَىٰ اَنْ يَّجِيْئَ اَشْيَا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَّ اللّٰهُ

يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ تہ (البقرہ - ۱۰)

اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف کہتے لگتے ہیں، ہمہ آں باد کہ او خواہد آن مباد کہ ما خواہم اور خواہ
 شبلی نے عارف کی تعریف ہی اس طرح کر دی کہ ”عارف اوست کہ منع نرزد او دست تراز
 عطا باشد“ ہمیں سے رضا کا مقام شروع ہو جاتا ہے، جو استعانت کا بلند ترین طریقہ ہے۔
 بہر حال اگر حق سبحانہ تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت سے بندہ مومن کی دعا قبول نہیں فرماتے
 تو اس کے قلب کی حفاظت فرما دیتے ہیں، مطلوب کی بنائے سے خیال پلٹ دیتے ہیں

اللہ کی رحمت سے ماپوس نہ ہو۔ اللہ مجھے اس امر کی پروا نہیں کہ میں کس سال میں صبح کروں گا، ایسی حالت

میں جس کو میں پسند نہیں کرتا یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لیے بھلائی
 کس حالت میں ہے۔

اللہ شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں، اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز، اور وہ بری ہو
 تمہارے حق میں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حکایت شکایت، جزع فزع کی طرف مائل نہیں کرتے، رضا کے مقام میں پہنچا دیتے ہیں، اور وہ لکل اجل کتاب کہہ کر حق تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے، اجابت دعا کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مطلوب تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ اس کی دعا کو رد نہیں فرماتے بلکہ اس کی کسی بلا کو رد کر دیتے ہیں، گو اس کو بدل کا علم نہیں ہوتا، ایک آخری صورت یہ بھی ہے کہ دعا اگر وہ دنیا میں نہیں پاتا تو آخرت کے لیے یہ ذخیرہ کیا جاتا ہے۔

ان العبد یروی فی صحائفہ فیوم قیامت کے دن بندہ اپنے اعمال نامہ پر وہ نیکیاں

القیامۃ حسنات لا یرقہا فیقال دیکھو، جن کو وہ نہیں پہچانے گا۔ اس سے کہا جائیگا کہ یہ

انھا بدن سوالک فی الدنیا اس سوال کا بدلہ میں جو تو نے دنیا میں کیا تھا۔

لم یقدہ فضاہ فیہا (حدیث) لیکن تیرے مقدر میں دنیا میں ان کا ملنا نہ تھا۔

ہر صورت اجابت دعا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ وعدہ مطلق ہے، مقید نہیں کہ اسی وقت اور اسی صورت میں پورا کر دیا جائے، جس وقت اور جس صورت میں کہ بندے نے دعا مانگی ہے، فافہم۔ اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کیوں رسول عربیؐ نے اس کی تعلیم فرمائی تھی۔

اللہم اکتفی کل مہم من حیث شئت وکیف شئت وانی شئت ومن این شئت

استعانت کا دوسرا طریقہ اپنے کاموں میں حق تعالیٰ پر توکل کرنا ہے، اگر ہمیں اس بات

کا یقین ہو، محض علم نہیں، یعنی تحقیق ہو، محض نقل نہیں، یا جدید نفسانی اصطلاح میں

یوں کہو کہ اگر یہ بات ہمارے تحت شعوری نفس میں اتر گئی ہو، کہ فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہیں،

کینے والے خود بدولت ہیں، افعال و آثار کا مرجع خود ہیں، حول و قوۃ کا سبب خود ہیں، اور

پھر اس کا بھی تمیق ہو کہ ایمان کے بعد وہ رحیم بھی ہیں۔ کان بالمومنین رحیما۔ ولی ہیں،

واللہ ولی المؤمنین۔ تو ہم اپنے تمام امور ان کو تفویض کرنے میں خوشی سے آمادہ ہو

جائیں گے، اور اس تفویض کے ساتھ ہی فکر سے آزاد ہو جائیں گے، طمانیت و مسرت سے ہمارے

قلوب بھر جائیگی، اور کسی مست محبت کے الفاظ میں کہہ اٹھیں گے۔

وكلت الی المحبوب امری كلہ فان شاء احيانی وان شاء اذلتنی

توکل اپنی حول و قوۃ سے بری ہونے ہے، اعتصام باللہ ہے۔ ذوالنون نے توکل کی تعریف اسی طرح کی ہے: التوکل ترک تدبیر النفس والافتخار عن المحول والقوۃ، اور سمری سقطی نے بھی ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے التوکل الافتخار عن المحول والقوۃ، ان تعریفوں کا ماخذ حدیث نبوی: لا حول ولا قوۃ الا باللہ اور قول عز و جل لا قوۃ الا باللہ توکل قلبی عمل ہے، یعنی قلب میں یقین جاگزیں ہو کہ مجھ میں اور کسی شے میں نہ اثر ہے نہ قوت ہے، نہ حرکت ہے، مجھ میں اور ہر شے میں اثر و قوت و حرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں، وہ جس طرح میرے خالق ہیں میرے افعال کے بھی خالق ہیں، خلقت کم و ما تعملون۔ میرے اقتضائے فطرت کے عین مطابق افعال کی تخلیق فرما رہے ہیں، میرا اقتضا، میرا اختیار ہے، لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جا سب سے ہو رہی ہے۔ اس لیے اسبابِ قطعہ کے استعمال و اختیار کا مجھے حکم ہے، حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں جانتا ہوں کہ اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو تو جماع کو ترک نہیں کر سکتا، بھوک کی تشفی کے لیے نوالہ کا اٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اتارنا قطعی ضروری ہے، توکل یہاں تک عمل و تعطل کا نام نہیں، علم و حالت کا نام ہے، قلبی کیفیت کا نام ہے، اس یقین کا نام ہے کہ ہاتھ میں قدرت، حرکت، فعل سب حق تعالیٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہیں تو نوالہ منہ تک نہ پہنچے، ہاتھ شل ہو جائے، کھانا بھی چھین جائے، نظر ان کے فعل پر ہے، فضل پر ہے۔ اپنے زور بازو پر نہیں، کسب پر نہیں، دست بجا ردل بیار، توکل ترک اسباب نہیں ترک رویت اسباب پر

ہے میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔
توکل اپنے نفس کی تدبیر کو چھوڑنا، اور اپنی حول و قوت سے نکل آنا ہے۔ علامہ حضرت شاہ حیر قلیہ

مبادیات کو سمجھ جانے کے بعد رزق کے مسئلہ پر ذرا غور کرو۔ رزق کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا صرف ذمہ داری پر اکتفا نہیں کیا، قسم بھی کھائی ہے، صرف قسم پر اکتفا نہیں کیا، مثال بھی بیان کی ہے۔ وَفِي السَّمَاءِ بِرِزْقِكُمْ وَمَا تَوْعَدُونَ، فَوَرَبُّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَخَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (پارہ ۲۶ رکوع ۱۱) حق تعالیٰ ان لوگوں کو بھی رزق دیتے ہیں، جو غفلت و معصیت میں مبتلا ہیں، فسق و فجور میں چور ہیں، پھر جو ان کی اطاعت و رعایت کرتے ہوں، وہ کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔ دیکھو جو درخت بوٹتا ہے وہی سینچتا بھی ہے؛ خلقت کو وہی مدد دیتا ہے، جو ان کا خالق ہے، مخلوق کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان کا خالق ان کو کافی ہے اَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدًا۔ ایجاد ان سے ہے، دوام امداد بھی ان ہی سے ہے، تخلیق ان سے ہوئی، رزق کا دینا بھی ان کے ذمہ ہے، اس کی مثال انسان اپنے نفس میں پاتا ہے، یہ جب کسی کو گھر پر دعوت دیتا ہے تو ان کے لیے غذا کا بھی انتظام کرتا ہے، حق تعالیٰ نے جب ہمیں اپنی مشیت اِرادے سے پیدا کیا ہے تو رزق کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، ان ہی کے خوانِ کرم سے ہمیں برگ و لوہا حاصل ہے، حق تعالیٰ پہلے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہم ان کے عبد ہیں، غلام ہیں، اب آقا پر غلام کا تفقد ضروری ہے، جس طرح کہ غلام پر آقا کی اطاعت واجب ہے، اگر ہم ان کے ہو رہیں ان کے سوا نہ کسی کی عبادت کریں نہ کسی سے حاجت و مراد براری چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے وہ اپنا حق ادا نہ کریں؟ اس کی بشارت اس آیتِ کریمہ میں لے ہے ہیں :-

مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَسَاءَ
بِرِزْقِهِمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لیے راستہ نکالتے ہیں اور ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتے ہیں جہاں

سلاہ اور زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ پر نہیں ہے۔ لہٰذا آسمان میں ہی روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم سے آسمان و زمین کے رب کی کہ یہ بات تحقیقی ہے جیسے کہ تم پوستہ ہو۔
سلاہ مثالیں ابوالعطا اسکندری کی ہیں۔

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ
حَسْبُهُ .
ہو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

رزق کا وعدہ قطعی، صرف ہمیں اپنا حق عبادت و عبودیت ادا کرنا ہے، پھر ناممکن ہے کہ وہ ہمیں اپنے
گھر بلائیں اور پھر ہم اپنے احسانات سے محروم رکھیں، وجود بخشی کریں اور پھر مدد نہ کریں، ہست
کریں اور اپنے کرم سے محروم رکھیں، اپنا حق (عبادت) ہم سے طلب کریں اور ہمارا (حق) رزق
ہمیں نہ دیں! وہ کریم ہیں ان سے معاملہ کر کے ان کی خدمت ادا کر کے کون خسارہ میں مبتلا
من الذي سألك فحرمته و لجا إليك فاهملته او تقرب اليك فابتعدته
او هرب اليك فطردته؟ (از اسبوع حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ)
اسی خیال کے تحت کسی عاشق نے کہا ہے "گمان تو انیت کہ از رزق چارہ نیست
اما رزق راز تو چارہ نیست"۔

بدنِ بالِ روزی چہ باید دوید تو بنشین کہ روزی خود آید پدید

ایک دوسرے عاشق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے :

ہیں توکل کن ملرزاں پاو دست رزق تو بر تو ز تو عاشق ترست

بہر حال اتباعِ نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن
اجملو فی الطلب کون پیش نظر رکھ کر اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقل
سبب یا قطعی علت نہیں، شاہ عبدالحق محدث دہلوی "شارح فتوح الغیب" نے مسئلہ کو
اجمالاً خوب ادا کیا ہے "بعد از طلب می یابی اما نہ بطلب می یابی" یہی مفہوم اس شعر میں ادا
ہوا ہے :-

بجستجوی نیاید کے مراد دلی کے مراد سبب کہ جستجو دارد

لہ وہ کون ہے جس نے مجھ سے سوال کیا، اور تو نے اس کو محروم رکھا، یا تجھ سے ملتی ہو اور تو نے اس کو بیکار
چھوڑا، یا تجھ سے ملاپ چاہا اور تو نے اس کو دور کر دیا، تیری طرف دوڑ کر آیا، اور تو نے اس کو دھتکار دیا۔
یعنی دنیا کمانے میں دل تو لگا کر کوشش نہ کرو۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جستجو کو مراد یابی کی مستقل علت قرار نہ دینا چاہیے کیونکہ معاملہ فضل پر منحصر ہے، ہاں جستجو ضرور کی جائے، عادت الہی یہی ہے کہ حرکت میں برکت دیتے ہیں۔

استعانت کا تیسرا طریقہ مصیبتوں میں صبر کرنا ہے۔ دنیا دار را حزن ہے، دارالحن ہے، "سجن" یا قید خانہ، غم کی وادی ہے، شیطان کی دکان ہے۔ جس میں سوا شر و فساد کے کچھ نہیں،

أف للذین یا وایامہا فانہا للحن مخلوقہ
ہمومہا لا تقضی ساعۃ عن ملک فیہا وسوقہ

درویش ہو کہ شاہ، امیر ہو کہ گدا سب غم و ہم میں مبتلا ہیں ہدف بلا ہیں، لقد خلقنا الانسان فی کبد۔ چونکہ حق تعالیٰ ہی ہماری غم سے آزمائش کرتے ہیں مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، رکالتے ہیں اور ہنسائے ہیں وَاِنَّهُ هُوَ اَصْحٰکَ وَاَنْکِی۔ مارتے اور جلاتے ہیں وَاِنَّهُ هُوَ اَمَاتٌ وَاَحْیٰی۔ اور غنی کرتے اور فقیر کرتے ہیں وَاِنَّهُ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی۔ اس لیے حق تعالیٰ ہی ہمیں مصائب سے بچنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، اور وہ طریقہ صبر ہے، کیا حکیمانہ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْحَمُونَ

ایمان والو موجودہ مصائب پر صبر کرو، دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو (صابر و صابرا) اور ایسے کاموں میں ثابت قدم رہو جس کا وقت ابھی نہیں آیا (رابطوا) اور اللہ سے ڈرو اسی میں تمہاری فلاح و بہبودی ہے، یہی نجات کا راستہ ہے، صرف صبر اور حق تعالیٰ ہی کے حکم پر صبر و لحکم ربک اور حق تعالیٰ ہی کے لیے و ما صبرک الا باللہ ہاں صرف صبر کرنے سے مصائب کی برداشت سہل ہو جاتی ہے، غم کے بادل بھٹ جاتے ہیں، فکر کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اسباب کی رام سے اگر انسان مصائب کو دور کرنا چاہے، غم سے گلہ خوار حاصل کرنا چاہے اور راحت کی امید باندھے تو سولے حسرت و یاس کے کچھ نہیں ملتا ہوتا۔

لے قول بھی بن معاذ۔ لے دنیا اور ایام دنیا پر افسوس ہو کہ وہ حزن و غم کے لیے بنائی گئی ہے، اس کے غم ایک گھڑی کے لیے غم نہیں ہوتے، خواہ بادشاہ کے لیے ہوں یا بازار کی آدمی کے لیے۔
لے ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا۔ (الآیہ)

روم نے اسی چیز کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

گر گریزی یا اُمید رحتے ہم از آنجا پیشت آید آفتے

ایچ کنجے بے دد و بے دامت است جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

حق تعالیٰ سے اگر محبت ہو، اور مصیبت کو ان ہی کی طرف سے دیکھے، تو مصائب کا آسان ہونا ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم ایک تاریک کمرے میں ہو، کوئی چیز تمہیں آ لگی، اور تم تڑپ اٹھے، تمہیں معلوم نہیں کہ مارنے والا کون ہے، جب تم نے چراغ منگوا یا اور دیکھا کہ یہ تو تمہارا شیخ ہے، یا باپ ہے، یا کوئی عزیز، محبوب ہستی ہے جس سے تم کسی صورت میں آزار کی توقع نہیں کر سکتے تو تمہارا یہ جاننا بیشک تمہاری تسلی اور صبر کا باعث ہو گا، کیونکہ تم اس تکلیف میں بھی دقائق لطف کا معائنہ کر دے گے۔ اسی طرح وَلِیْرَیَاکَ فَاصْبِرْ مِمَّنْ حَقَّ تَعَالٰی لَیْسَ بِبَدَءِ فَاصِّیْ مِنْتَ فَرَارَہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے لیے اس کے حکم و بلا پر صبر کرو، کیونکہ ایمان کی حلاوت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ تیرا کاہف نہ بنے ۶

من ساختہ جاں را ہدف تیر بلایت!

اگر تم کو حق تعالیٰ کے بید مہربان، رحیم، اور دود ہونے کا یقین ہو جائے اِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِیْمٌ پرایمان ہو گا اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ پراذعان ہو، اور واللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ پر ایقان قائم ہو جائے، تو پھر تم اپنے دکھ درد کو پوشیدہ رحمت سمجھو گے۔ مثالوں سے اس نکتہ کو سمجھو، مشفق باپ اپنے بچے کو چھپنے لگاتا ہے لیکن دکھ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، فاسد خون جو اس کے بدن میں زہر ہے آسان طریقہ سے نکال رہا ہے، ماں اپنے چھوٹے بچے کو غلیظا دیکھنا نہیں چاہتی، صابون اور گرم پانی سے اس کو نہلاتی اس کے جسم کو رگڑتی اور مالش کرتی ہے، بچہ چیخا چلاتا ہے، دکھ محسوس کرتا ہے، لیکن ماں کا مقصد آزار پہنچانا نہیں ہوتا، تمہارا

یہ مثال ابوالعطا اسکندری نے دی ہے۔ پتھیر یہاں استعمال کی گئی۔

خیر خواہ طبیب تمہیں ایاز دیتا ہے، اور تم اُسے ناپسند کرتے ہو، لیکن اگر وہ تمہارے اختیار کا اتباع کرے تو شفا تم سے کوسوں بھلے، اگر تم کو کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جس پر تمہارا دم نکل رہا ہو اور تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ نہ دینا عین شفقت و مہربانی کے باعث ہے تو تم کہو گے کہ یہ نہ دینا ہی میرے حق میں دینا ہے۔ شیخ ابو الحسن شاذلی نے کیا خوب فرمایا ہے:

جان لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز نہیں عطا فرماتے تو ان کا نہ دینا ہی دینا ہے لیکن نہ دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے جو صدیق ہے عسیٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا

میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شادا پر بھی اسی طرح شکر فرماتے، جس طرح کہ نعمتوں پر الحمد للہ علی ما یساء ویتبرک

صرف ایمان کی ضرورت ہے اور شدتِ حب کی، ہر مصیبت کے وقت حق تعالیٰ کی جو تجلی ہوتی ہے مومن کو اس تجلی میں ایسی صلاوت نصیب ہوتی ہے کہ وہ سختیِ عم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے اور اکثر اوقات غلبہِ تجلی سے اس کو دکھ بھی نہیں محسوس ہوتا یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں نہ آرہی ہو تو زینچا پر طعنہ کرنے والی حسین بیبیوں کے حال پر غور کرو۔ یوسف کے ہوش رُبا جمال سے وارفتہ ہو کر انہوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اور خبر بھی نہ ہوئی کہ درد کیا چیز ہے۔ فَلَمَّا رَاٰ اٰیٰتَہٗٓ اَکْبَرٰنَہٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَہُنَّ ۗ زَبٰنِہٖنَّ حٰلِیۡمٌ ۗ وَہ کہہ رہی تھیں

این است کہ خوں خوردہ دل بردہ سورا بسم اللہ اگر تاب نظر است کہے را شاید ہی معنی ہیں غم کے اس قول کے کہ ”انسِ قریب سے اور اک الہم مقفود ہو جا رہے۔ ایمان اور محبت میں پختہ ہونے کے بعد تم کو بیماریوں، بلاؤں، فاقوں میں وہ اسرارِ لطف و رحمت نظر آنے لگیں گے کہ تم کہہ اٹھو گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حَقَّتْ الْجَنَّةُ

۱۔ شاید تم کسی چیز کو ہر امان اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔
 ۲۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا اس چیز پر جو تمہاری معلوم ہو، اور جو غمِ نظر آئے۔
 ۳۔ پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ۔

بالمکارۃ ومحقت الناد بالشهوات۔ بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ان سے ربط قائم کر لیتا ہے، اور سمجھوں سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے فانی ہو جاتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر سیرت سازی کے لیے کوئی اور شے نہیں، غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیاں دور ہوتی ہیں، قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے، روح کا تجلیہ ہو جاتا ہے۔ بلاؤں کی وجہ سے اگر تم نے اپنے امراض قلبی کا معالجہ کر لیا، استقامت پیدا کر لی، تو یاد رکھو کہ غم نے تمہیں فوزِ عظیم کے حاصل کرنے میں مدد دی، اور ایسے غم پر ہزاروں خوشیاں قربان ہیں، وہ خوشیاں جن کی وجہ سے تم شہوتوں میں گرفتار تھے، ہو اور ہوس کے شکار تھے، ظلمتوں میں گھرے ہوئے تھے، اور نور سے دور تھے، حق تعالیٰ سے تمہارا کوئی ربط نہ تھا، شیطان تمہارا قرین تھا، تم پر مسلط تھا، اور اس وعید کے تم مصداق تھے۔

وَمَنْ يَعِشْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نَقِيضٌ لِّشَيْطَانٍ نَّافِهٍ وَلَهُ قَرِينٌ بِهِ

بلا کے اسی فلسفہ سے واقع ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ افضل عیش (بہترین زندگی) ہم نے صبر میں پائی، حضرت ابو بکر صدیقؓ بیمار ہوئے، لوگوں نے عیادت کی اور کہا کیا ہم طبیب کو بلائیں؟ فرمایا، طبیب نے مجھے دیکھ لیا۔ کہا کہ پھر کیا کہا؟ فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ اِنِّیْ فَقَالَ لِمَا اُرِيدُ، معروف کرخی فرمایا کرتے تھے یس بصادق فی دعواہ من لم یلذذ بضرب مولاہ جو اپنے مولا کی ضرب سے متلذذ نہیں ہوتا وہ سچا غلام نہیں، اپنے دعویٰ عبودیت میں صادق نہیں، بعض عارفین کی جیب میں یہ لکھا رہتا تھا وَأَصْدِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے اور محض اس خیال سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھوٹے رخص کرتے۔ رسول اللہؐ نے اس آیت پر

لہ جنت تو ان باتوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں، اور دوزخ شہوتوں، خواہشوں سے گھری ہوئی ہے۔ لہٰذا اور جو کوئی آنکھ چرائے رحمن کی یاد سے، ہم اس پر مقرر کریں ایک شیطان بھروسہ ہے اس کا سنا سکتی۔ لہٰذا وہی کرتا ہوں جو میں چاہوں۔ لہٰذا اپنے رب کے حکم پر صبر کرو، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

وجد فرمایا تھا اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، اس لیے سلف کے بعض بزرگ تعزیتِ مصائب یوں کیا کرتے تھے اصبر بحکم ربك اس کے ساتھ اس قول نبی صلعم کا سنا دینا بھی مومن کی خاص تسلی کا باعث ہوگا:

اذ احب الله عبدا ابتلاه . جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو مصیبت

فان صبرا اجتباہ وان مرضی میں مبتلا کرتا ہے۔ اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ اور

اصطفاه۔ راضی ہے تو برگزیدہ بنا لیتا ہے۔

اب ایک کلی نفسیاتی قانون پر غور کرو، انسان کے لیے مصیبتوں اور آفتوں کا برداشت کرنا اس وقت کسی قدر آسان اور سہل ہوتا ہے جب اس کو کسی اچھے بدل کی توقع ہوتی ہے۔ مثلاً اگر میں اپنے وطن سے دور، اہل و عیال سے مجھ کو کسی جگہ تمام دن محنت و مشقت میں گزار رہا ہوں، تو واقعی میرے لیے یہ ایک مصیبت ہے، لیکن میں اس کو مصیبت نہیں سمجھتا، کیونکہ مہینے کے ختم پر مجھے اس کا معاوضہ معقول تنخواہ کی صورت میں مل جاتا ہے، یہ میرے غموں کو بھلا دیتا ہے، میرے زخموں کے لیے مرہم کا کام دیتا ہے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو قرآن کریم میں اس شخص سے کی جا رہی ہیں جو مبتلائے مصیبت ہے اور صبر کر رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کی ساری بھلائیاں صبر ہی میں رکھی ہیں!

امام احمد رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے کہ قرآن میں صبر کا ذکر نوٹے جگہ آیا ہے، ہم یہاں چند بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو صابر کے حق میں آئی ہیں۔ اگر وہ ان کو پیش نظر رکھے ان پر یقین و اذعان کے ساتھ تفکر کرے تو چیخ اُٹھے کہ "بلا از دوست عطا است و از عطا نالیدن خطا است!"

صبر سے ہم حق تعالیٰ کے محبوب بنتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۔ اور جو

لہ اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حق تعالیٰ کا محبوب ہوا اس کو کس چیز سے حزن ہو سکتا ہے اور کس چیز سے خوف؟ صابر کو
 حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ اور یہ معیت سوکھی معیت نہیں
 جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں وہ کیسے ذلیل ہو سکتا ہے، کیسے مقہور ہو سکتا ہے، خلق اس کا
 کیا بگاڑ سکتی ہے؟ لاطاقة لمخلوق مع قدرة الخالق! صبری سے امانت و پیشوائی
 نصیب ہوتی ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا خلق کی ہدایت کا
 منصب سپرد ہوتا ہے، صابر کے لیے اس کا صبر اعداء کے مکر و فریب کے مقابلہ میں ایک
 زبردست سپر ہے۔ وَإِنْ تَصَابِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُ الَّذِينَ سَاءُوا بِالْآخِرَانِ پر غالب ہونا
 اس کے لیے یقینی ہے فَأَصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ اس کا اپنے مطلب پر فائز ہونا ضروری
 ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا! یعنی تیرے پروردگار نے
 جو وعدہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا، یعنی دشمنوں سے نجات اور ملک و حکومت کے
 عطا کرنے کا وعدہ صبری کی وجہ سے ایفا ہوا، صابرین کے لیے غیر محدود اجر کا وعدہ ہے
 إِنَّمَا يُؤْتِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ سلیمان بن قاسم نے کہا ہے کہ ہر عمل کا ثواب
 معلوم ہے، مگر صبر کا اجر ”بغیر حساب“ ہونے کی وجہ سے نامعلوم و ناقابل علم! حق تعالیٰ نے
 صابروں کے لیے اپنی رحمت، ہدایت اور صلوات یکجا جمع کیے ہیں۔ اور یہ اکٹھے ان کے
 سوا کسی اور کو نہیں دیے وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا
 إِلَيْهِ رَاغِبُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝
 اگر درد گزیرا، سریع الزوال، فانی درد صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے (اور

۱۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ۲۔ اور کیسے ہم نے ان میں سے پیشوا جو بتاتے تھے ہمارے
 حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے ۳۔ اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کے کلمے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا
 گا۔ ۴۔ پس صبر کرو کیونکہ متقین کا انجام نیک ہوتا ہے۔
 ۵۔ اور بشارت دو صابرین کو جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی طرف رجوع
 کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے صلوات ہیں اور رحمت اور یہی ہدایت
 یافتہ ہیں۔

اس کی برداشت ناممکن بھی نہیں کیونکہ ناقابل برداشت تکلیف کسی کو دی بھی نہیں جاتی تو دیکھو اس کے معاوضہ میں کیا مل رہا ہے؟ کن چیزوں کا وعدہ ہو رہا ہے؟ اور کون وعدہ کر رہا ہے؟ کس کی زبانی وعدہ کیا جا رہا ہے؟ اگر تمہارے قلب میں ایمان کی شمع روشن ہے، اگر وہ "غلاف" میں نہیں باندھ دیا گیا ہے، اوندھا نہیں ہو گیا ہے، اگر وہ ادراک کی قوت رکھتا ہے، اور ان حقائق کا ادراک کر رہا ہے تو کیا در داس کے لیے ایک نعمت بے بہا نہیں، وہ اس سے متکذّب نہیں ہوگا، اس کا مشتاق نہ ہوگا، اور فطرۃ اشتیاق میں یہ چیخ اس کی زبان سے نہیں نکلیگی۔

زہرِ غمِ دوستِ حُرّ شکرِ نیت این تیر نصیبِ ہر جگر نیت
بد کے دید آن حبیبِ جانی شیریں بود آنچہ تلخ می دانی!
اب غور کرو اس حدیث کے مفہوم پر۔

یتعاہد اللہ عبدہ بالسلام حق تعالیٰ اپنے بندے کی بلا کے ذریعہ خبر گیری کرتے
کیا یتعاہد الوالد الشفیق ہیں اسی طرح جس طرح کہ مہربان باپ اپنے بچے کی
و کدہ . خبر گیری کرتا ہے

صحابہ کرام کے یہی ادراکات تھے، اور ان ہی کی قوت سے انہوں نے اپنا سارا شن من دھن اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہم
صبر کا ادب یہ ہے کہ زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جائے، مولے حق تعالیٰ کے
اپنی مصیبت کا کسی سے گلہ نہ کیا جائے اِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ
دردم نہاں بہ ز طیبیان مدعی باشد کہ از خزانہ غنیم دو اکتند

۱۔ ابو سعید سے مرفوعاً روایت ہے، دل چار طرح کے ہوتے ہیں (۱) اجرد (برہنہ) اس میں چراغ سا جلتا ہے، یہ مومن کا دل ہے، (۲) غلف جن کو غلاف میں باندھ دیا گیا ہو، یہ کافر کا دل ہے (۳) منکوس (اوندھا) یہ فاعل منافق کا دل ہے (۴) متعفن وہ دل جس میں ایمان و نفاق دونوں موجود ہیں، یعنی زبانی ایمان کا دعویٰ اور دل میں اس کا یقین نہیں۔
۵۔ میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب و غم اللہ کے سامنے۔

غور تو کرو کہ مخلوق سے شکوہ کرنے کے کیا معنی ہیں، یہی نہ کہ ایک صبرِ مکرم نہ کہ ایک غیر صبرِ مکرم ہے۔
 شکوہ کیا جا رہا ہے، ایسا شخص کبھی حق تعالیٰ کی اطاعت کی تلاوت اپنے دل میں نہ پائیگا،
 اس صبر یہ ہے کہ مصیبت کو چھپایا جائے، من کنوز البرکتان المصائب وما صبر
 من بشا۔ (حدیث اشرف مرفوعاً) لیکن مصیبت میں یا درد کی حالت میں زبان سے ہا
 دے نکل جائے تو یہ منافی صبر نہیں بشرطیکہ ان سے شکوہ شکایت مقصود نہ ہو اور محض
 استراحت منظور ہو، کیونکہ گراہنے سے توجہ درد کی طرف سے ہٹ کر اس میں ایک قسم
 کی کمی محسوس ہوتی ہے، اسی لیے "انین" (زالہ) کی دوسری قسم کے متعلق حکم ہے کہ لا یکرہ و
 لا یقدح فی الصبر یعنی صبر کے منافی نہیں، اور پہلی قسم کو بہ روایت امام احمد قادیان صبر
 قرار دیا گیا ہے۔

بلا اور مصیبت کے وقت صبر کے معنی یہی ہیں کہ توافق بالقضا کیا جائے، گو فطری
 طور پر درد و حزن ہو رہا ہو اور ہو گا کیسے نہیں یہ تو اقتضائے بشریت ہے۔ انسان کامل،
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے انتقال پر فرما رہے تھے انا بفراقک یا ابراہیم
 خسرون (تیرے فراق نے اے ابراہیم ہمیں محزون کر رکھا ہے) لیکن عقلی صدمہ نہ ہونا چاہیے
 یعنی اس مصیبت کے واقعہ کو بے محل اور قبل از وقت خیال نہ کیا جائے، اس کے ساتھ
 توافق کیا جائے، زبان پر ہو ۶

ہرچہ آن خسرو کند شیریں بود!

اور دل میں یہ خیال ہو ۷

جہاں دار و داند جہاں داشتن

اب حکم کے تحت اسبابِ قطعہ کا استعمال جائز ہے بلکہ ضروری ہے، اور انسان
 کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ بغیر چارہ کار اختیار کرنے کے خاموش نہیں رہتی لیکن

سہ نیکی کا خزانہ مصائب کے پھیلنے میں ہے جس نے اپنے مصائب کو ظاہر کر دیا اس نے صبر نہیں کیا۔

اسباب کے استعمال میں نظر اسباب پر نہ ہو سبب پر ہو تو اسباب میں اثر پیدا ہوتا ہے۔ علاج کا یہ طریقہ استعمال کیا جائے اس کے تمام اجزاء کو سمجھ کر ان کی پابندی کی جائے تو رفتہ رفتہ رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے، جو راحت کبریٰ ہے، دنیا میں جنت عالیہ ہے۔ استعانت کا چوتھا طریقہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے۔

انسان کی زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی، سچ بھی ہے اور راحت بھی، ظلمت بھی ہے اور نور بھی۔ قنوطیہ نے اپنی کوری عقل سے دنیا کے مبدئی کو شر قرار دیا، اور بالآخر ہمہ شیطنت (Pandiaabolism) کے نظریے کے حامی بن گئے۔ ان کے تجربے میں دنیا بدترین دنیا ثابت ہوئی۔ سوائے غم و حزن کے کوئی شے انہیں حقیقی نظر نہ آئی، اس کے برخلاف رجائت نے اس دنیا کو بہترین دنیا قرار دیا، غم و الم ان کی رائے میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہیں۔ تضاد سے لذت کی کیفیت میں اشتداد پیدا کرتے ہیں حقیقی نہیں اعتباری ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں غم بھی حقیقی ہے، اور خوشی بھی حقیقی، ان میں سے کسی ایک کو القباس قرار دینا خود کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔ حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے، اس کی تصدیق ہر شخص اپنے تجربے سے ہر روز کر رہا ہے، وہ نہ بلا کو قائم پاتا ہے نہ نعمت کو ہر روز سے گزر رہا ہے، خوشی کے احساس کا انکار کر سکتا ہے، نہ غم کے ادراک کا، بلا و نعمت کا پایا جانا ان کا محسوس ہونا ہے اور ہمیں باہر کھلے کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ موجود ہونا دراصل محسوس ہونا ہی ہے (ESSBIST PERQOH) بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی اور یہ ہر وقت مصروف عمل ہیں، ایک لمحہ کے لیے معطل اور بیکار نہیں۔ خیر و شر، رنج و راحت، لذت و الم، نعمت و بلا انہی کی تجلیات کا نتیجہ ہیں اور حقیقی ہیں۔

۱۔ تصوریت کا ہائی اٹھارویں ہمدی سیمی کا ایک نہایت فریب اور تیز فہم فلسفی ۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء
۲۔ وہ کے وجود ہی سے انکار کیا۔ کائنات غیر مادی روحانی شے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بلا سے نجات چاہتا ہے، اور نعمت میں اضافہ، بصیرت
 محمدیہ نے دونوں کے لیے قلبی طریقے بتائے ہیں، بلاؤں میں صبر اور نعمتوں میں شکر قلب انسانی
 میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرتے ہیں، اس کو ایک طرف تو نالہ، فریاد، ماتم، ستینہ
 کو بی، یاس و قنوط سے نجات دیتے ہیں، اور دوسری طرف کبر، عجب، فخر، غرور، تجتر سے
 چھڑاتے ہیں، ان سلبی و مضر جذبات سے نجات پا کر وہ قوت، ہمت اور عمل کا مخزن بن جاتا،
 اور اس کے لیے کائنات کی تسخیر آسان ہو جاتی ہے، اس کی توانائیاں رائیگاں نہیں
 جاتیں صحیح جانب لگ جاتی ہیں، اور وہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہیں
 مصیبت میں صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ ارادہ بالکل شکستہ نہ ہو جائے، ہمت
 بالکل ٹوٹ نہ جائے، بلا کا بہا دزدی سے مقابلہ کیا جائے، جو اس بجاہوں ہی چیز صبر
 سے حاصل ہوتی ہے، اور نعمت میں خطرہ اس بات کا لگا رہتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو
 بھول نہ جائے، جو تمام حسات و محامد کا منبع ہیں اور اس طرح اس منبع سے دور نہ ہو جائے
 اور ظلمتوں میں گرفتار نہ ہو جائے، شکر سے یہ خطرہ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ شکر کی حقیقت
 یہ ہے کہ نعمت کو حق تعالیٰ کی جانب سے دیکھا جائے، اپنی ذات یا خلق کی طرف
 اس کی نسبت نہ کی جائے، کیونکہ دراصل حق تعالیٰ ہی صنار ہیں اور نافع، نفع و
 ضرر انہی کے دست قدرت میں ہیں، گو جو اس کی نگاہ کو ہی نظر آتا ہے، کہ نعمت
 خلق ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی ہے، لیکن چشم بصیرت جانتی ہے کہ یہ محض بمنزلہ اسباب
 و آلات نعمت ہیں، قاسم، مجری و فاعل و مسبب حق تعالیٰ ہی ہیں، وَمَا يَكْفُرِينَ
 نِعْمَتِ رَبِّهِمْ إِذْ جَاءَهُمُ الْبُرْجَانُ مِنَ اللَّهِ - جب انسان اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے
 تو وہ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، یہ ان کا قطعی وعدہ ہے، کسی استثنائی گنجائش
 نہیں۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَإِذَا كَفَرْتُمْ فَسَأُكْثِرَنَّ عَذَابَكُمْ ۖ فَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

اے اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم (نعمتوں میں) اضافہ کرتے ہیں۔

اپنی مرضی پر دکھا ہے، لیکن شکر کے عوض زیادتی نعمت کا حصول بلا تخلف ہے، اسی لیے حضور
انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ نَزَلَتْ إِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا۔ جس کسی پر نعمت کا نزول
ہو اس کو چاہیے کہ شکر ادا کرے۔

سید مرسلان و مرسل راز داد فرمان بشکر نعمت و ناز
گلِ نعمت بے ہر کہ شگفت شکر آں روز و شب بباہد گفت

اس عظیم الشان صداقت کو جس پر نعمتوں کا بقا منحصر ہے اصح العرب و اجمع صلی اللہ
علیہ وسلم نے ایک اور نفسیاتی طریقے سے ادا فرمایا ہے۔

النعمۃ و حشیتہ قیدھا نعمت ایک وحشی جانور ہے، شکر کی زنجیروں
بالتشکر۔ سے اس کو باندھ رکھو

خاتم ملک و خاتم دین شکر فرمود برنجیف و سہین
باز نعمت چو بہت وحشی را صید از قید شکر کن اورا
چوں گذاری تو شکر نستیزد در شومی ناسپاس بگریزد

نفسیات کا یہ ایک مسئلہ قانون ہے کہ انسان کو جب نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ
خوش ہوتا ہے، لیکن چند روز بعد یہ نعمت اپنی مانوسیت کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو
دیتی ہے، اب اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، اس کے وجود سے اس کو کوئی خاص
فرق اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوتا، اور باوجود ناز و نعم میں گھرے ہونے کے وہ ضیق محسوس
کرتا ہے، لیکن اگر یہ مفقود ہو جائے، یا ہاتھ سے چھین لی جائے تو اب اس کو اس کی قدر
ہوتی ہے، قدر نعمت بعد زوال اسی صداقت کا اظہار ہے، بلا وہ ازین احسان نعمت کا
مفقود ہونا گویا نعمت ہی کا مفقود ہونا ہے، اگر نعمت سے مجھے خوشی رہے ہو، کوئی نعمت
ہو تو یہ میرے لیے نعمت نہیں زحمت ہے، ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں معلوم ہوگا
کہ از دیا و نعمت میں شکر کا کتنا دخل ہے۔ نعمت کے شعور سے نعمت کا بقا ہے، شعور کا فقدان

نعمت کا فقدان ہے، اسی لیے احساسِ نعمت کو زندہ رکھنا چاہیے، اور یہی چیز شکر سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری شکر کو "جالب" حافظا" کہتے تھے، کیونکہ وہ موجودہ نعمتوں کی "حافظ" اور مفقود نعمتوں کی "جالب" ہے۔ شکر سے نعمت سلب و نقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے، اور چونکہ شعور میں نعمتوں کے ادراک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی عنایتوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگتا ہے جو اس کے قبل نظر سے پوشیدہ تھیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکر سے نعمتوں میں قطعی اضافہ ہوتا ہے۔ الشاکر یتحقق المرید (شاکر زیادتی کا مستحق ہے) ایک نفسیاتی صداقت ہے، اسی لیے پہلے اسوۂ حسنہ کو جب بھی کوئی امر خوشی کا پیش آتا تو شکر الہی کی ادائیگی کے لیے سجدہ میں گر جاتے۔ (رواہ احمد)

انسان کی کچھ عجیب فطرت ہے، نعمتوں کو بہت جلد بھول جاتا ہے اور مصیبتوں کا ہمیشہ شکوہ کرتا رہتا ہے، کسی عرب شاعر نے اس پر خوب تہدید کی ہے۔

يا ايها الظالم فاعلم
الى متى وحتى متى
والظالم مردود على من ظلم
تشكو المصيبات وتنسى النعم

ذرا ہمیں اپنی ان نعمتوں کو دہرانا چاہیے جن کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، پہلے "نعمتِ لفع" کو لیجیے، پھر "نعمتِ دفع" کو دونوں بیٹھا رہیں۔ "نعمتِ لفع" میں آدمی اپنے صحیح و سالم قد و قامت پر نظر کرے، صحت و عافیت پر غور کرے، ان لذتوں کا خیال کرے جو کھانے پینے اور جنسی خواہشوں کی تکمیل میں اس کو میسر ہیں، پھر نعمتِ دفع کے سلسلہ میں یہ دیکھے کہ وہ اپنا بیچ نہیں، ہزاروں بیماریوں سے محفوظ ہے، دشمنوں اور مخالفوں کے شر سے مامون ہے، صاحبِ ایمان پھر نعمت کو ایک اور لفظ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کو "نعمتِ توفیق" بھی حاصل ہے اور نعمتِ عصمت بھی! نعمتِ توفیق یہ کہ

اے اپنے فعل میں ظلم روا رکھنے والے مجھے معلوم ہے کہ ظلم ظالم پر لوٹ کر آتا ہے۔ کب تک اور کہاں تک تو مصیبتوں کا شکوہ کرتا رہیگا اور نعمتوں کو بھلا تا جا ہیگا؟

اس کو ایمان توحید، صدق و استقامت حاصل ہے، نعمتِ عصمت یہ کہ وہ کفر و شرک، نفاق و ارتداد، بدعت و فسق و غفلت سے محفوظ رکھا گیا ہے، اگر ان نعمتوں کی وہ تفصیلات ہیں جلتے، ان کی جزا پر نظر کرے، اپنی صلاحیت و استعداد پر غور کرے، یہ دیکھے کہ اس کو ان نعمتوں کا کیا حق ہے، تو بے اختیار چیخ اٹھے۔

بے لطف تو من قرار تو انم کرد احسان تو شمار تو انم کرد

گر برتن من زباں شود ہر موی یک شکر تو از ہزار تو انم کرد (ابوسعید ہمنہ)

یعنی ہے ان تُعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو گن نہ سکو گے) اب ان لا تعدوا احسان کا شکر انسان کیسے ادا کر سکتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ شکر اولے شکر سے اپنے عجز کا جان لینا ہے، اولے شکر کے ساتھ ہی ایک اور شکر لازم آتا ہے، کیونکہ شکر کی توفیق بھی توحق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے، اور یہ توفیق خود ایک بڑی نعمت ہے، جس کا شکر ضروری ہوا، پھر اس شکر کا شکر، و علم جراً الی نہایت۔ اس لیے احسان و منت باری تعالیٰ کا مشاہدہ خود شکر ہے، ان کی نعمتوں کا اعتراف خود شکر ہے۔ ان کے حصول کے بعد مرصیات حق پر قائم رہنے کی دعا خود شکر ہے، ان پر حق تعالیٰ کی ثنا خود شکر ہے۔

حق تعالیٰ سے استعانت کے دوسرے طریقے اجمالاً یہ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ گناہوں

کے صدور پر توبہ کریں حق تعالیٰ مغفرت سے ہماری استعانت فرماتے ہیں۔ اِنَّكَ اَنَّكَ اَنَّكَ اَنَّكَ

غَفُورًا، وہ رجوع کرنے والے کو معاف کرتے ہیں، کتنا تسکین بخش اور محبت آمیز پیام باری

لَغَفَّارٍ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ میں معاف کروں گا انہوں کو جس

نے توبہ کی، ایمان لایا، نیک عمل کیے اور پھر اس راستہ پر چلا، توبہ و ندامت سے گناہ کی سیاہی

قلب سے محو ہو جاتی ہے۔ گناہوں سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے نیکیوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

اور تائب حق تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔ اِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ

ہم نے اوپر تفصیل سے دکھلایا ہے کہ توبت و اصلاح صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے تائب

ہیں۔ لا قوۃ الا باللہ۔

ہماری خوف ورجا کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے قیام کے ساتھ ہی حق تعالیٰ ہمیں مخلوق سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں اور اس غنا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس قاتل جذبہ کے خنجر سے آزاد ہو جاتے ہیں جس نے سنگ پستوں کی زندگی کو سکون و طمانیت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ہے۔ یہ خوف کا جذبہ ہے جس نے ان کو سوتے جاگتے ہر وقت پریشان، مضطرب و حواس باختہ کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انہیں ہر کونہ میں ایک دام دکھائی دیتا ہے اور ہر گوشہ میں ایک درندہ!

اگر ہم اس امر میں حق تعالیٰ سے استعانت چاہیں کہ وہ ہمیں یاد رکھیں اور ہم سے راضی رہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم حق تعالیٰ کو یاد رکھیں اور ان کے ہر حکم و فعل سے راضی ہو جائیں فا ذکرہ فی اذکرکھ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کرونگا، اسی لیے حکم فرمایا کہ اذکرہ واللہ ذکرہ کثیراً۔ اور ہمانے راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ورضوا عنہ۔

آنا کہ رضائے حق بجاں می جویند در راہِ رضائے او بسری پویند

ہر یک ہمہ آں کند کہ حق فرماید حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

اوپر جو کچھ ہم نے کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب یا دین مشتمل ہر دو اجزا پر عبادت و استعانت پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے قلوب سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو جاتی ہے۔ اس قلب کی عظمت کا کیا کہنا جس سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی ربوبیت و معبودیت متکثر ہو گئی ہے، جس کے الہ قطعاً اللہ ہیں، یعنی جس کے معبود، جس کے مسجود، جس کے مطلوب، جس کے مقصود قطعاً اللہ ہیں، جس کے رب جس کے مستعان قطعاً اللہ ہیں! اس قلب میں توحید کا جلوہ ہے، ایمان کا نور ہے، وہ نورانی قلب ہے، حق تعالیٰ کا محبوب ہے اور حق تعالیٰ

اس کے ویل ہیں، کھیل ہیں، ولی ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، حنیط ہیں اور ہادی ہیں۔
 اس ضمن میں چند تعریفات یاد رکھو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہے۔ ذات اللہ ہی کو الہ قرار
 دینا یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید
 ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہو جاتی ہے،
 جس ذات پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و
 تصدیق سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔ ایمان میں دو
 چیزیں ہیں اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صرف
 اللہ وحدہ لا شریک لہ کی الوہیت کی تصدیق ہے، توحید میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت و
 ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔ اس
 کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے بعد انکار ابتدا
 ہے۔ یہ مثل شرک کے دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے، اور اس لیے ناقابل معافی
 اور بدعت بھی بُری بلا ہے۔ یہ دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا ہے، جو دین کی بات نہیں
 اس کو دین سمجھنا ہے۔ غیر شریعت کو شریعت کہنا یا اقر علی اللہ اور ایک گونہ اذعانے نبوت
 ہے، بدعتی کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے، کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے، پھر توبہ کیوں کیجیگا
 اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔
 قبل ایمان کفر و شرک سے توبہ لازم ہے، پھر ایمان یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
 کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار جس سے غیر اللہ کی معبودیت اور ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی
 معبودیت و ربوبیت ممکن ہو جائے۔ اب نفاق، ارتداد، بدعت، فسق و فجور سے
 احتراز ایمان اور عملی صراط پر استقامت، یہ ہے دین یا بندگی جس کے متعلق عارف
 روم نے کیا خوب کہا ہے سنہ

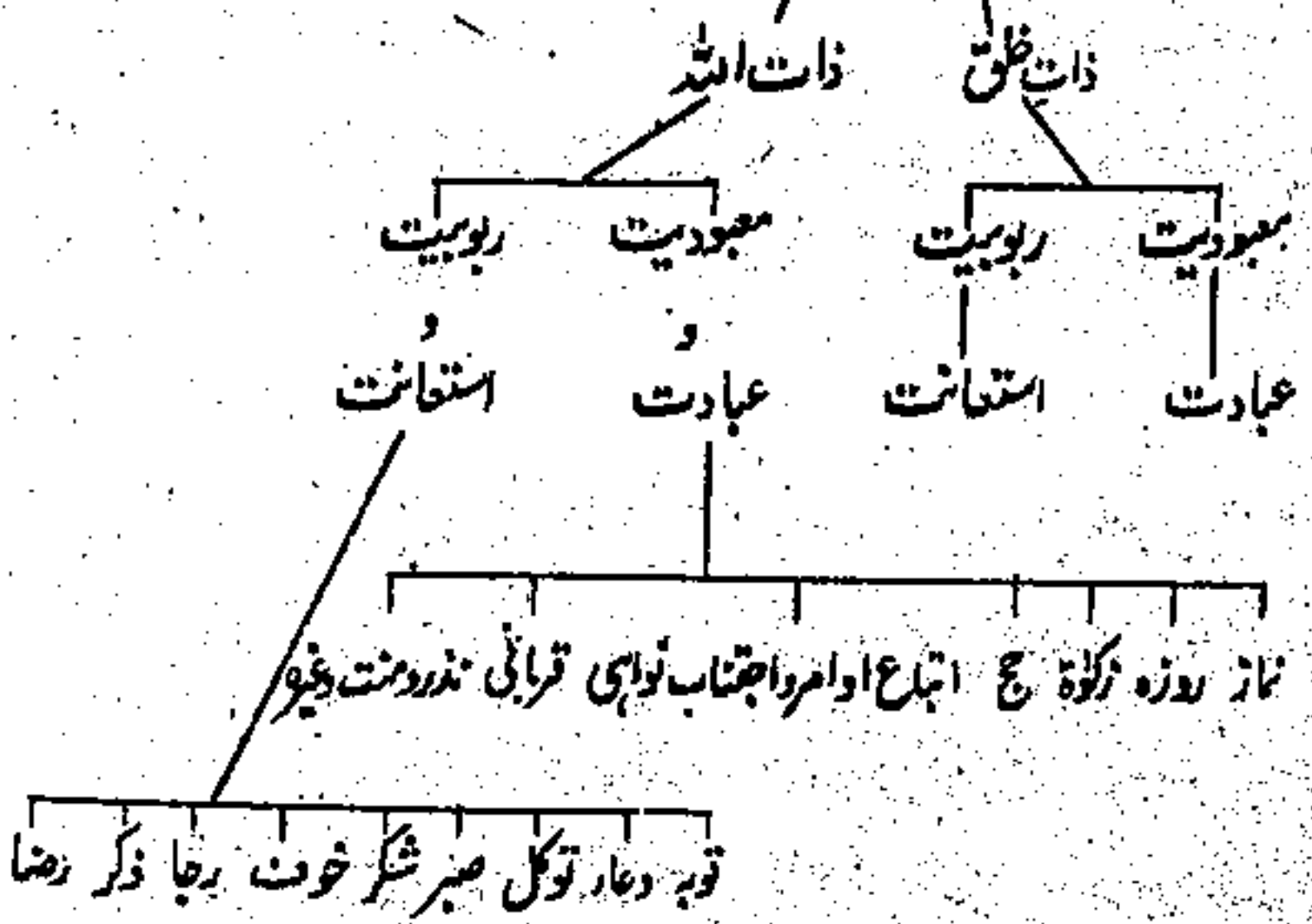
گر تو خواہی حری و دل زندگی بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی بے بندگی شرمندگی است
زندگی مقصود بہر بندگی است
اندریں حضرت ندارد اعتبار
جز خضوع و بندگی و اضطراب
کفر باشد پیش او جز بندگی
نہر کہ اندر عشق یابد زندگی
مغز باید تا دہد روانہ شجر
ذوق باید تا دہد طاعات ہر
قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ
وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (آیہ ص ۱۲۶)

ضمیمہ

مندرجہ ذیل نقشہ سے دین کے سارے اجزاء کی تلخیص پیش نظر ہو جاتی ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ



توحید الوہیت

سیری بہ حریم جان و دل منزل کن قطع نظر از صورت آب و گل کن
 جو معرفت الہیچ است ہمہ بگذر ز ہمہ معرفتے حاصل کن (سیری غزنی)

تخلیق عالم کی غایت کیا ہے؟ جن دانش پیدا کیوں ہوئے؟ ۶۰ از آمدن و رفتن ماسوئے کو
 فلسفیوں کو اپنے گودکِ عقل کے ساتھ کھیلتا چھوڑ کر (ذَرَّهُمْ فِي خَوْضِهِمْ دَلِيعُونَ) ہم اس کی
 سوال کے جواب کے لیے قرآن کریم کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مبدیہ علم حقیقی کا اور جو رب و شک
 ظن و تخمین، قیاس و وہم سے منزہ ہے! ہمیں ہمیں وہ نور ہدایت نصیب ہوتا ہے جس کو عقل نظری
 ہمیں عطا نہیں کر سکتی! اِنَّ هُدٰى اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰى! ہمیں مومن کے لیے یقین و اذعان کا ذخیرہ
 ہے۔ ہمیں ہدایت و ہدایت کا جلوہ ہے نہیں علم حقایق ہے اور ہمیں طمانیت و تسکین۔ وَاَنْ
 هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ ذٰلِكُمْ وَصَّوْكَمۡ بِهٖ
 لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ! (پ ۶۷)

علمی کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است دانش کہ بہرابی ازاں تشنہ ہی است
 جانیکہ بود جلوہ حق حاکم وقت تابع شدن حکم خرد بولہی است

جن دانش کی تخلیق کی غایت صاف و سلیس الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے: مَا خَلَقْتُ
 الْبَشَرَ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ عبادت کے معنی ہیں توحید۔ چنانچہ امام المفسرین حضرت ابن عباس
 کا قول ہے کہ قرآن کریم میں جس جگہ بھی عبادت کا ذکر آیا ہے اس کے معنی توحید کے ہیں۔ گویا حادہ قرآن

۱۔ یہ مقالہ رسالہ بران دہلی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔
 ۲۔ اور دوسری راہوں پر ہوت چلو کہ
 وہ راہیں ہمیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ نے تاکید کی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔
 ۳۔ بخاری حدیث وفد عبد القیس۔

میں عبادت ہر جگہ توحید کے معنی میں آئی ہے "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے معنی ہونگے توحد و تطبیح اور "ایای فاعبدون" کا مفہوم ہوگا کہ میری ہی توحید تمہارے سینوں میں بس جائے۔ عبادت کی تعبیر توحید کے لفظ سے کرنے میں خوبی یہ ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عبادت صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے جو واحد لا شریک ہے۔ اس سے شرک کی قطعی نفی ہو جاتی ہے جس کو کسی دوسری جگہ کھول کر اس طرح بیان کیا گیا ہے "واعبدوا اللہ ولا تشربوا آبہ شیبارہ" (۳۷) ہمیں اپنی عبادت و معرفت کے لیے پیدا کیا ہے، ہماری زندگی کا مقصد یہی عبادت و بندگی ہے۔ یہی عرفان ہی توحید ہے، تمام انبیاء نے اسی توحید الوہیت کو پیش کیا۔ یہی ان کی بعثت و دعوت کا اصل مقصد تھا۔

خواہم کہ ہمیشہ درہم ہوائے توحید
خاک کے شوم و بزر پر پائے توحید (تاسم)
مقصود من خستہ زکونین توئی
از ہر توحید و ہر پائے توحید
تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا کہ "یا قوم اعبدوا اللہ فالکم من الٰہ غیرہ یعنی اے قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوائے تمہارا کوئی معبود و رب نہیں! یا ان لا تعبدوا الا الٰہ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو" حضرت نوح نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا: "ان اعبدوا اللہ و اتقوا و اطیعوا" اور یہ عبادت اسی توحید و تقویٰ و اطاعت پر مشتمل ہے حضرت ہود حضرت صالح اور حضرت شعیب نے بھی انہی الفاظ سے کہ "یا قوم اعبدوا اللہ فالکم من الٰہ غیرہ" سے اپنی قوم کو توحید کی طرف بلا یا۔ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو یوں مخاطب کیا "اعبدوا اللہ و اتقوا ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون" اور مشرکین سے اپنی براءت اس طرح ظاہر فرمادی "یا ایہ الذین یعبدون الا الٰہ الذی قطرنی فانی بئس قدین (۹) انہوں نے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہ وصیت فرمادی تھی کہ "ان اللہ اصطفىٰ لکم الدین فکلا تمونن الا و انتم مسلمون (۶۷)

اے تم اللہ ہی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک مت کرو۔ اے میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ان میں سے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے۔ اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا!

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہل فرعون کو یہی بات پہنچائی تھی کہ تم صرف اللہ ہی کو پوجو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی تعلیم، اسی دعوتِ توحید کے ساتھ ہے نبی الہی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حق تعالیٰ نے آپ کی ذلت پر اس دعوت الی التوحید کو ختم فرمادیا، آپ کو ارشاد ہوا۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ إِلَا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ (پج ۹)

غرض توحید الوہیت پر سارے انبیاءے اولین و آخرین کا اجماع ہی، جو بھی رسول آیا وہ توحید کی دعوت لے کر آیا۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنْذَارًا لِّأَنْتُمْ فَاعْبُدُونِ ۚ (پج ۲۶)

اسی لیے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اسلام کا دعوتی کلمہ ہے جس میں توحید الوہیت اور رسالت محمدی کو پیش کیا جا رہا ہے جن کا جان کر اقرار کرنا ایمان کے لیے ضروری ہے، فرض اول ہے الہ اسم صفت ہے اور باجماع اہل علم اس کے معنی "معبود" کے ہیں اور اس پر آیات قرآنی دلیل ہیں ان میں سے بعض پر غور کرو۔

(۱) وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ وَّ فِي الْأَرْضِ إِلَهُ ۚ

یعنی وہی ذات پاک آسمان اور زمین کا معبود ہے۔

(۲) أَوْ لَهْمُ إِلَهٍ غَيْرِ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ

یعنی کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟

(۳) وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَى قَوْمٍ يُمِيعُونَ عَسَلِي

ہم نے بنی اسرائیل کو دریائے پارا مار دیا پس ان لوگوں کا ایک قوم پرگز رہا جو اپنے چند بہتوں کو لگے بیٹھ

لہ آپ کہہ دیجیے کہ لہ لوگوں میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی و تمام آسمانوں اور زمین اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سوائے اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر۔ لہ ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہیں بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کیا کرو۔

أَصْنَامًا لَهُمْ قَالُوا لِمَوْسَى اجْعَلْ
ہیں کہنے لگے موسیٰ ہاں سے لے بھی ایک معبود اپنا
لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمُ آلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ
ہی مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے
قَوْمٌ يَجْهَلُونَ ﴿۱۶﴾ فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔

(۱۷) وَالنَّظَرَ إِلَى إِلَهِكَ الَّذِي ظَلْتَ
اور تو اپنے معبود کو دیکھ جس پر توجہ ہوا بیٹھا تھا ہم
عَلَيْهِ عَاكِفًا لَّيُخَوِّفَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْبِقَنَّ
اس کو جلادینگے پھر اس کو دریا میں بکھیر دینگے بس
فِي الْيَمِّ نَسْفًا إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ
تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی
الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ
عبادت کے قابل نہیں، وہ علم سے تمام چیزوں کو
شَيْءٍ عِلْمًا

اعاطیے چھوٹے ہے۔

(۱۵) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ اگر تم ایک کلمہ کا اقرار کر لو تو تمام عرب تمہارا
مطیع ہو جائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزار کر کے لگے۔ ابوہل نے خوش ہو کر کہا کہ بتلائیے وہ کلمہ
کیا ہے، ہم ایسے دس کلمے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ فرمایا دس نہیں بس ایک ہی کلمہ ہے لَا إِلَهَ إِلَّا
اللَّهُ۔ یہ سنتے ہی ان سب کو طیش آیا، کہنے لگے "اجْعَلِ الْآلِهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ
عَجَابٌ" (پہ ۱۰۶) یعنی اس نے تو اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بہت ہی
عجیب بات ہے۔ (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ الہ سے مراد معبود ہے اور لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ سے اسی
توحید الوہیت کو پیش کیا جا رہا ہے جس کو سب سے انبیاء نے پیش کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
ہے مستحق عبادت ہے اسی کی عبادت کی جانی چاہیے۔ اسی سے فقر و ذلت کی نسبت جو لینی چاہیے۔
افراد عبادت اللہ ہی تمام پیغمبروں کے پیام کا حاصل ہے یعنی صرف اللہ ہی الہ ہے، غیرت بحیثیت
الہ قلب سے فنا ہو جائے ۵

دل عاشق روئے تست با عہد دست
جان طالب وصل تست از روئے نخواست
آن کس کہ نہ جُست وصل تو بیج نیافت
و آن کس کہ ترا یافت دگر بیج نخواست

(شیخ عطار)

توحید فی العبادت کی ضد تشریک فی العبادت! متوحد اللہ ہی کو الہ ماننا ہے، یعنی اللہ ہی کی عبادت کرنا ہے اور مشرک غیر اللہ کو بھی الہ ماننا ہے اور اس کی بھی عبادت کرنا ہے۔ سورہ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر یعنی ابراہیم، اسمٰعیل، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، یسع، یونس علیہم السلام کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ نفوس قدسیہ حق تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک کرتے تو ان کی ساری طاعتیں باطل ہو جاتیں کیونکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں۔ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (پ ۱۵۶)

تصریحات بالاسے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس عالم میں انسان کی تخلیق عبادت معرفت کے لیے ہوئی ہے، اسی لیے تمام انبیاء و رسل توحید ہی کی دعوت کے لیے مبعوث ہوئے، انہوں نے ہی نوع انسان کو توحید فی العبادت کی طرف بلایا، شرک سے ڈرایا، ہر ایک نے باواز بلند فرمایا:-

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ -

نقطہ ادوار عالم لالہ انتہائے کار عالم لالہ!

اور جب مقصود زندگی توحید فی العبادت ہے تو ہمیں عبادت کے مفہوم پر بھی طرح غور کرنا چاہیے۔ شرک کی ماہیت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے تاکہ جس مقصد کے لیے ہم پیدا ہوئے ہیں اس کے تحقق میں کامیاب ہوں اور کامیاب عمل ہونا بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں! یاد رکھو کہ یہ دور روزہ پر فریب زندگی اپنے مختلف ادوار طفلی و جوانی و پیری کی مخصوص نعمتوں اور بلاؤں سے گزر کر بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور آخری دور میں پہنچ کر ہم بیدل کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں:-

طفلی کہ زمان بازی می آراست - دامن افتاند

انگاہ جوانی کہ داعش پیدا است - گل کرد و شامد

انکوں پیری نفس شماری دارد - بیدل چه علاج

زین نسخہ ہم آخر ورق چند بجا است - باید گرداند

لیکن ورق لٹنے کے بعد قصہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اب دنیوی زندگی کے اعمال کی جزا و سزا کا دور شروع

ہوتا ہے اور یہ ابدی ہے، اس کی انتہا نہیں، یہاں تو سکھ ہی سکھ ہے یا پھر دکھ ہی دکھ۔ توحید پر خاتمہ
 سوا تو سوائے سکھ کے کچھ نہیں اور اگر شرک پر دم توڑا تو سوائے دکھ کے کچھ نہیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ
 اور حضرت داؤدؑ نے اپنی اولاد کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ **فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** !
 اب ذرا عبادت کے تضمینات پر تفصیل سے غور کرو۔

لغت میں عبادت نام ہے "غایت تدلل" کا یعنی نہایت درجہ کی خاکساری و نیاز مندی کا
 اور شریع میں عبادت مراد ہے بندوں کے ان افعال و اقوال و احوال سے جن کا تعلق خاص طور پر حق
 تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے ساتھ ہوتا ہے۔ عبادت اسٹیم جنس ہے اس کی بہت ساری انواع ہیں
 (۱) عبادت اعتقادی: یہ اصل ہے سب انواع کی، اس کا دوسرا نام "توحید الوہیت" ہے،
 جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ محاورہ قرآن میں عبادت کے معنی اسی توحید کے ہیں۔ یہ اس امر کا اعتقاد ہے کہ
 اکیلا اللہ ہی الہ یعنی معبود رب واحد ہے، وہی خالق ہے، اسی کی سب خلق ہے اور اسی کا امر وہی
 مالک ہے وہی حاکم، اسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر ہے، وہی مولیٰ ہے۔ اسی طرح الوہیت کے دوسرے
 لوازم کا اعتقاد۔ لہذا دعا، نداء، استغاثہ، استعانت، التجا، رجاء، خوف سب صرف اللہ ہی سے
 ہوں، غیر اللہ سے نہ ہوں۔

(۲) عبادت لفظی: کلمہ **توحيد لا اله الا الله محمد رسول الله** کا زبان سے اقرار جس نے
 دل سے اس کا اعتقاد رکھا لیکن زبان سے اقرار نہ کیا تو اس کا خون و مال محفوظ ہوگا اور جس نے

لہ ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا
 بالجنة التي كنتم توعدون، نحن اولياءكم في الحياة الدنيا وفي الآخرة ولكم فيها ما تشتهي
 انفسكم ولكم فيها ما تدعون، نزلا من عندهم الرحيم ربنا ۱۸۶ بن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ
 ہے، پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اترینگے، کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ سنا کرو، اور تم جنت پر خوش رہو، جس کا تم
 سے وعدہ کیا جا یا کرتا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں اور عقبی میں بھی رہینگے اور تمہارے لیے جس چیز کو تمہارا
 ہی چاہیگا موجود ہے اور نیز تمہارے لیے اس میں جو مانگے موجود ہے۔

لہ انتم من يشرك بالله فقد حرم الله عليه الجنة وما اولئنا النار الا انهم كانوا
 مشركين قرار دیکھا سو اس پر اللہ جنت کو حرام کر دیکھا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

زبان سے کہا گردن سے معتقد نہ ہوا تو اس کا خون و مال تو بیخ گیا لیکن وہ منافق ہے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

(۳) عبادتِ بدنی: جیسے قیام و رکوع و سجود نماز میں۔

(۴) عبادتِ صوم و افعالِ حج و عمرہ جیسے طواف، ذبح، نحر، حلق وغیرہ

(۵) عبادتِ مالی: حق تعالیٰ کے امتثال امر میں انفاق مثلاً زکوٰۃ، صدقہ۔

اسی طرح واجبات و مندوبات کی افعال و اقوال، اموال و ابدان میں اور انواع میں جو سب عبادت میں داخل ہیں، ان کا حصر یہاں ضروری نہیں، صرف اہماتِ عبادت کی یہاں تصریح کر دی گئی۔ کلی طور پر یوں سمجھو کہ شبہی نفع کے لیے مخلوق جو کام کرتی ہے وہ عبادت ہے۔ اگر اس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے (اِذِنَ بِالله) ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، اگر اس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی وہ (مَالَهُ يَأْذِنُ بِالله) ہے تو وہ غیر اللہ کی عبادت ہے۔

خوب سمجھ لو کہ شرک واقع ہوتا ہے عبادت کے ان ہی افعال اور عقائد میں۔ بنی نوع انسان کے اکثر افراد عبادت ہی کے معاملہ میں شرک میں گرفتار ہوتے رہے۔ انہوں نے غیر اللہ کو اپنا الہ یا معبود قرار دیا، اپنے نفع کے لیے ان کی مرضی کا اتباع کیا یعنی اپنا نفع و منافع سمجھا، باعتبار نفع و ضرر ان کی تعظیم کی، وقت حاجت ان سے فریاد رسی چاہی، ان سے استعانت کی، ان کو پکارا، ان سے التجا کی، استغاثہ کیا، رجاء و خوف کا تعلق ان سے رکھا، ان کی نذر و نیاز میں اپنے مال کا ایک حصہ صرف کیا اور ذبح و نحر سے ان کا تقرب چاہا۔ غرض فقر و ذلت کی نسبت ان سے جوڑی، ان کے سامنے خضوع کیا اور جب انہیں کرام نے انہیں افراد عبادت شرک کی دعوت دی، توحید فی العبادت کی تلقین کی انہیں للکارا کہ

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگذر ز خدایے کہ بعد رنگ تراشی

تو ان مشرکین نے از را و تکبر و عناد پلٹ کر پوچھا اِحْتَسِبْنَا لِلْبَعْدِ بِالله وَحْدَهُ وَكَلَّمَ مَلَائِكَةَ بَعْثِكَ اَبْنَاؤُنَا؟ رپ ۱۶۰ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہم سے یہ کہو کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے

باپ داد کے معبودوں کو چھوڑ دین؟ اَجْعَلُ الْاِلٰهَةَ لِهَا وَّلِحِدًا، اِنَّ هٰذَا الشَّيْءُ عَجَابٌ رَّبِّعَ ۱۰
 یعنی بڑے تعجب کی بات ہے کہ سب معبودوں کو اس شخص نے تو ایک معبود کر ڈالا۔
 دیکھو ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے قائل
 تھے، مگر تھے اس پر ایمان رکھتے تھے، ان کو اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے
 لٰتِن سَاَلْتَهُمْ مِّنْ خَلْقِهِمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ رَبُّنَا ۱۳ (پہا ۱۳) زمین و آسمان کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہر لائن
 سَاَلْتَهُمْ مِّنْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَيَقُولُنَّ خَلَقْنٰهُنَّ الْعِزِّزُ الْعَلِيْمُ۔ رزاق بھی وہی ہے۔ محی و
 ممیت بھی وہی اور مدبر امر بھی وہی: قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصٰرَ
 وَمَنْ يَخْبِئُكُمْ اَمِّنٌ مِّنَ الْمَيْتِ وَيُخْرِجُكُمْ لِيَمِيْتٍ مِّنَ الْحَيٰۤى وَمَنْ يَدْبُرُ الْاٰخِرَ فَمَا تَسْقُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا
 تَتَّقُوْنَ (پہا ۱۹) اسی کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہی ہر شے کی پناہ گاہ ہے: قُلْ مَنْ
 يَّبْدِئُ خَلْقَ كُلِّ شَيْۡءٍ وَهُوَ يُجَيِّدُ وَاَلَمْ يَجْعَلْ لَكُمْ اَنْۢ اَنْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُولُوْنَ اللّٰهُ قُلْ فَاَنۢ تَشْعُرُوْنَ
 (پہا ۲۰) وہی آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک اور رب ہے: قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّمِيعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ
 الْعَظِيْمِ، سَيَقُولُوْنَ اللّٰهُ، قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پہا ۲۱) زندگی گزارنے کے قانون میں اپنے کو آزاد سمجھتے
 تھے، ہدایت رب کا محتاج نہ جانتے تھے۔

فرعون جس کو کفر میں اتنا غلو تھا اس کے متعلق بھی حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی زبانی کہلوا یا
 ہر۔ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بِصٰۤاۡتِنَا ۱۲۶ (پہا ۱۲۶) تو یہ خوب جانتا ہے
 کہ یہ عجائبات خاص آسمان و زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لیے ذرا نوح ہیں، اور تمام
 مشرکین کے بارے میں ابلیس لعین تک نے کہا۔ اِنۢىۡ اَخٰفُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔ نیز رب النظری اور
 رب البصائر غویبتی؟

صاف ظاہر ہے کہ ان مشرکین کا جرم "اشراک فی الذات" نہیں تھا، یعنی یہ اللہ کی ذات کے
 برابر کسی غیر کو واجب الوجود یا ازلی وابدی نہیں مانتے تھے، اور نہ ان کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکا
 تعلق سوائے تزییہ کے دنیا میں کوئی فرقہ اس کا قائل ہی نہیں ملتا۔ مشرکین کہ توحید پر یوبیت تک کے مفر

تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی خالقیت اور رزاقیت، مالکیت و حاکمیت و ربوبیت کو مانتے تھے اور غیر حق تعالیٰ کو حق تعالیٰ ہی کا مربوب، مرزوق، مخلوق، مملوک و محکوم جانتے تھے چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے۔ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكَ هَوْلًا تَمْلِكُهُ وَمَا لَكَ يَعْنِي "اے اللہ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی شے کا مالک نہیں۔"

اس طرح وہ نہ صرف حق تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر رہے ہیں بلکہ اسی کو مالک و حاکم قرار دے رہے ہیں اور اسی کی ربوبیت کے قائل ہو رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس اعتراف و خود باری اور اس کی الوہیت و ربوبیت کے انہیں کافر و مشرک کیوں ٹھہرایا گیا، ان کے تمام نیک اعمال کیوں جھٹ اور برباد قرار دیے گئے۔ خلود فی النار کی وعید ان کو کیوں سنائی گئی؟ ان کا یہ ایمان باللہ کیوں ان کی جان و مال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ کر سکا؟ اس ایمان کے باوجود اعداء اللہ کیوں قرار پائے؟ ان کو کذاب، مسحور، ظالم کیوں کہا گیا؟ ان کا شمار "مسلکین" میں کیوں ہوا؟ انہیں بے عقل حیوان بلکہ ان سے بدتر کیوں ثابت کیا گیا؟ اِنْ هُمْ إِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا؟ کا فیصلہ ان کے متعلق کیوں فرمایا گیا؟

اس کا جواب تم اوپر پڑھ چکے ہو وہ ایک لفظ میں صرف یہ ہے: اِشْرَاكٌ فِي الْعِبَادَةِ۔ ہر قوم اور ہر امت کے لیے ایک نبی مبعوث ہوا اور اس نے "توحید فی العبادت" ہی کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی؛ ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا الله ربهم (حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کو افراد عبادت الہی کی طرف بلایا کہ جس طرح تم افراد ربوبیت کے منظر ہو، اللہ ہی کو رب جانتے ہو، اسی طرح اللہ ہی کو معبود جانو۔ لَا اِلَهَ اِلَّا اللهُ کے قائل ہو جاؤ۔ اس کے معنی و مقصدی پر عمل کرو، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، تمہاری ساری عبادت سرگودھائی قلبی و قلبی طور پر فالص اللہ کے واسطے ہو۔ استغانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا تذکرہ، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت یا پرستش کی کوئی سی شکل صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔

اس وقت غیر کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ آئے! تم اللہ ہی کے فقیر ہو، ذل و افتقار کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لو، جھوٹے معبودوں سے اپنی بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لو، ان سے نفع و ضرر کی توقع مطلقاً چھوڑ دو، اللہ تمہارے لیے بہر حال کافی ہے۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا
تہیں صرف اللہ ہی کا ہونے کے رہنا چاہیے۔ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ
باخلق آشنا نہ شود مبتلا سے تو بیگانہ باشد از ہمہ کس آشنا سے تو

مخوابم از خدا بد عاصد ہزاران جاں تا صد ہزار بار بمیہم ہائے تو
مشرکین نے اس پیغام کو سن کر کہا دیکھو ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں، اس کا انکار نہیں
کرتے اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانتے بلکہ ان کو اللہ ہی کا مخلوق اور بندہ مانتے ہیں
اللہ ہی کو مالک و حاکم و رب سمجھتے ہیں، مستقل معبود بھی اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے بتوں کو
اللہ ہی کی ہلک سمجھتے ہیں، ہم ان کو محض اپنا شفیع (رکیل اور سفارش) جانتے ہیں۔ ہم ان کی
عبادت اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت کی وجہ سے ہماری سفارش یا شفاعت
اللہ تعالیٰ کے پاس کر سکتے ہیں۔ ہولاء شفعاء نا عند اللہ (پ ۶۷) ان کی عبادت ہمیں اللہ
تعالیٰ کی ناراضی و عکس سے چھڑا کر اس کا قرب عطا کر سکتی ہے۔ مَا نَعْبُدُ هُمْ اِلَّا لِيُقْرِبُوْنَا
اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی رَبِّہُمْ اِیْہِیْ اِنَّ کَاذِبًا کَرًا اور شرک تھا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُجِدُنِیْ مِنْ هٰوًا
کَاذِبًا کَفَّارًا (پ ۶) سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرکُوْنَ (پ ۶)

اب ذرا اسی موقع پر تحقیق کر لو کہ ان مشرکین کے معبود کون تھے جن کو وہ شفیع اور مقرب
سمجھ رہے تھے؟ انام فخر الدین رازوی نے تفسیر کبیر میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے ان کی
تحقیق کی رو سے بت پرستوں (عابدان اوٹان) کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں کیونکہ انہیں
سب سے پہلے ہی جن کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور جب انہوں
نے ان بت پرستوں کو توحید معبودیت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا اعبُد اللّٰہ و اتقوہ و اطیعو
(پ ۶۷) تو ان بت پرستوں نے ان کی دعوتِ شب و رون کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ

لَا تَدْرِيْنَ اِلٰهَيْكُمْ وَلَا تَدْرِيْنَ وَاَوْلَا سُوَاعًا وَلَا يَعْثُوْنَ وَيَعْبُوْنَ وَتَسْرًا يَعْنِيْ تَمَّ اِنِّ

معبودوں کو پہر گز نہ چھوڑنا اور نہ وہ کو اور سواع کو اور نہ یعوث کو اور یعوق کو اور نہ سر کو چھوڑنا

اب ان کے یہ معبودانِ باطل و دوسواع وغیرہ کون تھے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے نشان دہی کی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ

تھے، ان کی موت کے بعد ان کے بیٹھنے کی جگہ پر ان کے نشان قائم کیے گئے، ان کا بھی وہی

نام رکھا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ان نشانوں کی پریش شروع کر دی گئی۔ اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح

یہ بزرگ زندگی میں حجاب الدعاء رہے ہیں، روزِ حشر بھی مقبول الشفاعت رہینگے، اور اللہ تعالیٰ

کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان ہی کے حال کی خبر ہمیں اس آیت میں دی گئی ہے:-

يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا

یعنی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت

نَصْرُهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُوْنَ

کرتے ہیں جو نہ ان کو مضر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع

هُمُوْا اَوْ شَفَاعًا وَّاَعِنْدَ اللّٰهِ قُلُ

پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے

اَتَّبِعُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي

سفاشی ہیں آپ کہہ دیجیے کہ کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِمَّنْ يُّشْرِكُوْنَ

دیتے ہو جو خدا کو نہیں معلوم، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین

وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (پ ۶۷)

میں وہ پاک اور بزرگ ہے ان لوگوں کے شرک سے۔

اس تحقیق سے صاف ظاہر ہے کہ بت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بتوں کو معبود

نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی بت پرستی کا نشانہ اولیاء و انبیاء وغیرہ کی تعظیم تھی۔ انہوں نے اپنے بتوں

کو انہی کی صورت پر تراشا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع سمجھ کر اپنا سر نیازان کے سامنے

بجھلاتے تھے۔ اس طرح وہ اصل میں ولی پرست، صالح پرست اور نبی پرست تھے، اب ذرا فخر رازی کی

عبارت بھی سن لو جو امرہ کی آیت کی توجیہ و تفسیر میں انہوں نے لکھی ہے:-

اَللّٰهُمَّ وَضَعُوْا هٰذِهِ الْاَصْنَامَ وَالْاَوْثَانَ

یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے انبیاء و

علی صواب انبیاء اللہ و اکابرہم و زعموا

اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ

بہ رواہ البخاری۔

انھم متی اشتغلوا للعبادة هذا التامیل جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہونگے تو یہ اکابر
 فان اولئك الاکابر تکتون شفعاء هم اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے اس کی نظیر
 عند الله تعالى ونظيره في هذا الزمان اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں
 اشتغال کثیر من المخلوق بتعظیم قبور سے مشغولیت ہے اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان
 الاکابر علی اعتقاد انھم اذا عظموا قبورهم قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے
 فانھم یکتون شفعاء لهم عند الله شفیع ہونگے۔

اوپر کی توضیحات سے مندرجہ ذیل چار امور صاف طور سے لازم آتے ہیں۔ انہیں خوب
 ذہن نشین کر لو۔

(۱) زمانہ قدیم کے بت پرست حقیقت میں انبیاء پرست اور اولیاء پرست تھے جن تعالیٰ نے
 انہیں "مشرک" قرار دیا۔

(۲) وہ خود اس امر کے قائل تھے کہ بت ہمارے بالاستقلال معبود نہیں بلکہ بالاستقلال ہمارا
 معبود اللہ ہی ہے اور یہ صرف ہمارے سفارشی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو شفیع یا سفارشی
 جان کر بھی اس کی عبادت کرنا موجب شرک ہے (یعنی کسی کو سفارشی یا شفیع بھنا یہ شرک نہیں
 ہے بلکہ ان کی عبادت اس لیے کرنا کہ ہماری سفارش کریں گے یہ شرک ہے۔

(۳) جو افعال عبادت ان مشرکین سے صادر ہوئے اگر کسی کلمہ گو سے بھی صادر ہوں تو اس
 پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کا دعویٰ اسلام اور اس کی کلمہ گوئی اطلاق شرک سے
 مانع نہ ہوگی چنانچہ اسی وجہ سے امام رازیؒ نے گور پرستوں کو بت پرستوں کا نظیر قرار دیا۔
 (۴) جب غیر اللہ کو شفیع جان کر ان کی عبادت کرنا شرک ہوا تو پھر ان کو بالاستقلال عالم
 میں متصرف جان کر پر جانا تو بدرجہ اولیٰ شرک ہوگا۔ مثلاً اولیاء و انبیاء سے اولاد مانگنا، رزق کی
 کشادگی چاہنا، قضاء حاجات کی دعا کرنا وغیرہ۔

یہ تفسیر کبیرہم من ۵۵۲ سورہ یونس تحت آیہ ہولاء شفعاءنا عند الله۔

مشرکین کی عبادت بس یہی تھی کہ وہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و مشفیع اور نافع و ضار بنان کر ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے اور

(۱) ان سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے۔

(۲) اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان سے منتیں مانگتے ان کے لیے جانور ذبح کرتے اور ان کے ارد گرد پھرتے یا طواف کرتے تھے۔ گو وہ حق کی ربوبیت کے قائل تھے اور اس کو خالق و رازق، محی و ممیت، مدبر زمین و آسمان مانتے تھے: فایومن اکثرہم باللہ الا وہم مشرکون!

اب قرآن کریم کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ نداء، دعا، استغاثہ، استعانت، نذر و طواف وغیرہ سب افعال عبادت ہیں، جب حق تعالیٰ ہی معبود و رب واحد و احد ہیں تو پھر ان افعال کا تعلق صرف انہی سے ہونا چاہیے اور کسی غیر سے نہیں اَعْبَدُوا اللّٰهَ وَلَا تَشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا (۲۶) یہی ہے "افراد عبادت اللہ فاعبُد اللہ مخلصاً للدين، اَلَا لِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ" (۱۵۶) مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روار کھا تھا اور اسی لیے انہیں تہدید کی گئی تھی کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم جانتے ہو کہ حق تعالیٰ کا کوئی ندا ہم سر نہیں پھر تم کیوں غیر اللہ کی عبادت کی کہ ان کو معبود قرار دے کر انہیں حق تعالیٰ کا ہمسر بنا رہے ہو؟ تمہارا یہ عقیدہ کہ اگر تم ان کا تقرب ندا و دعا، نذر و نیاز، ذبح و نحو طواف و علوف کے ذریعہ حاصل کرو گے تو یہ تمہیں حق تعالیٰ کے "قرب" کر دینگے اور تمہارے شفع بن جائینگے قطعاً باطل ہے کفر بحت ہے، شرک محض ہے!

دعا عبادت ہے دعا (دعوت، دعا، دعویٰ) کے معنی ندایا پکارنے کے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا اجماع ہے۔ چنانچہ امام راجح نے اپنی مفردات میں تصریح کی ہے کہ الدعاء کالتداء یعنی دعا ندا کے معنی میں ہے۔ صرح میں بھی دعا بمعنی خواندن ہے۔ ہدایک میں ندا اور دعا کا فرق و امتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا ہے: الدعاء ما یسمع والدعاء قد یسمع وقد لا یسمع۔ اس سے دعا و طیفہ کسی فرار پاتی ہے جمع الجار میں ہو گیا گیا ہے سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے رہیے، یاد رکھو عبادت ہو کہ خالص عبادت ہی کے لیے سزاوار ہے۔

کہ الدعاء الغوث یعنی دعا فرماد کرنا اور وہابی مانگنا ہے اور بطور شہادت آیت اَدْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ فِي شَيْءٍ مِنْ دَعَائِكُمْ اس کے معنی اس طرح کیے ہیں: اے استغیثو! اذ انزل بكم الضر یعنی جب تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو مجھ سے فرماد رسی چاہو۔ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی وَاخِرُ دَعْوَاهُمْ اِنَّ الْاِسْمَاءَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ دعا کے معنی پکارنے کے ثابت ہوتے ہیں۔ نیز اس آیت سے لَا تَجْعَلُوا دَعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدَعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ اگر یہاں دعا کے معنی عبادت کے لیے جائیں (جیسا کہ بعض کا زعم ہے) تو لازم آتا ہے کہ صحابہؓ ایک دوسرے کی عبادت کرتے تھے۔ وحا شاہم عن ذلك۔ دعا شرع میں عبادت کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس سے عجز عباد اور قدرت رب العباد کا اظہار ہوتا ہے، مانگنا، گرا گرا کر مانا، عجز کا ظاہر کرنا لوازم عبودیت سے ہے جس طرح عظمت و کبریا، ہیبت و قدرت، جلال و استغنا لوازم عبودیت سے ہیں۔ لوازم عبودیت ظاہر ہے کہ عبادت ہیں۔ چنانچہ صاحب تفسیر نیشاپوری نے اُجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ کے ذیل میں خوب تصریح کر دی ہے۔

اعلم ان الدعاء مصدر، دعوت ادعو، وقد تكون اسما نقول سمعت دعاء كذا نقول سمعت صوتا، وحقيقة الدعاء استدعاء العبد برب جل جلاله العناية والاستمداد والمعونة، وقال جمهور العقلاء، ان الدعاء من اعظم مقامات العبودية وانه من شئنا الصالحين وداب الانبياء والمرسلين والقران ناطق بصحة عن الصدوقين والاحاديث مشيونة بالدعية لما ثوره بحيث لا يصح للاحكام ولا مجال للعناد (مطبوعہ ایران ۱۳۲۵ھ شرح ص ۱۹۳)

مفصلہ یہ کہ دعا مصدر ہے اور کبھی اسم بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں نے دعا کو سنا جس طرح کہ آواز کو سنا اور دعا کی حقیقت یہ ہے کہ عبد اپنے رب سے استدعا کرتا ہے اور اس مدد و معونت و عنایت کا خواستگار ہوتا ہے۔ جمهور عقلاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دعا بلند ترین مقامات عبودیت سے ہے یہ صالحین کا شعار اور انبیاء و مرسلین کا طریقہ رہا ہے۔ قرآن ناطق ہے کہ وہ صدیقین سے آیت ہے، اور احادیث ادعیہ ما ثورہ سے بھری ہوئی ہیں، یہاں مجال انکار نہیں۔

جب دعا عبادت ہے تو پھر غیر اللہ سے دعا کرنا شرکِ صریح قرار پائیگا۔ لیکن قرآن کریم نے مخلوق سے مدد و معاونت اور استغاثہ اس صورت میں جائز رکھا ہے کہ جب ایسے امور میں کیا جائے جو ان کی قدرت و قوت کے احاطہ میں ہوں، دیکھو قرآن میں اس اسرائیلی کا قصہ مذکور ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی قبیلے کے خلاف استغاثہ کیا تھا۔ فَاسْتَعَاثَ الَّذِي مِنْ شَيْعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ (پ ۵۶) کسی دوسری جگہ دین کے کاموں میں مدد چاہنا اور مدد دینا واجب قرار دی گئی ہے: وَإِنْ اسْتَضَرُّوْكَ فِى الدِّىْنِ فَعَلَيْكُمْ النَّصْرُ (پ ۶۴) اسی طرح نیکی اور تقویٰ میں استغاثت کا حکم دیا گیا ہے: تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (پ ۶۴) جب مظلوم کسی ظالم کے خلاف حاکم کے پاس فریاد کرتا ہے، یا بیمار حکیم سے کہتا ہے کہ تم میرا علاج کرو یا کسی مقدمہ میں وکیل سے مدد لیجاتی ہے تو اس طرح کی استغاثت و استغاثہ منع نہیں۔ ایسا ذنبیہ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مامور بہ ہے لیکن بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب بالذات مؤثر نہیں حق تعالیٰ ہی ان میں اثر پیدا کرتے ہیں، ہر چیز اپنے اثر کے طور میں اللہ تعالیٰ کے اذن کی محتاج ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے کہ اشیاء کی وجود بخشی کے وقت ہی ان میں اثرات رکھ دیے گئے ہیں اور اسی راہ سے وہ اثر کرتی ہیں اور اب حق تعالیٰ کے حکم و امر کی حاجت نہیں، یا ان میں یہ قوت ہے کہ کبھی بھی اپنے آثار و احکام سے تخلف نہ کریں! دیکھو جب حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تو حق تعالیٰ نے آگ میں اثر احرار پیدا نہ کیا اور نہ جلے!

غرض آثارِ اشیاء حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور بارانِ صفت اشیاء پر بہتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مخلوق میں فعل کی جو قدرت ہوتی ہے وہ فعل کے وقت ہی عنایت ہوتی ہے اور اس سے فعل کا صدور ہوتا ہے، یہ نہیں کہ فعل کی قدرت پہلے ہی سے مخلوق میں موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے افعال پر قادر ہے اور خالق کا محتاج نہیں، ورنہ یہ لازم آئیگا کہ تمام مخلوقات وجود میں آنے

لیہ سورہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے موسیٰؑ سے اس کے مقابلہ میں جو کہ ان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی۔ لہذا اگر وہ تم سے دین کے کام میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمہ مدد کرنا واجب ہے۔ نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔

کے بعد حق تعالیٰ سے مستغنی ہوں اور بے پرواہ، مستقل ہوں اور غیر محتاج، واللہ اعلم بالصواب، فالملزوم مثله
 لہذا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ثم اعلم ان ارادة العبد التي تفارق
 فعله وقدرته عليه حال صنع
 مخلوقان مع الفعل لا قبل ولا بعدا
 یعنی ارادہ، قدرت اور فعل سب مخلوق الہی ہیں، یہی عقیدہ ہے اہل سنت و جماعت کا، اور معنی ہے
 اس آیت صریح پر: **وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ** (سورہ ۶،) نیز اس آیت پر **مَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ
 يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ** (سورہ ۲۶) نیز **اِقْوَةَ اِلَّا بِاللّٰهِ** پر۔

اس طرح عقیدہ کی تطہیر ہونے کے بعد یہی سمجھیں آتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے سوا نہ کوئی غیث
 ہے اور نہ غیث، نہ کوئی معین ہے اور نہ مستعان، ہماری ہر فریاد رسی علی الاطلاق حق تعالیٰ ہی سے
 ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک منافق تھا جو مسلمانوں کو دق کیا کرتا تھا
 حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا چلو حضرت سے استغاثہ کریں۔ آپ نے سن کر فرمایا کہ مجھ سے استغاثہ نہ کرنا چاہیے
 استغاثہ تو اللہ ہی سے کرتے ہیں (رواہ الطبرانی) اگر کسی غیر کے ہاتھ سے کوئی چیز حاصل ہو جائے تو
 وہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت، کیونکہ حقیقت اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کا اسم مبارک غیث و معیشہ
 نام امور اختیار یہ میں خلق سے استعانت جائز ہے مگر اسی عقیدہ کے ساتھ جس کا بھی ذکر ہوا۔

جن امور میں سوا حق تعالیٰ کے کسی اور کو قدرت نہیں ان میں کسی اور کو پکارنا اور ان سے
 استغاثہ کرنا، یا اعانت چاہنا حرام یا شرک ہے جیسے رزق کا دینا، عینہ کا برسانا، بیمار کو شفا بخشنا، ہدایت
 کرنا، گناہ کا بخشنا وغیرہ۔ اب پہلے بعض ان آیات قرآنی پر بھی غور کرو جن سے دعا کا عبادت ہونا صاف

من خلق من خالق غير الله يرزقكم من السماء والارض - وهو الذي ينزل الغيث من
 بين يديكم فلو انتم كنتم تعلمون - انك لا تقدرى من احببت
 ولكن الله يقدرى من يشاء - ومن يغفر الذنوب الا الله - من غفر الذنوب الا الله

ثابت ہوتا ہے۔

دیکھو حق تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا کا حکم فرما رہے ہیں۔ اَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۗ إِنَّهُ
 لَذُو حِجْبٍ مُّعْتَدٍ ۚ (پ ۱۳۷) دوسری جگہ ارشاد ہے: ۗ اَدْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ
 قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (پ ۱۳۷) ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں سے
 دعا چاہتے ہیں ماسی سبب سے دعا عبادت ہے۔ اس کی مزید توثیق اس امر سے ہوتی ہے کہ غیر کو
 پکارنے سے منع فرما رہے ہیں فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا (پ ۱۱۶) وَلَا تَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ
 (پ ۱۱۷) پھر دعا کو اپنے ہی لیے مخصوص کر رہے ہیں۔ لَدَعْوَاهُ الْحَقِّ (پ ۱۱۷) اس طرح اشبہاوا
 لعیاد دعا کو حق تعالیٰ اپنی ہی ذات کے لیے مخصوص فرما رہے ہیں اور اپنے سوا کسی کو اس کے لائق
 نہیں قرار دے رہے ہیں یعنی منادی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں! پھر دعا کا حکم دے کر اس کو صاف
 طور پر عبادت قرار دیا گیا ہے: اَدْعُونِي اسْتَجِبْ لَكُمْ (پ ۶)

اسی طرح جب دعا کا عبادت ہونا آیات قرآنیہ سے ثابت ہوا تو اب احادیث نبویہ پر
 ایک نظر ڈالو، جو دعا کو عین عبادت قرار دے رہی ہیں۔

(۱) عن نعمان بن بشیر قال قال رسول الله صلعم: الدعاء هو العبادة ثم قرأ
 قال ربكم اذ عوني استجب لكم (رواه احمد والترمذي ابوداؤد والنسائي وابن ماجه) یعنی دعا
 عبادت ہی تو ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اذ عوني استجب لكم۔ اس آیت کے پڑھنے سے
 مراد یہ ہے کہ دعا کے عبادت ہونے کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کا حکم کیا ہے۔

(۲) عن انس قال قال رسول الله صلعم الدعاء هو العبادة (رواه الترمذي) یعنی
 دعا معزبے عبادت کا، جس طرح مغزشتے، شہر کی حقیقت ہوتا ہے اسی طرح دعا یعنی خضوع و خشوع و
 تذلل کے ساتھ پکارنا عبادت کی حقیقت ہے اور اس لیے مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کے ساتھ جو عیب
 الدعوات ہیں۔

۱۔ دعا کو عبادت کہنا
 ۲۔ ہم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرتے ہیں اور چپکے چپکے اور راقی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں

(۳) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول رسول اللہ صلعم: من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (رواہ الترمذی) یعنی جو اللہ سے نہ مانگے اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے جب اللہ سے نہ مانگنا غصہ کا باعث ہوتا ہے تو اس سے نہ مانگ کر اوروں سے مانگنا تو اور زیادہ غصیب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا اللہ تعالیٰ کو کس قدر محبوب ہے۔

جب دعا کا عبادت ہونا ثابت ہو گیا تو اب صاف ظاہر ہے کہ غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہے، شرک فی العبادت ہے۔ اس مقصد کے لیے آیات قرآنیہ کا پیش کرنا ضروری نہیں لیکن مزید قوت کے لیے چند آیات پر غور کر لو:

(۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِنَ الظَّالِمِينَ یعنی مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ نقصان پھرا کر تو ایسا کرے تو تو بھی اسی وقت ظالموں میں ہو جائیگا۔ (پ ۱۶۶)

جلبِ منفعت و دفع مضرت کے لیے غیر اللہ کو دور دور سے پکارنا، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو ان سے عرض کرنا اور اس طرح ان کی پرستش کرنا بڑے ظلم و ستم کی بات ہے کیونکہ جس اللہ کی قدرت میں بندہ کا نیک و بد نفع و نقصان سب کچھ ہے اس پروردگار کو چھوڑ کر، اس سے منہ موڑ کر ایسی ہستیوں کی طرف متوجہ ہونا اور ذلت و فقر کی نسبت ان سے جوڑنا جو نہ کسی کے نفع پر قادر ہیں اور نہ نقصان پر اس سے بڑھ کر دنیا میں ظلم و ستم کیا ہو سکتا ہے! شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے: إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (پ ۱۱)

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے بعض مفسرین نے ”دُونِ اللَّهِ“ اور ”غَيْرِ اللَّهِ“ کی توجیہ میں اصنام و اوثان کا ذکر کر دیا ہے۔ اس لیے بعض شرک پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ شرک اس وقت ہوگا جب بتوں سے دعا کی جائے۔ انبیاء و اولیاء سے دعا کرنا، مراد میں مانگنا شرک نہیں۔ یہ صریحاً غلط ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) علم اصول کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ”العبرة بعموم الالفاظ لا بخصوص الموارد“ یعنی اعتبار

عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص موارد کا، غیر اللہ اور دون اللہ دونوں عام الفاظ ہیں۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں سب ان میں داخل ہیں، خواہ ولی نبی ہو یا بھوت پری۔ چنانچہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَكُم بِهِمْ قُلُوبٌ اَدْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ اَنْهُمْ اِلَهَةٌ مِنْ دُونِ كَالْمَلَائِكَةِ وَالْمَسِيحِ وَعَزْرِيْءُ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو ملائکہ اور انبیاء کو پکارے وہ بھی مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ویسی ہی زجر و توبیح کی ہے جیسا کہ بت پرستوں کی کی ہے۔ اس عموم الفاظ کے اعتبار سے صاحب جلالین نے اکثر مقامات پر دون اللہ کا ترجمہ غیر اللہ سے کیا ہے۔

(۲) جیسا کہ ہم نے اوپر تصریح کی ہے، کفار نے اپنے بت اپنے اکابر (انبیاء و اولیاء) ہی کے نام پر تیلے تھے اور ان کی بت پرستی کا شمار ان ہی اکابر کی تعظیم تھی، لہذا وہ دراصل بتوں اور درختوں کی عبادت نہیں کر رہے تھے بلکہ انبیاء و اولیاء و صلحاء کو پوج رہے تھے۔

غرض غیر اللہ و دون اللہ سے مراد نہ صرف بت ہیں بلکہ انبیاء و اولیاء سب اس میں شامل ہیں۔ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص موارد کا۔ اور عقلاً غور کرو کہ انبیاء و اولیاء غیر اللہ ہیں کہ عین اللہ؟ جب غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تو صنم و وشن، بتی دلی، پیر، شہید، بھوت پری، سب حرمت عبادت میں مساوی ہیں اور ان میں تفریق باطل ہے۔ اگر ہم تفریق کے قائل ہو جائیں کہیں کہ عبادت من دون اللہ کی حرام و شرک ہے بخلات عبادت اولیاء و انبیاء کے تو لازم آتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء عین اللہ ہیں اللہ لازم باطل فالملزوم مثلہ۔

(۱) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادًا مِّثْلَ الْكُفْرِ فَاَدْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِیْبُوا الْكُفْرَانَ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (پہ ۱۲) یعنی واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں سو تم ان کو پکارو، پھر ان کو چاہیے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو!

اس آیت میں اس امر کی صاف طور پر تصریح ہے کہ مشرکین اللہ کے سوا بعض اولیاء

انبیاء اور ملائکہ کو ذریعہ مضرت و جلب منفعت کے لیے پکارا کرتے تھے اس لیے ان سے کہا گیا کہ جن کو تم امداد کے لیے پکارنے ہو وہ بھی تمہارے مانند بندے ہیں محض اصنام و اوثان پر عباد کا اطلاق نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور اگر مجازاً اصنام بھی مراد لیں تو امثالکم کا لفظ اس سے ابا کریم ہے۔ اسی لیے مقاتل نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد ان عباد سے ملائکہ ہیں اور اس آیت کے مخاطب وہ ہیں جو ملائکہ کو پوجتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقبول بندوں سے دعا کرنے والا بھی مشرک ہے اور مردود، اس لیے کہ وہ من دون اللہ سے دعا کرتا ہے اور میں دون اللہ عام ہے اور اس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، مقبول ہوں یا مردود (۲) قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهَا أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا یعنی جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ان کو پکارو تو سہی سو وہ تم سے نہ تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں نہ ان کے بدل ڈالنے کا، یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

اس آیت میں اس امر کی خوب تصریح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں کہ کسی کی مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکے یا اس کو راحت و نعمت میں بدل دے، کوئی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کسی کی مصیبت و ضرر کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور یہ اہم مشرک جن ہستیوں کو اچھے بُرے کا مختار جان کر پکارتے ہیں ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے امید رکھتے ہیں اور اسی کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے مراد خدا کے مقبول بندے ہیں نہ کہ اصنام و اشرار عباد، کیونکہ حق تعالیٰ سے امید و رجاء رکھنا، اس کے قرب کا طالب ہونا اشرار سے ممکن نہیں اور اصنام سے تو اور زیادہ غیر ممکن ہے پھر جب مقبول بندوں کو پکارنے اور ان سے اپنے مصائب کا دفعہ چاہنے والوں پر یہ عتاب ہو رہا ہے تو مردودین کے

انتے والوں کا کیا حال ہوگا۔

تفسیر بیضاوی میں اس آیت کی تفسیروں کی گئی ہے۔ قل ادعوا الذین زعمتم انهم
الہة من دونہ کالملائکة ولسیچہ وعرزیر، فلا یملکون فلا یتطیعون کشف الضمیر
عنکم کالمرض و الفقر و لا تقویلا و لا تقویلا ذلک منکم الی غیر کلمہ دیکھو بیضاوی نے صراحت
کر دی ہے کہ ملائکہ اور مسیح اور عزیر تک "کشف ضمیر یعنی مرض و فقر و قحط یا مصائب و آفات کے رفع
کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بطور خود پھیر سکتے ہیں۔ جب ان ابرار کا یہ حال ہوتا
ان سے کم درجہ کے لوگوں کا کیا پوچھنا!

(۳) یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُوبٌ مِّثْلُ مَا سَمِعْتُمْ عَوَالَہٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ
یَخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوْ اٰجْتَمَعُوْا لَوْ اَنْ یَسْلُبُوْہُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَا یَسْتَفِیْذُوْہُ مِنْہُ ضَعْفَ الطَّالِبِ
وَ الْمَطْلُوْبِ فَاَقْدَرُ اللّٰہِ حَقَّ قَدْرِہٖ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیُّ عَزِیْزٌ رَّحِیْمٌ یعنی اے لوگو! ایک عیب
بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کو تم لوگ خدا کو چھوڑ کر
پکارتے ہو، وہ ایک مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی جمع ہو جائیں اور اگر ان سے
مکھی کچھ پھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے، ایسا عابد بھی پیر اور ایسا معبود بھی پھر ان
لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہیے تھی وہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب
ہے۔

ان آیات سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے
دعا مانگتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں وہ صریح گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہیں، ان کا مذہب
باطل ہے، کیونکہ

راہ جن کی یہ عبادت کر رہے ہیں خواہ وہ اصنام ہوں یا ملائکہ عظام یا انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ
والسلام وہ ایک مکھی تک کو پیدا نہیں کر سکتے پھر ان سے کسی ایک چیز کا مانگنا اور اس کے لیے

۱۔ تفسیر بیضاوی ص ۲۰۲ مطبوعہ دارالطباعة عامہ قسطنطنیہ ۱۳۰۲ھ

گرا کر انا جس کو پیدا کرنے کی ضرورت ہو کیسی جہالت ہے! جب وہ سب کے سب جمع ہو کر حیرت سے
 حقیر چیز کو پیدا کرنے کے قابل نہیں تو پھر غور کرو کہ انفرادی حیثیت سے وہ کس قدر عاجز ٹھہرتے ہیں
 (۱) اب رہا ان سے ایسی چیز کا طلب کرنا جس کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں سو یہ بھی باطل
 ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے جو چیز جس کے لیے مقدر کر دی ہے اس میں نہ وہ ایک ذرہ کا اضافہ کر سکتے
 ہیں اور نہ اس سے ایک ذرہ کی کمی، وہ کسی چیز کو ایک مکھی سے بھی چھین کر دوسرے کو دینے کی
 سکت نہیں رکھتے اور نہ آپ ہی لینے کی قوت، تو پھر ان سے عرضِ حاجات اور طلبِ مرادات
 کرنا کتنی حماقت ہے! اور آخر میں یہ بھی فرما دیا گیا کہ ان مشرکین نے حق تعالیٰ کی قدر جیسی چاہیے
 ویسی نہ سمجھی، اگر سمجھتے تو حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان بیچاروں سے کہ جن سے ایک مکھی تک نہیں بن
 سکتی گلہ ہے کو حاجتیں مانگتے اور مرادیں طلب کرتے "خاک پڑے ایسی سمجھ پر جو بادشاہ کے
 روبرو فقیر سے بھیک مانگے" ۱۷

شرمت باد کہ من بسویت نگران باشم تو ہنی چشم بسوئے دگران (جائی)

یہاں من دون اللہ سے محض اصنام اور بت مراد لینا کسی طرح درست نہیں۔ جیسا کہ ہم نے
 اوپر کہا ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوق ہے سب اس میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں
 حق تعالیٰ نے انہیں قابلِ عبادت اور لائق دعا اس سے نہیں قرار دیا کہ وہ کسی شے کی تخلیق
 پر قادر نہیں۔ لن یخلقوا میں کئی اصل میں نفی مستقبل کے لیے آیا ہے اور اس کی نفی موکد ہوتی ہے
 جس طرح تمام اہل لغت اور مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علت عام
 ہے تمام مخلوق کو خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء، اعیان ہوں یا اشقیاء، ان میں سے کسی کو تخلیق کی
 قابلیت نہیں۔ اور یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ بت پرست اپنے بتوں کو بذاتہ معبود نہیں سمجھتے
 تھے بلکہ مقصود ان کی تعظیم سے اولیاء و انبیاء کی تعظیم تھی جن کی صورتوں پر وہ موتی بنائی
 گئی تھیں۔ چنانچہ امام رازی نے اس کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"فالقوم كانوا يعتقدون فيها انها طلسمات موضوعة على صورة الكواكب"

وانها تامل الملائكة والانبیاء المتقدمین وكانوا يعظمونها علی ان
تعظیمها یوجب تعظیم الملائكة واولئک الانبیاء

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو تعظیم و عبادت مخصوص بحضرت حق تعالیٰ جل شانہ ہے اس کو
انبیاء و اولیاء کے ساتھ متعلق کرنا ایسا ہی شرک ہے جیسا کہ بتوں کے ساتھ کرنا ان دونوں
بنیاد پر ان آیات کی تخصیص بتوں کے ساتھ باطل ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ جس طرح بتوں
سے دعا کرنا شرکِ حلی ہے بالکل اسی طرح نبی و ولی سے دعا کرنا بھی شرکِ حلی ہے۔

(۵) كَذَّبُوا الْحَقَّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْمَعُونَ لَهُمْ شَيْءٌ اِلَّا كَمَا سِطْرٌ
كَفَّيْنَا اِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ كَأَنَّهُ وَهَّوْ بِمَا لَعِبَهُ وَمَادَعَاءُ الْكَافِرِينَ اِلَّا فِي ضَلَالٍ رَپَا ۝۶۶ سچا پکارنا
اسی کے لیے خاص ہے اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ
منظور نہیں کر سکتے جتنا کہ پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ
پانی کی طرف پھیلائے ہوتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک آجائے اور وہ اس کے منہ تک آئے والے
نہیں اور کافروں کی جتنی پکار یا درخواست ہے سب گرا ہی ہے۔

یعنی پکارنا اسی کو چاہیے اور مصیبت میں دعا اسی سے کرنی چاہیے جو قسم کے منہ
ضرر کا مالک ہو اور عاجز و فقیر کو پکار لے اور اس کے ساتھ گڑ گڑانے سے کیا حاصل آتی تعالیٰ کے
سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع و ضرر ہے غیر اللہ کو اپنی مدد کے لیے بلانا ایسا
ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کے منہ پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خواہاں کہے کہ میرے
منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے کہ قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچے والا نہیں ہے بلکہ اگر پانی اس
کی منہ میں پہنچ بھی خود چل کر منہ تک نہیں جاسکتا۔

غور کرو کہ اس آیت میں "دعوت" یعنی دعا کی تخصیص حق تعالیٰ ہی کے ساتھ کی گئی ہے اس
لیے کہ جار مجبور و معمول ہے "دعوت" کا وہ اپنے فاعل پر مقدم ہے اور تقدیم معمول کی جگہ ضروری ہے۔

لے دیکھو تفسیر کبیر اور مقامات کے لیے ۳۱ اول ص ۲۲۲ نیز ص ۲۶۸ نیز ص ۸۳ ص ۲۲۲

اس پر علمائے بیان کا اتفاق ہوا اور مفسرین کا اجماع، چنانچہ آیاتك تَعْبُدُوا إِلَهًا كَمَا كُنْتُمْ يُعْبُدُونَ میں بھی یہی صورت ہے۔ یہاں بھی حصر ہے۔ دعا کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ چاہیے اور عبادت کا بھی۔ اسی تخصیص کو مثال سے واضح کیا گیا کہ جو حق تعالیٰ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ ان بتوں کے مانند ہیں جو پیاس لگنے پر کنوئیں کے منہ پر جا کر پانی کو پکارتے ہیں۔ ہر ایسی پکار کو کافروں کی پکار قرار دیا اور اس کا نتیجہ اور انجام "ضلال" یا گمراہی و بطلان و ناامیدی ٹھہرایا۔

(۶) إِذْ قَالَ لِأَسْبِيحُوا مَعِيَ مَا تَعْبُدُونَ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَنْظُرُ لَهَا عَافِيَةً قَالَ

هَلْ يَسْمَعُونَ كَمَا إِذْ تَدْعُونَ، أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يُضُرُّونَ (پ ۹۶) یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہوئی "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ تم کس چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم ان ہی پر عیب بیٹھے رہتے ہیں۔ ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ تمہاری سنت ہے جب تم ان کو پکارا کرتے ہو، یا یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں، یا یہ تم کو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں؟

ان آیات سے واضح ہے کہ غیر خدا کو پکارنا ان سے اپنی حاجتیں طلب کرنا مشرکین کا شیوہ ہے اور بیخ تو یہ ہے کہ جو شخص بت کو چھوڑ کر کسی اور سے دعا کرے یا اس سے امید نفع و ضرر کی بدستقلال رکھے وہ بت پرست ہوا جس کے ساتھ اس نے فقر و ذلت کی نسبت قائم کر رکھی ہے وہ اس کا بہت بے حضرت سعدی نے کیا خوب کہا ہے۔

دل اندوہ مند بیدارے دوست بست! کہ عاجز تراست از صنم ہر کہ نیست!

اس لیے حضرت طبع خدا تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ ليس الشرك عبادة الاصنام بل هو متابعتك لهرك فان تختر من ذلك عز وجل شيئاً سواه من الدنيا وما فيها والاخرة وما فيها فمنا سواه عز وجل غيره فاذا كنت الى غيره فقد اشركت به عز وجل غيره۔

سے شرک کچھ بھی بت پرستی نہیں بلکہ خواہش تمس کی بیروی ہو اور حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی شے کو ان کے سوا دنیا لینی ماہیات و مخلوقات کے ساتھ کہ جس کو حق تعالیٰ کے سوا ہے وہ غیر اللہ ہے، سو جب غیر کی طرف میل ہو تو گویا اس میں شرک و شکیک شکیک ہے۔ (فتوح الغیب مقالہ ہفتم)

غیر حق ہرچہ دولت را بر بود ستر راہ تو بہاں خواہد بود
غیر حق یک ذرہ کاں مقصود تہست تیغ لا برکش کہ آن معبود تہست

مشکرین کے طریقہ کے خلاف موجد کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے مانوس ہوتا ہے،
سرخ و غم، درد و الم میں اسی کو پکارتا ہے، اسی سے اُمید و رجاء رکھتا ہے۔ اسی سے سکون و بردِ قلبی
حاصل کرتا ہے۔

ہر ابیگانگی از خلق با حق آشنا کردہ بطبع من کہیں کم ساختن بسیار می سازد
مومن موجد کی اسی شان کو حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں: **وَيَسِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا
أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِلَىٰ إِلَهِهِ رَاجِعُونَ** (پہلے ۳۴) یعنی "ایسے صابرین کو بشارت سنا
دیجئے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں اور ہم
سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں" غور کرو یہاں "مصیبت" ایم نکرہ اور اذابی عام
پر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مصیبت و آفت میں، ہر درد و الم میں، ہر زنج و غم میں حق تعالیٰ ہی کو یاد
کرتے ہیں، اسی کو پکارتے ہیں، اسی سے فریاد کرتے ہیں کہ **اللَّهُمَّ اَلْحَمْدُ اِلَيْكَ الْمَشْتَكِي وَبِكَ
الْمُسْتَغَاثُ وَانْتَ الْمُسْتَعَانُ وَلا حَوْلَ وَلا قُوَّةَ اِلَّا بِاللَّهِ** "حق تعالیٰ آپ ہی کے لیے تمام تعریف
سزاوار ہے آپ ہی کی طرف ہماری شکایت ہے اور آپ ہی سے فریاد ہے اور آپ ہی مددگار ہیں، ہمیں
کوئی دوسرا نہ بچا سکتا ہے اور نہ سوائے آپ کے کسی میں حرکت ہے نہ قوت"

یارب ز تو یافت صورت آب گل من الطاف تو شد پناہ جان دل من
آسانی کار از تو بد حاصل من ہم از کرم تو حل شد مشکل من (درد)
اسی آیت میں آگے صابرین کو جو بشارت دی گئی ہے اس کی تفصیل فرماتے ہیں: **اُولَئِكَ
عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّاُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ** یعنی "ان ہی لوگوں پر خاص خاص
رحمتیں ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے اور عام رحمت بھی ہے اور یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ اسی

لہ دعائے موسوی ہے۔ دیکھو مجمع الزوائد کتاب الادعیہ ص ۱۸۳ ج ۱۰ طبع مصر ۱۳۲۵ھ

سے تفریحاً لازم آتا ہے جو مصیبت و غم کے وقت غیر اللہ کو یاد کرتے ہیں، ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور ان ہی کو اپنا مددگار اور پناہ گاہ سمجھتے ہیں وہ نہ خاص رحمتوں کے لائق ہیں اور نہ عام رحمت کے مستحق اور نہ ہدایت کے قابل، یعنی درد و غم میں غیر اللہ کی طرف شکایت لے جانے والے، ان ہی کو اپنی جان و دل کی پناہ سمجھنے والے حق تعالیٰ کی نفیس کے لائق، غضب کے قابل اور ضلالت میں گرفتار ہیں! ذرا الفاظ کی نزاکت پر بھی غور کرو: **اُولَئِكَ** کے بعد ضمیر متصل لائی گئی ہے اور ہم المہتدین فرمایا گیا ہے، علماء و بیان کا اتفاق ہے کہ ضمیر جہاں ابتدا و خبر میں آتی ہے ابتدا کو خبر میں منحصر کر دیتی ہے۔ اب اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہدایت سے وہی لوگ غمقن ہیں جو وقت غم و ہنگام مصیبت حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں اور ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور جب ہدایت کا انحصار ان ہی پر ہوا تو ضلالت یا گمراہی ان کے غیر میں منحصر ہوئی! **ذٰلِكَ** ہواختصار ان المبین۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی پر غور کرو۔ جب ان پر مصائب کا نزول ہوتا (اور عجوبے اشد الناس بلاء الانبیاء مصائب ان ہی پر زیادہ نازل ہوتی ہیں) تو ان کا رخ حق تعالیٰ ہی کی طرف پلٹتا، ان کے ہاتھ حق تعالیٰ ہی کے سامنے پھیلتے، ان کا سر حق تعالیٰ ہی کے قدموں پر جھکتا تھا۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش سے واقف ہو کر انتہائی حزن و الم کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:-

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (پ ۹۶)

ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہمارے مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائیگا۔

یارب اگر از جہل خطا شد کارم جان از کرمست شاد بود بیارم
 ز امید تو بس کہ دل بود بیارم گویند کہ نیت از گنہ آزارم (درد)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کے جو روئے تم سے عاجز اور تنگ آ کر حق تعالیٰ ہی سے فریاد کیا کہ
اِنِّیْ مَخْلُوْبٌ فَاصْبِرْ (پ ۸۷) میں (زمانہ ہوں میرے پروردگار آپ انتقام لیجیے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تفکیر، عجز و در ماندگی کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کی اور
پکارا:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ
خَیْرِ فَفِیْئُوْ (پتلا ۶۷) اس کا ہاتھ بندھوں۔

غم ناکم و از در تو با غم نہ روم جز شاد و امیدوار و خرم نہ روم
از در گم بچو تو کیسے ہرگز نوید کسے نہ رفت و من ہم نہ روم (سرد)

اور حضرت ایوب علیہ السلام نے ہجوم غم و الم کے وقت حق تعالیٰ ہی کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور التجا کی۔
اِنِّیْ مُسْتَشِیْرٌ الصُّرُوْا نْتَ اَرْحَمُ مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں
السَّاحِمِیْنَ (پتلا ۶۷) سے زیادہ مہربان ہیں۔

یارب کریم تو گر نباشد دم خون جگر از دیدہ رود تا ابدم!
اور حضرت یونس علیہ السلام نے غم و اندوہ کی تاریکیوں میں حق تعالیٰ ہی کو پکارا کہ
لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ
كُنْتُ مِنَ الظَّٰلِمِیْنَ (پتلا ۶۷) میں، میں بیشک قصور وار ہوں !!

یارب ز کرم بخش تو قصیر مرا مقبول بکن نالہ شبگیر مرا
پیری و گناہ ماجراست عیب لطف تو کند چارہ تدبیر مرا (سرد)

اور حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے: فَلَوْلَا اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسٰبِقِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِ الْحِیْ اِلٰی یَوْمِ
یُبْعَثُوْنَ (پتلا ۹۷) یعنی اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی دھلی کے
پیٹ میں رہتے۔ دیکھو لبث کو لام تاکید سے موکہ فرمایا گیا ہے اور مناسبات نجات تسبیح الہی کو قرار دیا
گیا ہے کہ کسی نبی، ولی کے نام کا ختم پڑھنے، ان کو پکارنے اور اپنا درد و غم ان کے سامنے رکھنے کو!
قرآن کریم میں ایک جگہ (پتلا ۱۲) حق تعالیٰ ہیں جنتیوں کی حالت کی خبر دے رہے ہیں
کہ جب وہ عالم شہادت، عالم برزخ اور عالم حشر کی ہزاروں مصیبتوں اور بلاؤں، آفتوں اور

مشکلوں کو اٹھا کر بالآخر جنت میں داخل ہونگے تو کہیں گے: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدانا لهذا وَمَا كُنَّا
 لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدانا اللهُ۔ یعنی حق تعالیٰ ہماری ہدایت نہ کرتے تو اس مقامِ راحتِ ابدی
 تک ہماری رسائی کبھی نہ ہوتی! زندگی کے ہر قدم پر اور موت کے بعد ہر مرحلہ پر حق تعالیٰ ہی کا دست
 کرم ہماری تائید کرتا ہے اسی لیے نصیحت فرمائی: وَاعْتَصِمُوا بِاللهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَ
 نِعْمَ النَّصِيرُ (پ ۱۷، ۱۸) یعنی حق تعالیٰ ہی کو مضبوطا پکڑے رہو وہی تمہارے کارساز ہیں کیسے اچھے
 کارساز ہیں اور کیسے اچھے مددگار! اب انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف رخ کرنا بے شرمی نہیں تو کیا ہے!

اے آنکہ قبیلہ بنانِ روست ترا بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا
 دل درپے این دآن نیکوست ترا یک دل داری بس است یکدوست ترا (بانی)

قرآن کریم کی ان تمام تصریحات کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی
 طرف توجہ کرتے ہیں اور نہایت اختصار کے ساتھ چند دعاؤں کو پیش کر کے واضح کرتے ہیں کہ
 درد و رنج، غم و ہم، آفت و مصیبت کے وقت سولے حق تعالیٰ کے کسی کو یاد نہ کرنا چاہیے، ان
 ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور ان ہی کا نام زبان پر آنا چاہیے، اس کے بعد اتمثال امر میں
 اسبابِ دنیویہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز
 پڑھتے، چنانچہ مروی ہے: اذ احزننا من فرضنا الی الصلوة (راہ احمد) اور ظاہر ہے کہ نماز میں سولے وسیع و
 تمہیل، تحمید و تقدیس کے اور کیا ہوتا ہے۔ ترمذی میں ہے کہ آپ کو جب کوئی سخت کام پیش آتا تو فرماتا:
 یا حییٰ یا قیوم برحمتک استغیث اور دوسری حدیث میں ترمذی کی مذکور ہے کہ جب کسی امر کے متعلق
 فکر ہوتی تو آسمان کی طرف نظر کرتے اور کہتے: سبحان اللہ العظیم! جب دعائیں کوشش کرتے
 تو فرماتے: یا حییٰ یا قیوم۔ آپ نے فرمایا کہ غمگین کی دعا یہ ہے: اللہم رحمتک اربو افلا تکفی الی
 نفسی طرفہ عین واصلح لی شانی کلہ لا الہ الا انت۔ عیس کی صاحبزادی اسماء زوجہ حضرت
 عائشہ رضی اللہ عنہا تیری رحمت ہی کا آسرا ہے، تو مجھے بل بھر کہنے بھی میرے نفس کے حوالہ نہ کر اور میرے سکام درست کر دے

جسے سوا کرنا نہیں

عائشہ صدیقہؓ کی بہن بھتیجی کو فرمایا، کیا تجھے چند ایسی باتیں بتلا دوں جو غم کے وقت کہا کرے؟ کہہ لے
 اللہ ربی لا اشرك به شيئاً (سات بار) آپ نے ایک انصاری کو جن کا نام ابو امامہؓ تھا۔ غیر وقت
 نماز مسجد میں پکڑ کر پوچھا کہ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قرص کے بارے میں کچھ دبا جا رہا
 ہوں، متفکر اور پریشان ہوں۔ فرمایا صبح و شام اس دعا کو پڑھا کرو۔ اللھم انی اعوذ بک من الھمز والھز
 واعوذ بک من العجز والکسل واعوذ بک من الخین والبخل واعوذ بک من غلبۃ الدین وقصر
 للرجال۔ ایک مرتبہ فرمایا۔ من لزم الاستغفار جعل اللہ لہ من کل ہمز فرجا ومن کل ضیق محرجاً و
 رزقہ من حیث لا یحسب۔ یعنی جو ہمیشہ استغفار پڑھا کرے تو اللہ اس کی ہر مصیبت کو دفع کر دیتا
 ہے اور ہر تنگی سے اس کو نکال لیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان تک نہ ہو (رواہ
 احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ عن ابن عباس) ایک اور موقع پر فرمایا کہ جب کسی پر غم و مشکل ٹوٹ پڑے تو کہا
 کرے لا حول ولا قوۃ الا باللہ (کذا فی مشکوٰۃ)

دیکھو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ما اودی نبی ما اودیت یعنی جتنی اذیت مجھے
 پہنچی اتنی کسی نبی کو نہیں پہنچی مگر کیا کسی اذیت یا تکلیف کے وقت آپ نے کسی نبی کو یاد کیا کہ یا آدم
 ابو نوح، یا نوح، یسینا، یا ابراہیم، خلیل اللہ! یا ہر وقت اسی ذات پاک سے فریاد کی جو تمام مشکلات کو رفع
 کرتی ہے جو قاریج ہم ہے، کاشفت غم ہے، جو مجیب دعوة المضطربین ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو آپ نے
 تعلیم فرمائی تھی کہ یا غلام احفظ اللہ یحفظک احفظ اللہ تجدد تجاہک، واذا سالت فاستقل
 اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ واعلم ان الامۃ لو اجتمعت علی ان ینفعوک بشئ لم
 ینفعوک الا بشئ وکتب اللہ لک ولو اجتمعوا علی ان یضرک بشئ لم یضرک الا بشئ و قد
 کتب اللہ علیک رفعت الاقلام وجفت الصحف (اخرجہ الترمذی عن ابن عباس) یعنی
 اے اللہ کے اللہ کو یاد رکھو وہ تجھ کو یاد رکھیگا۔ اللہ کو یاد رکھو کہ تو اس کو اپنے سامنے پائیگا اور جب تو کچھ

لے یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ مصیبت زدہ یہ دعا پڑھے، اللھم فارج الھمز کاشفت العزم و مجیب دعوس
 المضطربین، رحمن الدنیا و رحیمہا، انت تو رحمنی، فادجنی برحمتہ تغنینی بجماعتی من سواک
 (رواہ النخاعی عن ابن عمر و یہ عن ابی بکر صدیقؓ)

لنگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے چاہ (ایاک نعبد وایاک نستعین) اور یقین کر لے کہ اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے فائدہ پہنچائیں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائینگے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا، اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی تو اس پر قدرت نہ پائینگے، قلم اٹھالیے گئے اور خشک ہو گئیں کتابیں، دیکھو اس حدیث میں کس وضاحت و صراحت کے ساتھ استثنائت عن غیر اللہ سے منع کیا گیا ہے اور کس طرح سمجھوں سے تو ذکر صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑا گیا ہے! کفی باللہ وکیلا!

از خدا خواہم و ز غیر نخواہم جدا کہ نیم بندہ دیگر نہ خدا کے درگست! یہ کہہ کر کہ ساری دنیا تجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتی (کیونکہ وہ ایک مکھی کی تخلیق پر بھی قادر نہیں) احتیاج کی ساری نسبتوں کو جو غیر اللہ کے ساتھ قائم کی جاسکتی ہیں ایک ہی ضرب میں کاٹ دیا گیا ہے اور پھر یہ سنا کر کہ ساری دنیا تجھے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں (کیونکہ وہ مکھی سے بھی کوئی شے نہیں نہیں سکتی) غیر اللہ کے خوف کو سینے سے بالکل دور کر دیا گیا ہے اور اس طرح ہمیں خوف و حزن کی ان زنجیروں سے بالکل آزاد کر دیا گیا ہے جو غیر اللہ ہمارے جہل و شرک کی وجہ سے ہماری گردن میں ڈال سکتا تھا! اب میں توحید ہی کی بدولت آزادی و جرات کے ساتھ باواز بلند کہہ سکتا ہوں:

لوالثقلان الاثنان اجمعوا یویدون ایلاما لا صغر منسلة

یکون لها رب السموات ناصرا لما ظفروا منها بآدنی مضرة

کیا یہ آزادی بے خوفی یا استقلال ان مشرک پسندیت پرستوں یا گور پرستوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع و ضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت کو جوڑتے ہیں، ان ہی کے آگے سر نیاز خم کرتے ہیں اور ان ہی کے سامنے دست سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسول کی

لے اگر جن دو اثنان دونوں جمع ہو کر چھوٹی سی چھوٹی چوٹی کو دکھ پہنچانا چاہیں اور حق تعالیٰ اس کے نامزد و نگار ہوں تو وہ اس کو آدنی مضرت ہی نہیں پہنچا سکتے۔

اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ

یسال احد کورب حاجتہ کلھا حتی ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار

یسال الملئوحتی یسالہ مشع ہی سے مانگے یہاں تک کہ ٹکس بھی اسی سے مانگے

نعلہ اذا انقطع (بخاری الترمذی عن انس) اور جتنی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہیں افسوس ہے کہ قادر یہ کی ایک بڑی

تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے۔ مصائب میں ان ہی کو پکارتی ہے، آفات کے دور کوٹنے کے لیے

ان ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے (حدیث ابن عباسؓ کو جو اذہر مذکور ہوئی اپنی فتوح

الغیب میں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ: فینبئ لکل مؤمن ان یجعل ہذا

الحدیث مرآة لقلبہ و متعادہ و دثارہ و حدیثہ فیعمل بہ فی جمیع حرکاتہ و سکنا تہ حتی یسلم فی

الدنیا و الاخرۃ و یجد العزۃ فیہما برحمۃ اللہ تعالیٰ۔ یعنی ہر مؤمن کو چاہیے کہ اس حدیث نبوی کو

اپنے قلب کے لیے آئینہ بنالے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خوبی و

زشتی راستی و کجی کو معلوم کرے، بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر اور باہر کا جامہ بنالے اور ہر وقت کے

لیے اس کو ایک سخن و حکایت ٹھہرائے کہ اپنے دل سے اس کی تکرار کرتا ہے اور اپنے تمام حرکات و

سکنا ت میں اس پر عمل کرے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات نفسی و آفاقی سے محفوظ رہے اور

اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے۔

شیخ بیہقی توحید کے آفتاب تھے، آپ کی کتاب مستطاب "فتوح الغیب" کی ہر سطر سے توحید

کی تعلیم مترشح ہوتی ہے اور سلسلہ عالیہ قادریہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے الفاظ میں "اتباع کتاب و

سنت و اجتناب از وقوع در جہادی بدعت" کے سوا کچھ نہیں! اسی لیے محدث دہلویؒ آگے چل کر

فرماتے ہیں: "پیرا فرمود کہ در سلاسل دیگر از چیزاے دیگر پر سندا داریں سلسلہ از شریعت ز شمار

کہ تا شریعت مطہرہ شکایت نہ کندا لئو!"

۱۔ فتوح الغیب مترجمہ شاہ عبدالحق دہلویؒ ص ۲۵۰۔

اشراک فی العلم | مشرکین کی "عبادت" کے پہلے جزو سے ہم نے صفحات بالا میں تفصیل سے بحث کی کہ یہ غیر اللہ کو مقرب و شفیع، نافع و ضار جان کر ان سے اپنی حاجت کے وقت فریاد ہی چاہتے تھے، یعنی ان کو پکارتے یا استعاثہ کرتے تھے، یہی ان کا شرک تھا "اشراک فی التصرف" تھا، اگر ان ہی افعال کا ارتکاب کسی کلمہ گو سے ہو تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کی کلمہ گوئی اطلاق شرک سے مانع نہ ہوگی۔ دیکھو اس "اشراک فی التصرف" میں "اشراک فی العلم" بھی لازماً شامل ہوتا ہے۔ درد و مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارتے والا نہ صرف یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس درد و غم کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں بلکہ اس کا قطعی یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے اس استغاثہ اور پکار کو ہر وقت اور ہر جگہ سے سن بھی سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر سے اور بغیر مطلع ہوتے وہ اس کی مدد کر کیسے سکتے ہیں؟ اس طرح وہ غیر اللہ کے لیے علم غیب بھی ثابت کرتا ہے، حالانکہ علم غیب خصائصِ الہیہ سے ہے اور غیر اللہ سے قطعاً مسلوب! یہی اس کا اشراک فی العلم ہے! اور اس سے زیادہ ضلالت اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے! **وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ (پارا ۱)** "اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارتے جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کیسے اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو"

یہ امر کہ علم غیب خاصہ حق سبحانہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو نہیں، قرآن مبین میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں پہلے چند اجمالی آیات پر غور کرو۔

وَاللَّهُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ
الْبَرِّ يُوجِبُ الْأَمْرَ كُلَّهُ (پارا ۱) علم خدا ہی کو ہے اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہونگے۔

۱۔ مختصر لفظوں میں غیب کی حقیقت سمجھ لو۔ قاضی بیضاوی کہتے ہیں کہ غیب وہ امر ہے جس پر عقلی دلیل قائم ہو سکتی ہے۔ وہ بدیہی ہونہ جو اس کی رسائی اس تک ہو۔ (تفسیر انوار التنزیل)

اسی مفہوم کو نفاً اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَ

الْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا يَشْعُرُونَ

أَيَّانَ يَبْعَثُونَ (پ ۱۶) ان کو یہ خبر نہیں کہ کب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔

(۲) لَمْ يَغْيِبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

الْبَصِيرَ وَأَسْمِعَ رِشْدًا (۱۷) دیکھنے والا اور کیسا کچھ سننے والا ہے۔

(۳) فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ (پ ۱۶) آپ فرمادیں گے کہ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں غیر اللہ سے علم غیب کی مطلق نفی کی جا رہی ہے۔

(۴) وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا

إِلَّا هُوَ (پ ۱۳) اور اللہ ہی کے پاس کنجیاں ہیں تمام غیبی اشیاء کی، نہیں جانتا ہر انہیں لیکن وہی۔

خود آنحضرت صلعم نے غیب کی کنجیوں کی تفسیر ان پانچ چیزوں سے فرمائی جن کا ذکر صراحت سے سورہ لقمان میں آیا ہے :-

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنزِلُ

الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا

تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا

تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ (پ ۱۳)

ان اللہ سے کیا خبر ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ بیشک اللہ سب باتوں کا جاننے والا باخبر ہے۔

جتنے حوادث کو نیا اور واقع غیبیہ ہیں سب ان پانچ میں داخل ہیں (۱) حوادث سماویہ کو انزال

غیث میں شامل کیا جاسکتا ہے جس کا تعلق آسمان سے ہے (۲) حوادث ارضی "علم ما فی الارحام" میں

داخل ہیں اور (۳) حوادث حیات کا تعلق لازماً "ما اذا تکتب غدا سے ہوگا اور (۴) حوادث

موت و ابعد موت ظاہر ہے کہ "ما تدری نفس بائی ارض تموت" میں شامل ہیں۔ جب ان تمام حوادث

و امور غیبیہ کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے اور کسی فرد بشر کو عطا نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ کسی حادثہ غیب کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا اور جب (۵) علم قیامت (یعنی اس کے خاص وقت وقوع کا علم) کسی نبی کو نہیں حالانکہ سب اس کی خبر دینے میں متفق ہیں۔ تو اور حوادثِ آتیہ کا علم بدرجہ اولیٰ ان کو نہ ہوگا۔ غرض جب ان پانچ کا علم کسی کو نہ ہوا تو اور چیزوں کا علم بدرجہ اولیٰ نہ ہوا، اسی لیے ان کو مفارح غیب کہا گیا ہے، گویا جملہ امور غیبیہ ان کے اندر ہیں اور یہ تمام خزائن غیب کی کنجیاں ہیں اور جب خزانہ کی کنجی ہی کسی کو نہ ملے تو اس میں سے ایک جیب بھی نہیں مل سکتا۔

(۵) وَلَا أَقُولُ لَكَ عِنْدِيَ خَزَائِنُ
اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ
إِنِّي مَلَكَ (پ ۳ ع ۳)

اور میرے تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے تمام خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔

(۶) قُلْ لَا أَمْرًا لِي بِعَيْنِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا
إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ
الْغَيْبَ لَاسْتَكْتَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ
وَمَا مَسَّنِيَ الشُّوْءُ إِن أَنَا إِلَّا
نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ
(پ ۳ ع ۲۳)

آپ کہہ دیجیے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی جتنا کہ خدا تعالیٰ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مصرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی، میں تو محض بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

یعنی میں ایک بندہ ناتواں ہوں اپنے لیے جلبِ نفع و دفعِ ضرر کی قوت نہیں رکھتا مگر جو میرا مالک چاہے نفع و دفع سے، پھر اس بیان کو اس طرح موکد کیا جا رہا ہے کہ اگر میں غیب کو جانتا تو جو بات بھلائی اور نفع کی ہوتی اس کو اپنے لیے حاصل کرتا اور جو بات بُری اور نقصان کی ہوتی اس سے دور رہتا تا کہ وہ بُرائی مجھے نہ لگے لیکن میں تو ایک بندہ عاجز ہوں، میں کیا جانوں کہ میرے رب میرے مالک کے علم میں میرے لیے اچھا کیا ہو اور بُرا کیا، میرے حق میں اس کا حکم کیا ہو اور کوئی

چیز میرے لیے مقدر کر رکھی ہے، جب مجھے اتنا بھی معلوم نہیں تو پھر کسی اور بات کا معلوم ہونا کیسا! یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تواضع و ادب نہیں فرما رہے ہیں بلکہ بطریق اعتقادِ قلبی پیش فرما رہے ہیں کیونکہ علم غیب حق تعالیٰ ہی کی خصوصیتِ خاصہ ہے **عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا** (۱۲۷) سے صاف طور پر اس کی وضاحت ہو رہی ہے اور اوپر جو آیات پیش کی گئیں وہ اس کی تائید کر رہی ہیں، ہر قسم کے اشتباہ و مغالطہ کو رفع کر رہی ہیں۔

اب سب سے معجزات تو جیسے ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں تصریح کر دی ہے وہ مخصوص ہیں اس قضیہ عمومی سے **الْأَمِنَ اَرْضَىٰ مِنْ رَسُوْلِ (پہلے ۱۲۷)** یعنی جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کسی نبی یا رسول کو بذریعہ وحی کسی غیب پر مطلع کر دیتے ہیں انبیاء سے علم غیب کی نفی عقائد اسلام میں داخل ہے اور کافہ اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے۔ یہ عقائد خود انبیاء علیہم السلام کے تعلیم کردہ ہیں۔ لہذا انبیاء سے علم غیب کی نفی کرنے میں ان کی کسی طرح تحقیر نہیں ہوتی، ایسا سمجھنے والا مجنون ہے، کتاب سنت سے جاہل دیکھو سورہ نمل میں حق تعالیٰ ہدہ کا قول نقل فرما رہے ہیں **اِحْطٰتْ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ** یعنی ہدہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ "میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی" اس آیت کو سن کر کوئی ہدہ کا بچہ بھی ایسی ہو قوتی نہ کرے گا کہ انبیاء و اولیاء کو علم غیب سے متصف سمجھ کر دور دور سے استعانت کے لیے پکارے اور سمجھے کہ وہ اس کے پکارنے کو سن لیتے ہیں، آدمی کے بچے کا تو کیا ذکر ہے!

اب ذرا چند ان حدیثوں کو بھی سن لو جن سے غیر اللہ سے علم غیب کی کلی نفی ہوتی ہے اور حق تعالیٰ ہی سے یہ محقق کیا جاتا ہے۔

(۱) **وَاللّٰهُ لَا اَدْرِیْ وَاللّٰهُ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا** یہی باوجودیکہ میں خدا کا نبی ہوں پھر نہیں جانتا کہ میرے ساتھ

رسول اللہ ما یفعل بی ولا ینکر کیا معاملہ میں آئے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ میں آئے۔

(۲) **عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَىٰ عَنْهَا قَالَتْ مَنْ** حضور عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ جو مجھ سے یہ کہے کہ

اٰخِبْرِكْ اَنْ مَّهْرًا صَلَّىٰ اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْلَمُ آنحضرت وہ پانچ باتیں جانتے تھے جن کا اللہ نے

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علم عطا کیا۔

انہیں التی قال اللہ تعالیٰ ان اللہ عنده ذکر کیا ہو اور سورہ لقمان میں تو اس نے بڑا
علم الساعۃ فقد اعظم الفریۃ طوفان باندھا۔

رس عن الربیع بنت معوذ بن عفراء قالت ربيع بنت معوذ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے
جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فدخل مکان میں تشریف لائے جب میری شادی ہو رہی تھی
حین بنی علی فجلس علی فراشی بجلسک پھر میرے پاس مندر پر بیٹھ گئے۔ ہماری کچھ لڑکیاں
منی فجعلت جوہریات لنا یضربن بالثکھانے لگیں دت بجا کر اور ہمارے ان بزرگوں کا ذکر
ویندن من قتل من ابائی یوم بدر کر نے لگیں جو بدر میں مارے گئے تھے۔ ان میں سے
اذ قالت احدھن وفینا نبی یعلم ما ایک کہنے لگی کہ ہم میں ایک ایسا نبی ہو جو جانتا ہے کہ
فی غدی فقال دعی ہذا وقولی باللہ کل کیا ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا مت کہہ بلکہ جو
کنت تقولین پہلے کہہ رہی تھی وہی کہے جا

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات بزرگترین اور کامل ترین مستی اپنی ذات مقدس سے علم
غیب کی نفی فرما رہی ہے، پھر آپ کی امت سے کسی کی یہ مجال کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ علم غیب کو اپنی جانب نسبت
کے امور غیبیہ کا علم بذاتہ کسی انسان کو حاصل نہیں وہ مخصوص بحق تعالیٰ ہی کی ذات کے لیے انما الغیب
للہ کوئی شخص خواہ وہ نبی ہو یا ولی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ خود وہ کل کیا کرے گا: **وَمَنْ ذَرَفِي فَنَسَّ مَا ذَاكَ كَسِبَ عَذَابًا**
حدیث اول کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مناقض ہے آیت کریمہ **لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ**
مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ کے اور نیز منافی اس آیت کے **وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ**۔ اس لیے یہ
حدیث منسوخ ہے اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کا ایسا فرمانا محض خوف و خشیت الہی
کے لحاظ سے تھا نہ کہ واقعہ کے لحاظ سے۔

طیبی نے اس حدیث کی تشریح میں بتلایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد
اس قول سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات سے علم غیب کی نفی فرمانا چاہتے ہیں اور صاف
طور پر ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ ہرگز غیب پر مطلع نہیں، نہ اپنی تقدیر سے واقف ہیں نہ کسی

لے بخاری ص ۱۰ بخاری۔

اور کی تقدیر سے، اپنے پوشیدہ کاموں سے واقف ہیں نہ غیر کے۔ آپ کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی نجات کا بھی یقین نہیں رکھتے اس لیے کہ یہ امر تو بہت ساری دوسری حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے اور آیات قرآنیہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ لہذا اس حدیث کو کسی آیت کا معارض قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ بلا احتمال نسخ وہ بھی دو وجوہ سے درست نہیں: (۱) نسخ کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ تاخرناسخ کا معلوم نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہاں تقدم حدیث کا اور تاخر آیت کا معلوم نہیں (۲) نسخ "احکام" میں جاری ہوتا ہے "اخبار" میں جاری نہیں ہوتا، اخبار میں نسخ کا حکم لگانا گویا شارع پر کذب کی تہمت لگانی ہے۔

دوسری حدیث تو آیت قرآنی ہی کی ترجمان ہے اس کا انکار قرآن میں کا انکار ہے۔ یہاں حجت یہ تراشی جاتی ہے کہ علم غیب کے اقسام میں امتیاز کیا جانا چاہیے۔ ایک علم غیب مطلق ہے دوسرے علم غیب اضافی غیب مطلق یا غیب حقیقی کا تو علم حق تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے لیکن غیب اضافی کے علم کی نسبت انبیاء و اولیاء کی طرف کی جاسکتی ہے۔

دیکھو غیب اضافی کے معنی تو یہی ہوئے کہ بعض پر ظاہر ہوتا ہے اور بعض پر پوشیدہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر لذت جماع کو لویہ رجولیت والے پر غیب نہیں، نامرد یا عین کے لیے غیب ہے یا رنگوں پر غور کرنا، یہ مادر زاد اندھے کے لیے غیب ہیں لیکن آنکھوں والے کے لیے غیب نہیں یہی حال آوازوں کا ہے، سننے والے کے لیے یہ غیب نہیں مادر زاد بہرے کے لیے ضرور غیب ہے۔ اسی طرح حیدرآباد کا حال حیدرآباد والوں پر غیب نہیں، یریلی والوں کے لیے غیب ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیب اضافی کے جاننے میں کچھ اولیاء و انبیاء کی تخصیص نہیں۔ لذت جماع جو عین کے لیے غیب ہے اس کو بہر مرد خواہ وہ کافر ہو یا مومن جانتا ہے، اسی طرح آوازوں کو ہر کان والا خواہ وہ نیک ہو یا بد جانتا ہے اور یہ مادر زاد بہرے کے لیے غیب ہیں۔ انبیاء و اولیاء کو جو قانع یا حواش حق تعالیٰ پذیر و محی و الہام تبار دیتے ہیں وہ ضرور ان کو معلوم ہو جاتے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے بغیر خبر

لہ دیکھو تقریریں جام ج ۳ ص ۵۵ مطبوعہ مکتبہ المدینہ

دینے کے یہ ہرگز معلوم نہیں ہو سکتے اور حق تعالیٰ نے اس بات کی خبر نہیں دی کہ زمین و آسمان میں جتنے حوادث و واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، ان کی اطلاع کسی نبی یا ولی کو اس نے سے رکھی ہے۔ لہذا ان کے علم کا دعویٰ کسی نبی یا ولی کے لیے کرنا محض بے دلیل ہے اور آیات قرآنیہ کا صریح انکار اور اس امر کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اخبار بالوحی میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، شیطان کے تصرف سے یہ قطعاً محفوظ ہے، لیکن الہام میں عصمت شرط نہیں، الہام کبھی شیطانی ہوتا ہے اور کبھی رحمانی۔ اس لیے اولیا و کرام الہام پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتے جب تک کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو۔

تیسری حدیث کی تاویل میں مرضیاتی ذہنیت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں جمیع علوم موجود ہیں اور ان سب کا علم رسول کو ہونا ضروری ہے ورنہ جہل لازم آئیگا اور جہل منافی شانِ رسول ہے! یہاں ایک کھلا مغالطہ ہے۔ قرآن میں جمیع علوم کے موجود ہونے سے مراد جمیع علوم دنیویہ کے سوا کچھ نہیں، ان علوم کا تعلق سعادتِ انسانی سے ہوتا ہے جس کے حصول کا انسان مکلف ہے۔ قرآن کریم میں نہ ملائکہ کی جملہ تعداد موجود ہے نہ ذراتِ زمین کے اعداد اور نہ نجوم کی گنتی۔ نہ انجیرنگ کی تفصیلات اور نہ حیوانات، مصربات کی کلی توضیحات! نہ ان چیزوں کا کتابِ الہی میں ہونا ضروری ہے اور نہ ہم ان کی تحصیل پر مامور ہیں اور نہ رسول پر ان کی تبلیغ ضروری اور نہ ان سے جہل منافی شانِ رسول! خود حق تعالیٰ نے اس امر کی توضیح کر دی ہے کہ بہت سی باتوں کا ہم نے قرآن میں ذکر نہیں کیا۔ مثلاً، وَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (پہر ۱۳۷) یعنی بہت سے رسولوں کا ذکر ہم نے کیا ہے اور بہتوں کا ذکر نہیں کیا!

بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ کہنا کہ دعیٰ ہذا و فوئی بالذی کنت

لہ ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے تھے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

تقولین محض اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو ان لڑکیوں کی باتوں کے سُننے کا اشتیاق تھا جو وہ شہداء بدر کے متعلق کہہ رہی تھیں، علم غیب کا انکار کرنا مقصود نہ تھا۔

اس توجیہ میں بالکل اسی قسم کی ہوشمندی و ذہانت سے کام لیا گیا ہے جو ہمیں اس اہمق میں ملتی ہے جن کی ٹانگ میں تیر لگا تھا اور خون بہہ رہا تھا وہ اور اس کی عورت دونوں خون پونچھ رہے تھے اور اہمق عقل کا دشمن برابر کے جا رہا تھا کہ خدا کرے تیر لگا ہوا حضور انور صلعم تو ان لڑکیوں کی اتنی بات سن کر کہ ہم میں ایک نبی ایسا ہے جو کل کی بات جانتا ہے فرماتے ہیں کہ یہ بات چھوڑ دو اور اپنا پہلا قصہ جاری رکھو اور اس کی تاویل یوں کی جا رہی ہے کہ علم غیب کا انکار مقصود نہیں! "کل کی بات جاننے کی" نفی تو قضیہ کلیہ کے طور پر خود قرآن مبین میں حق تعالیٰ فرما رہے ہیں: وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّا ذَاتُكَ كَتَبَتْ غَدًا یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کریگا! اب اس صریح تردید کے بعد تاویل کا کونسا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ ۶ ہشمار کہ رہ خود بخود گم نہ گئی!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال کی تصدیق ان احوال و واقعات سے بھی کر لو جو آپ کی زندگی میں رونما ہوئے۔ ان میں سے صرف تین کا ذکر یہاں کافی ہوگا۔

(۱) واقعہ افک: آپ کی محبوبہ عاتشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر لوگوں نے ہمت لگائی آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے اس کی تحقیق و تفتیش فرمائی، اکابر صحابہ سے مشورے کیے، لیکن حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا، آپ کے غم و حزن میں اضافہ ہوا اور عین دن ایسی حال میں گزر گئے کہ بالآخر حق تعالیٰ ہی نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا کہ عاتشہ صدیقہ اس ہمت سے پاک ہیں۔

(۲) واقعہ یدیمعونہ: اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور انور صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ چند لوگ میرے ساتھ کریں جو میری قوم کو دین کی تبلیغ کریں اگر وہ حلقہ گوشت اسلام ہو جائیں تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا۔ آپ نے اس کی بات کو صحیح جان کر ستر صحابہ حبیب القدر اس کے ہمراہ کر لیے۔ راستہ ہی میں اس غدار کی بیوفائی قوم نے ان بزرگوں کو شہید کر دیا، جب حضور اکرم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ کو نہایت رنج

ہوا، اور ایک جینے تک قاتلین کے حق میں صبح کی نماز میں آپ نے بددعا فرمائی!

(۳) سورہ تھنیر کی شان نزول۔ حضور انور کو شہد نہایت مرغوب تھا، آپ حضرت زینبؓ کے ہاں تشریف لیا کر شہد لوش فرماتے تھے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہیے کہ آپ کا حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ ٹھہرنا کم ہو جائے سو حج پجار کے بعد بات یہ ٹھہری کہ ہم میں سے جس کے پاس پہلے آپ کی تشریف آوری ہو وہ آپ سے کہے کہ آپ کے منہ سے تو مغافیر کی بو آتی ہے۔ آپ کے قلب مبارک میں یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ جو شہد آپ لوش فرماتے ہیں شاید ان کھیلوں کا ہو جو مغافیر پر بیٹھی ہوں۔ چونکہ بد کو سے آپ کو نفرت ہے اس لیے شہد پنا ترک فرما دیجئے اور اس طرح حضرت زینبؓ کے پاس کی نشست کم ہو جائیگی۔ ان بیویوں کی یہ بات چل گئی اور حضور انور نے قسم کھائی کہ اب شہد کبھی نہ پوچھا جائے۔

جس بات کی قرآن مبین نے صاف صریح الفاظ میں وضاحت کی، جس بات کو رسول اکرم صلعم نے خوب کھول کر بیان کیا، جس بات کی تائید آپ کی زندگی کے مختلف و متعدد واقعات سے ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ ہی عالم غیب ہیں ان کے سوا مخلوقات میں کوئی ہستی عالم غیب نہیں، ان ہی کے علم عطا فرمانے پر انبیاء و اولیاء کو غیب کے بعض واقعات کا علم ہوتا ہے، یہ ان کی اختیاری چیز نہیں کہ جب چاہا معلوم کر لیا، یہ حق تعالیٰ ہی کا اختیار ہی فعل ہے کہ جب چاہا اور جتنا چاہا کسی نبی و رسول کو بذریعہ وحی غیب پر مطلع کر دیا، اسی بات کو حضرت سعدیؒ نے اپنے مشہور

اشعار میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ میں اس طرح ادا کر دیا ہے۔

نیکے پر سید زان گم کردہ فرزند	کہے روشن گہر پیر خرد مند
زمصرش بوئے پیرا ہن شمیمی	چو در چاہ کنعانش ندیدی
بگفتا حال من برق جہاں است	دے پیدا و دیگر دم نہاں است
گئے بر طارم اعلیٰ الشیم	گئے بر نشیت پلے خود نہ بیم
اگر درویش بر حالے باندے	دو دست از ہر دو عالم بر فاندے

لے یہ نینوں واقعات صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔

اشراک فی التصرف اور اشراک فی العلم کو اچھی طرح سمجھ جانے کے بعد اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نداء و صدا کی بندرجہ ذیل تمام صورتیں قطعاً ناجائز اور حرام قرار پاتی ہیں کیونکہ یہ کفر و شرک تک پہنچا دیتی ہیں۔

(۱) درد و مصیبت کے وقت اولیاء اللہ کو اس عقیدہ سے بکارنا کہ یہ ہر جگہ سے ہماری نمائندے درد کو سن لیتے ہیں اور ہماری اعانت کر سکتے ہیں، یہ قطعاً اشراک فی العلم و اشراک فی التصرف ہے۔ تمام فقہانے اس کی تکفیر کی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی سے اس کا تفصیلی ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے۔

(۲) اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر ان کو پکارنا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: (ا) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میری فریاد کو سنیے، میری بلا کو ٹال دیجیے، میری حاجت کو رو کیجیے" یہ استغاثہ و استعانت دعا اور طلب حاجت ہے خواہ قریب سے کی جائے یا دور سے اور یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ دعا کی تفصیل میں اوپر اس کا ثبوت دیا جا چکا ہے۔ (ب) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میرے لیے دعا کیجیے کہ اللہ میری بلا کو ٹال لے اور میری حاجت کو رو کرے" یہ قطعاً بدعت ہے، قرون مشہود لہما بانجیر میں کسی نے ایسا نہیں کیا۔

امام ابو حنیفہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صاحبین کی قبروں پر آ کر کہتا ہے کہ "ہل لکم من خبرو هل عندکم من الثوابی ایتکو و نادیتکم من شہور و لیس سوالی منکم الا الدعاء فهل دریتم اور غفلتم لے اہل قبور کچھ تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کسی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا ہوں؟ میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لیے دعا کرو، کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم غافل ہو میرے حال سے؟" یہ سن کر امام عظیم نے اس شخص سے پوچھا "ہل اجابوا لک؟" کہا انہوں نے "نہیں" آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا "سخطاک و تزیت یدک، کیف تکلم اجساد الایستطیعون جواباً ولا یملکون شیئاً ولا یسمعون صوتاً" یعنی "پٹھکار ہو کچھ پراخاک آلود ہوں تیرے دونوں ہاتھ! بے جسم کیسے بات کر سکتے ہیں جو

جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جو کسی شے کے مالک نہیں، جو کوئی آواز بھی نہیں سن سکتے! پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: **وَمَا آتَتْ بِمِثْمَعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ** یعنی حق تعالیٰ حضور انور صلعم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں "آپ ان لوگوں کو جو قبر میں ہیں کچھ نہیں سنا سکتے"۔

امام اعظم کے اس عتاب سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہو رہی ہے:-

(۱) اولیاء و صالحین کی قبروں پر اگر ان سے خطاب کسی طرح جائز نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو بد دعا دی ہے جو اہل قبور سے دعا کے طالب ہوتے ہیں! اگر آپ کو ان جہال کا حال معلوم ہوتا جو اہل قبور سے رزق، صحت و اولاد مانگتے ہیں اور ان کو مستقل یا غیر مستقل طور پر قادر جانتے ہیں تو یقیناً ان کو کافر و مشرک و ملعون قرار دیتے اور گردن مارنے کا حکم دیتے!

(۲) مرے نہ سن سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ پھر بلاؤں کا مالنا، مصیبتوں کا دور کرنا ان سے کیا ہو سکتا ہے! اور جب یہ نزدیک سے سن نہیں سکتے تو دور کی کب سنیگے؟ محققین حنفیہ سماع موتی کے قائل نہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگان بدر سے جو خطاب فرمایا تھا اس کی توجیہ مختلف طریقوں سے کی گئی۔ بہترین توجیہ یہ ہے کہ:-

یہ آپ کا معجزہ تھا حق تعالیٰ نے آپ کی بات کفار موتی کو سنا دی تھی، چنانچہ کفایہ میں ہے **وَمِنْ اجْوِبَتِهِمْ اَنْهُ لَوْ سَمِعَ فِذَاكَ مِعْجَزَةَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانِي شَرْحِ وَاقِي هِي حُرَّتْ كِي گئی ہو کہ وللمقصود من الكلام الافهام وذا بالاسماع وذا لا يتحقق بعد الموت یعنی مقصود کلام سے افہام ہے اور یہ سماع کے ذریعہ ہوتا ہے اور سماع موت کے بعد محقق نہیں" اسی طرح عینی شرح ہدایہ میں: **قوله لان المقصود من الكلام الافهام اي افهامه فلا تا والموت ينافي اي ينافي الكلام الاسماع والميت ليس باهل السماع الا تزي الى قوله تعالى انك لا تسمع الموتى والى قوله تعالى وما انت بمسمع من في القبور۔****

شرح مواقف میں تشریح کی گئی ہے کہ علم و قدرت و ارادہ، سمع بصر میت کے لیے ثابت

لہ غرائب فی تحقیق الذائب ۱۱۰ شرح مواقف تذیل فی ذکر فرق بعد موقف سادس ص ۵۰، مطبوعہ نول کشور۔

کرنا فرقہ صاحبیہ کا عقیدہ ہے جو معتزلہ کا ایک گروہ ہے۔ الصالحیہ اصحاب الصالحی وذلہم انہم
جو ذواقیام العلم والقدرة والادارة والسمع والبصر بالمیت ویلزمہم جواز ان یکون الناس
مع اتصافہم بھذا الصفات امواتا وان لا یکون الباری تعالیٰ حیاً یعنی صاحبیہ گروہ ہے
صالحی کلاور مذہب ان کا یہ ہے کہ انہوں نے میت کے لیے علم و قدرت و ارادہ و سمع و بصر کو جائز
قرار دیا ہے، ان کے مذہب کی رو سے تو یہ لازم آتا ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں وہ
سب مردہ ہیں اور حق تعالیٰ بھی زندہ نہیں! اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر گورپرست
مشائخ اسی فرقہ رضالہ کے عقیدہ پر قائم ہیں لغوذا بشدن ذلک۔

غرض جب مردے سن نہیں سکتے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے کافروں کی تشبیہ عدم
سمع میں مردوں سے دی اور اثبات سمع عقیدہ ہے صالحیہ مفسدین کا جو معتزلہ کا گروہ ہے تو پھر قبروں
کے پاس جا کر مردوں کو پکارنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بے عقل
پتھر کو پکارے اور اس سے دعا کی خواہش کرے! یہ عمل کسی پاگل سے تو صادر ہو سکتا ہے عقل و
ہوشمند سے کیسے ممکن ہے؟ عموماً ایسے ہی پاگل مردوں کو قبروں میں نہ صرف زندہ اور توانا سمجھتے
ہیں بلکہ ان کو حق تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع اور مقرب بھی جانتے ہیں، اسی لیے وہ ان کی عبادت
کرتے ہیں یعنی ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان کی قبروں کو بوسہ دیتے ہیں
اور ان کا طواف بھی کرتے ہیں اور کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں! اذکٰ ہوا الخسران للہین!
یہاں غلط فہمی رفع کرنے کے لیے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو شخص حضور انور صلی اللہ
علیہ وسلم پر دوسے درود بھیجتا ہے اس کو آپ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، آپ اس کو نہیں سنتے
البتہ بزرگان دین اور محققین شرع متین نے اس امر کی تصریح کی ہے اور روایات مرفوعہ میں
بھی یہ امر مذکور ہے کہ جو شخص آپ کے مزار مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے اس کو آپ بخوبی سنتے
ہیں چنانچہ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی نے شعب الایمان میں ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ قال رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعتہ من صلی علی فایا ابلغتہ یعنی جو درود

لہ مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصل ثالث۔

بھیجتا ہے میری قبر کے نزدیک اس کو میں خود سنتا ہوں اور جو درود بھیجتا ہے مجھ پر دور سے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ یعنی بذریعہ ملائکہ اور میں خود براہ راست نہیں سنتا، ورنہ پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی جیسا کہ قبر کے پاس کے درود کے متعلق پہنچانے کا ذکر نہیں کیا!

اسی طرح ابن حجر کی نے شرح ہمزیمین ذکر فرمایا ہے: إذا صلى وسلم عليه عند قبره سمعه

سمعتاً حقیقیّاً ویرد علیہ من غیر واسطۃ وان صلی وسلم علیہ من بعد لا یسمعه الا بواسطۃ پدل علیہ احادیث کثیرة "یعنی جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو حقیقت میں سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اس کا بلا واسطہ، اور اگر کوئی دور سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو ہمیں سنتے مگر بواسطہ (یعنی فرشتے آپ تک پہنچاتے ہیں) بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

اس چیز کی شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح مشکوٰۃ میں یوں تصریح کی ہے: سخن دراز ماند کہ این فضیلت رد سلام از آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص بزازان قبر شریف اوست صلی اللہ علیہ وسلم مثل داخل در مجلس کہ سلام گوید یا عام است بر ہر کسے را کہ سلام فرستد چنانکہ در شہد و غیر آن، و ظاہر ہمین است الا آنکہ سلام بزازان بنفس شریف خود بے واسطہ سماع فرماید در و سلام نمایند و دیگران بواسطہ ملائکہ سیاحین بود

خوب سمجھ لو کہ یہ امر یعنی رو و بلوغ سلام وغیرہ روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے آیا ہے، باقی ہے اور انبیاء اگرچہ حیات و صلوات ان کی قبر میں مسلم ہے مگر تبلیغ سلام و رد جواب کی کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ المؤمن وقاف

بیان بلا سے صاف ظاہر ہے کہ نذائے بعید کو نبی ہو یا ولی کوئی نہیں سنتا اور نذائے قریب کا سنتا مخصوص ہے انبیاء کے لیے، کسی ولی یا غوث و قطب کو یہ نصیب نہیں!

لہ ان لله ملائکہ سیاحین فی الارض یبلغون عن امتی السلام (سفیان ثوری کی حدیث عبد اللہ بن مسعود سے روایت السنائی والہو حاکم فی صحیحہ)
 شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱۹ باب فضل الصلوٰۃ علی انبی صلی اللہ علیہ وسلم طبع مکتبۃ المدینہ

ہماری اس تصریح کے خلاف بعض کم عقل ضعیف احادیث کو پیش کرتے ہیں، اپنی ضعفِ عقلی اور کتاب و سنت سے عدم مزاوت کی وجہ سے ان احادیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انبیاء و اولیاءِ ربانہ کے بعد کو بھی سن سکتے ہیں، نہ صرف سن سکتے ہیں بلکہ ہماری مدد بھی کر سکتے ہیں، لہذا ہمیں پکارنا چاہیے یا محمد، یا عوث، یا خواجہ، یا نقشبند، یا بدوی یا شاذلی ہماری مدد کرو۔ اس میں انہیں نہ اشراک فی العلم کا کوئی شبہ نظر آتا ہے اور نہ اشراک فی التصرف کا! انا اللہ وانا الیہ راجعون!

ذرا ان کی پیش کردہ احادیث پر غور کرو "ابن سنی کتاب عمل الیوم والليلة میں دو روایتیں بیان کرتے ہیں۔ عبدالسد بن عمرؓ کے پیر میں چونٹیاں بھر گئی تھیں ان سے کسی نے کہا کہ آپ اپنے محبوب ترین شخص کو پکاریے۔ انہوں نے یا محمد! پکارا اور کھڑے ہو کر چلنے لگے یہی حال عبدالسد بن عمرو بن العاصؓ کا ہوا۔ انہوں نے یا محمد! نعرہ مارا اور ایسے ہو گئے جیسے پیر سے بندھی سی کھل گئی ہو۔" یہ حدیث حسن حصین میں ان الفاظ میں ہے، فاذا خدمت رجلاً فلیذکرا حب الناس الیہ اس کو موقوفاً ابن سنی نے نقل کیا ہے اور ظفر جلیل میں تحت القائدہ یہ لکھا ہے کہ "یاد کرے محبوب کو تاکہ حاصل ہو خوشی۔ پس کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ سب سے زیادہ محبوب ہیں۔"

علماء حق نے اس حدیث کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) یہ حدیث مرفوع نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو بلکہ موقوف ہے اور حدیث موقوف حجت نہیں خصوصاً جس وقت کہ صد آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے خلاف اور معارض ہو چنانچہ علمائے اصول نے تصریح کر دی ہے کہ قول الصحابی لیس بھجت یعنی صحابی کا قول حجت نہیں۔ (۲) اس حدیث کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پیر کے سن ہو جانے کے وقت کسی محبوب کو یاد کرنا چاہیے، یاد کرنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور خون جوش میں آتا ہے اور نتیجہ کے طور پر حذر دور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک علاج طبی اور عمل نفسیاتی ہے اور ادویہ طبیہ و

لہذا اس وجہ سے کہ ان کا علم فروریع بڑا سب پر منحصر ہے۔

اعمالِ نفسیاتی کو دین میں کیا دخل! اطباء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ ضرر کا سبب اخلاطِ بلغمیہ و ریاضاتِ غلیظہ ہیں، خوشی و فرحت سے خون میں جوش ہوتا ہے اور یہی اخلاطِ تخلیل ہو جاتی ہیں۔ دوست کا یاد کرنا خوشی پیدا کرتا ہے خوشی خون میں تغیر پیدا کرتی ہے اور نتیجہ کے طور پر مرض نفع ہوتا ہے، اس سلسلہ علت و معلول کا تعلق نہ مذکورے بعید کے سننے سے نظر آتا ہے نہ اولیاء و انبیاء کی احانت و مدد سے مزید تحقیق سے مندرجہ ذیل امور قابلِ لحاظ نظر آتے ہیں:-

(۳) اس حدیث کی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم کسی نبی سے تو کیا صحابی سے بھی نہیں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی صحابی کے پیرن ہو گئے تو کسی نے کہا کہ تم اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا معلم کوئی معمول شخص ہے اور تعلیم معمول محبت نہیں۔ چنانچہ نووی نے اذکار میں جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں عن الھیثم بن جنش قال کنا عند عبد اللہ بن عمر فحدثنا رجله فقال لہ رجل اذکروا احب الناس الیک فقال یا محمد صلی اللہ علیک وسلم فکانما نشط من عقالی یعنی ہم عبد اللہ بن عمر کے ہاں تھے، ان کا پیرن ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ یاد کرو احب الناس کو تو انہوں نے کہا کہ محمد رحمت کے خدا آپ پر اور سلام نازل کرے۔ سو اسی وقت ان کا پیر کھل گیا جیسے اونٹ رسی سے کھل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس نسخہ کا تیار کرنے والا کون تھا۔

(۴) اس سلسلہ میں پیامِ نہایت ضروری ہے کہ ہم یاد کرنے کے صحیح معنی کا تعین کریں جنصوہ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یاد کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے:-

۱۔ ایک وہ جس کا ثبوت شرعی میں ملتا ہے وہ یہ کہ آپ کے فضائل صحیحہ جو احادیث اور قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں ہم ان کا تذکرہ کریں جو مصائب اور آفات آپ نے ہماری ہدایت اور رہبری کی خاطر اٹھائی ہیں ان کو یاد کریں، آپ کے فضائل محمودہ، اخلاقِ حمیدہ، عاداتِ پسندیدہ کا چرچا کریں۔
۲۔ دوسرا طریقہ جو قطعاً خلافِ شرع ہے کہ آپ کو دور سے پکاریں، بزدلیں، بددماغیوں استغاثہ کریں یہ موہم شرک ہے اور قطعاً ناجائز، اس روایت سے تذکیر یا یاد کرنے کے معنی خلافِ شرع

مراد لینا مشترکاً نہ ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ موجد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد آپ پر درود بھیج کر کرتا ہے جو حق تعالیٰ کا تعلیم کردہ طریقہ ہے، آپ کی احادیث کا چرچا کرتا ہے جو نزولِ رحمت کا باعث ہے۔

(۵) دیکھو بعض روایتوں میں لفظاً یا مذکور ہی نہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ نہ ضروری نہیں اور تذکیر بغیر خدا کے ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مجاہد کی روایت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ عن مجاہد فقال حدثت رجل رجل عن ابن عباس فقال ابن عباس اذكوا حب الناس اليك فقال محمد صلی اللہ علیہ وسلم فذهب خذماً۔ یعنی مجاہد سے روایت ہے کہ ابن عباس کے پاس ایک شخص کا پیرسن ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کا خبر جاتا رہا۔ اور خطاب جو مقرون بصلوٰۃ ہو وہ شرعاً جائز بھی ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ درود کے پہنچانے کے لیے ملائکہ مقرر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ درود کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتی ہے۔ یا پھر شوق و محبت میں پکارا جاسکتا ہے اس میں آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ منضم نہیں ہوتا جو صریحاً شرک ہے۔

(۶) اخیر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آثار نہ قولی ہیں نہ فعلی کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان سے یہ ثابت کیا جائے کہ ہر تکلیف یا مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے، نیز یہ امر سلف سے ثابت بھی نہیں کہ مصیبت کے وقت ایسا کیا کرتے تھے! اور نہ یہ کسی عہد مسلم الاجتہاد کا بلکہ ہر کہ مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے تاکہ مشکل حل ہو جائے آفت ٹل جائے اور مصیبت دور ہو جائے۔ اس کے برخلاف ہم نے اوپر قرآن کریم سے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ مصیبت کے وقت ہر نبی نے حق تعالیٰ ہی کو پکارا، ان ہی سے اعانت چاہی اور غیر اللہ کا اس سلسلہ میں خیال بھی نہ آنے دیا، باوا زبند کہا ہے

ایں بسکہ دلم جز تو نذار دکنستے تو خواہ بدہ کام دلم خواہ بدہ!

جن لوگوں کے قلوب میں غیر اللہ سے مدد مانگی ہو اور یہ ان کی طبیعتوں میں رچ گئی ہے وہ

للمہ حامی کا پہلا شعر ہے یہ یا من ملکوت کل نئی بیوہ، طوبی لمن ارتضاک ذخراً لغدا۔

ایک دوسری حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں: "حسن حصین میں حضرت سے مروی ہے کہ آپ نے اس شخص کے متعلق جو راہ گم گشتہ ہو فرمایا کہ پکارے اعیوننی یا عباد اللہ۔" اے بندگانِ خدا تم میری مدد کرو" اس حدیث سے استناد کر کے کہا جاتا ہے کہ "ہم راہ گم گشتہ ہیں، ہم پکارتے ہیں: اعیوننی یا عباد اللہ! یا غوث! یا خواجہ! یا نقشبند! یا بدای! یا شاذلی ہماری مدد کرو!"

حسن حصین کے الفاظ یہ ہیں: ان اراد عوناً فلیقل یا عباد اللہ اعیوننی یا عباد اللہ اعیوننی یا عباد اللہ اعیوننی (روہ طبرانی) اس حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اس پر علماءِ حق نے جو تنقید کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن حسان ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے اور یحییٰ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے!

(۲) اس کی سند منقطع بھی ہے، بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے اور منقطع کا حکم مثل مرسل ہے اور محدثین اور اہل اثر کی جماعت کے نزدیک یہ حجت نہیں!

(۳) اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عتبہ بن عروان ہے وہ مجہول الحال ہے یعنی اس کا تقویٰ اور عدل معلوم نہیں۔ چنانچہ تقریب ابن حجر میں اسی بنا پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب اس حدیث کا ایک راوی ضعیف اور مجہول الحال ہو تو یہ نہ قابلِ اعتماد ہے اور نہ لائقِ استدلال! (۴) جرح سے قطع نظر کر کے اگر ہم اس حدیث کو تسلیم بھی کر لیں تو ہم عقلِ سلیم کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اموات سے استعانت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ عباد اللہ سے مراد تو فرشتے ہیں جو حفاظت کے لیے معین و مقرر ہیں۔ چنانچہ فیض القدر شرح جامع الصغیر میں اس کی یوں توضیح کی گئی ہے: ان لله فلا شکر فی الارض سیمون الحفظۃ یکتون فایقع فی الارض من وری الشجرۃ فاذا اصاب احدکم حرجۃ واحتاج الی عون بفلاۃ من الارض فلیقل

لہ ابن بیدۃ اور ابن مسعود کے درمیان - فیض القدر ج ۱ ص ۳۰۷ مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ

اعینونی عباد اللہ رحمہ اللہ فاشان شاء اللہ یعان درمہ ابن السنی والطبرانی من حدیث
الحسن بن عمر عن معروف ابن حسان عن سعید ابن ابی عمرو بن عبد اللہ عن ابی بربیع عن ابن
مسعود قال ابن حجر حدیث غریب و معروف قالوا منکر الحدیث وقد تضرعوا بوفیه
القطاع بین ابی بربیع وابن مسعود یعنی اللہ کے کچھ فرشتے زمین میں مقرر ہیں جن کو حفظ اور
نگہبان کہتے ہیں، جو درخت کا پتہ زمین پر گرنا ہی اس کو لکھا کرتے ہیں تو جب ہم میں سے کسی کو
تکلیف پہنچے اور مدد کا محتاج ہو زمین کے کسی صاف میدان میں تو اس کو چاہیے کہ یوں
کہے کہ اے خدا کے بندو میری مدد کرو، اللہ تم پر رحم فرمائے، ایسے کہنے سے بیشک مدد حاصل ہوگی
دیکھو عباد اللہ سے مراد فرشتوں کا ہونا خود حدیث ہی سے ثابت ہے جو زندہ ہیں، اب
اہل استمداد کا اموات کو اپنی مدد کے لیے پکارنا ان کی مشرکانہ طبیعت کی ایجاد ہے، حدیث سے
اس کی اجازت کہاں نکلتی ہے ہم اوپر بتاتے ہیں کہ قرآن کریم نے مخلوق سے استعانت ان
امور میں جائز رکھی ہے جو ان کی قوت و قدرت کے احاطہ میں ہوں، یہ استعانت بالربوبیت
یا عون ما بین العباد ہے جب کسی کا گھوڑا بھاگ جائے یا کوئی چیز کھو جائے تو اس معاملہ میں
ادنی لوگوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جس امر میں مخلوق سے استعانت کر سکتے ہیں اس میں
ملائکہ، ابدال اور جنوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ یہ زندہ مخلوق سے ان امور میں استعانت
کرنا ہے جو ان کے دائرہ قدرت میں شامل ہے۔ اب رہی وہ استعانت جو حق سے مخصوص ہے
استعانت بالربوبیت وہ کسی طرح اس حدیث سے ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ کسی ذی علم و
ذی ہوش نے اس کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ استعانت عن الاموات کا یہاں تو
ثابت بھی نہیں پایا جاتا۔

(۵) بفرص محال ہم مان لیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور اس سے بات بھی ہی
ثابت ہوتی ہے جو اہل استمداد سمجھتے ہیں! دعا و استعانت کے متعلق اوپر جو تصریحات پیش کی گئیں

لہ منکر الحدیث (میزان ذہبی)

ان کو پیش نظر رکھ کر یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ حدیث جو خبر واحد سے قرآن میں کے معارض و مخالف ہے اور اسی وجہ سے رد کر دی جانی چاہیے کیونکہ قرآن مقدم ہے، اس کا تقدم اس کی قطعیت اس کے متواتر تنظیم ہونے اور اس کا سند کے محتاج نہ ہونے پر مبنی ہے۔

(۶) اس حدیث کے مخالف و معارض دوسری حدیث بھی اسی کتاب حسن حسین میں ملتی ہے جس کو طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے: اذا اصابع له شيئاً او ابق فليقل: اللهم داد الضالته وهادي الضلالة انت هادي من الضلالة ارمده على ضالته بقدرتك وسلطانك فانها من عطائك وفضلك۔ یعنی جب آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا اس کا غلام بھاگ جائے تو یوں دھا کرے: "اے خدا جو پھیر لاتا ہے گم ہوئی چیز کو، اے بھولے بھٹکے کی راہ بتلانے والے تو ہی راہ بتلاتا ہے بھول اور گمراہی سے، واپس دلا دے مجھ کو میری گم ہوئی چیز اپنی قدرت اور غلبہ سے کہ وہ چیز تیری بخشش اور احسان سے تھی؟"

علاوہ بریں ابن عباس سے جو حدیث مروی ہے اور جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس میں صاف طور پر حکم دیا ہے فاذا استعنت فاستعن بالله یہ معارض و مخالف ہے حدیث اعیونی کے اور ظاہر ہے کہ حدیث ابن عباس موافق ہے فقوالے کلام مجید کے لہذا اس کو دوسری حدیث پر ترجیح ہونی چاہیے۔

کیا غضب ہے یہ اموات کے پرستار (مذہب خدا کو چھوڑ کر مردوں سے استعانت کرتے نہیں شرک تھے اور اپنی بے شرمی کو رفع کرنے کے لیے کتاب و سنت سے دلائل تلاش کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں) لیکن کتاب و سنت سے تو بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مالکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر (بقردہ، ۱) دیکھو حضرت جامی نے اسی بات کو کس خوبی سے ادا کر دیا ہے:-

حق فاعل و ہرچہ جز حق آلات بود تاثیر زالت از محالات بود

ہستی کہ موثر حقیقی است بکیت باقی ہمہ اوہام و خیالات بود

نہا اور استعانت کی تائید میں اہل استدلال ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں، سوال خود پیش

کر کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ”یا رسول اللہ! یا غوث! پکارنا بھی کیا ناجائز نہیں؟ شرک نہیں؟ ترمذی، نسائی، طبرانی، ابن خزمیہ، حاکم، بیہقی نے یہ دعا روایت کی ہے: **اللھم انی لسألك واتوجه الیک بحبیبک المصطفیٰ عندک یا حبیبنا یا محمد انا نتوسل بک انی ربک فاشفع لنا عند المولیٰ العظیم یا نعم الرسول الطاهر۔ اللھم شفعبینا بجاہد عندک۔ اس دعا میں یا محمد کی ندا ہے اور حضرت عثمان کے زمانہ میں بھی اس دعا کو صحابہؓ نے خود پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔“ تو سوال کا جواب یہ ہوا کہ یا رسول! یا غوث! پکارنا شرک نہیں جائز ہے اور ادھر بھی دو حدیثوں سے استدلال کر کے اہل استدلال نے اپنی دانست میں ثابت کر دیا ہے کہ یا خواجہ یا بدوی، یا شاذلی، یا نقشبند پکارنا جائز ہے۔**

اس حدیث کی تحقیق یہ ہے:-

(۱) مروی ہے ایک اندھے نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ میرے لیے حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ مجھے اس مرض سے شفا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور چاہے تو نابینا ہی پر صبر کر کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میرے لیے دعا ہی کیجئے۔ آپ نے خود دعا نہیں فرمائی بلکہ حکم دیا کہ وضو کرے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دعا پڑھے:- **اللھم انی اسألك واتوجه الیک بنبیك نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بک الی ربی فی حاجتی هذا لتتقضى لی شفعبینا** (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کی) اس نے یہ دعا پڑھی اور بینا ہو گیا۔ (کذا فی مشکوٰۃ)

(۲) یہ حدیث اعتقاد کے بارے میں قابل استدلال نہیں کیونکہ اس کا ایک راوی عثمان بن خالد مشرک الحدیث ہے۔ فقہاء و محدثین کے نزدیک ایسے راوی کی نقل قابل حجت نہیں۔ چنانچہ نووی کی تقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی میں یہ مسئلہ مصرح ہے:-

لہ یا امین ثمر سے مانگنا ہوں اپنی حاجت اور تیری طرف متوجہ ہونا ہوں بذریعہ تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ نبی رحمت ہیں۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں متوجہ ہونا ہوں اپنے پروردگار کی طرف آپ کے ذریعے سے اپنی اس حاجت میں تاکہ میرے حق میں حاجت روائی کی جائے۔ الہی توان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔

(۳) اگر ہم اس حدیث کو بفرضِ محال قابلِ استدلال بھی مان لیں تو اس سے محض توسل ہی ہوتا ہے نہ یہ کہ جب کوئی اس نذ اور خطاب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہے تو آپ اس کی آواز سنتے ہیں جیسا کہ اہل استدلال ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ توسل میں کیا ہوتا ہے؟ توسل کرنا کیا ہے؟ وہ طلبِ حاجت کرنا ہے اسی ذات سے جو عطا و منع میں مستقل و منفرد ہے جو صاحبِ امر و مہی ہے، جس کے ہاتھ میں ہر شے کا "ملکوت" ہے اور طلب سے پہلے ایک سببِ اجابت کو لگے کر دیتا ہے جیسا کہ صحیحین میں قصہ ان تین آدمیوں کا آیا ہے جو ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے سبب سے اچھے عمل کے ساتھ توسل کیا اور وہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اگر یہ توسل بہ اعمالِ فاضلہ جائز نہ ہوتا یا شرک ہوتا تو حق تعالیٰ ان کی دعا کو قبول فرماتا نہ حضور انور اس حکایت کے بعد سکوت فرماتے۔

لیکن اگر توسل یہ سمجھے کہ انبیاء یا ملائکہ ایسا واسطہ اور وسیلہ ہیں کہ جن کو پکارنا اور ان پر بھروسہ کرنا ضروری ہے اور طلبِ نفع اور دفعِ ضرر کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کی تعظیم بجالانا چاہیے تو یہ سب سے بڑا شرک ہے جو حق تعالیٰ نے اس کے رد میں بہت ساری آیتیں نازل فرمائیں۔ کفار و مشرکین مکہ نے اللہ کے سوا اوروں کو اپنا شفیع اور حمایتی قرار دے رکھا تھا، نفع حاصل کرنے اور ضرر دفع کرنے کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، مشرکین یہود و نصاریٰ، مسیح اور عزیز اور ملائکہ کو پکارتے تھے، استغاثہ کرتے تھے حق تعالیٰ نے ان کے متعلق صاف طور پر حجت فرمادی کہ **فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضَّررِ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا**۔

دیکھو بادشاہ اور رعایا کے درمیان عرض معروض کے لیے چوبدار عرض بیگی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے کانوں تک رہا یا کا درد دکھ پہنچاتے ہیں، اگر کوئی انبیاء و اولیاء کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی جناب میں خلقت کی حاجتوں کو پہنچاتے ہیں، ان کے درد دکھ کو سنا سکتے ہیں اور حق تعالیٰ خلقت کی جو حاجت روانی کرتے ہیں، ان کو رزق دیتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں تو ان ہی کے واسطے سے لہذا خلقت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ہی سے حاجت طلب

کریں اور وہ حق تعالیٰ سے عرض کریں جیسے کہ عرض بیگی بادشاہوں سے کرتے ہیں۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا بافتاق اہل اسلام کافر و مشرک ہے۔ بعینہ ہی دین مشرکین کا جو بت پرست ہیں، وہ اپنے بتوں کو انبیاء و صالحین ہی کی صورتوں پر بناتے تھے اور ان کو اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دیتے تھے جو ان کو حق تعالیٰ سے قریب کر سکتے تھے۔ (کما صرح ص ۱۵۰۸) اور یہی وہ شرک ہے جس کی وجہ سے نصاریٰ معتوب ہوئے۔ ان کے متعلق قرآن مبین نے صراحت کی ہے: **اتَّخَذُوا الْعِبَادَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَاٰمِرًا بِالْاٰمْرِ وَالنَّٰهِيًا بِالنَّٰهِيَةِ** (پس ۱۱) عرض حق تعالیٰ نے اس توحید کو قرآن کریم میں جا بجا بیان فرمایا ہے اور شرک کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا ہے اور اس کی اصل صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کرے اور نہ کسی سے امید رکھے اور نہ کسی کو ان کے سوا اپنے کاموں میں کافی جانے۔

موصد کہ درپائے ریزی زرش وگر آگاہی نہی بر سرش

امید و ہراسش نہ باشد ز کس ہمیں است بنیاد توحید و بس

ذرا اس واسطہ یا وسیلہ کے مسئلہ پر عقلی پہلو سے بھی غور کر لو، عالمِ ہادی کی بادشاہت پر نظر ڈالو، یہاں بادشاہ اور رعایا کے درمیان وسائے ہیں ہی قیام کے ہوتے ہیں (راہ) چونکہ خود بادشاہ اپنی تمام رعایا کے احوال کی خبر نہیں رکھ سکتا اس کو ایسے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو رعایا کے حال کی خبر دیتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی واسطہ خدا اور بندوں کے درمیان فرض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حق تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ زمین و آسمان کا کوئی ذرہ ان کے علم محیط سے باہر نہیں، وہ "سمیع" و "بصیر" و "علیم" ہیں اور بھولے ہوئے ہر شے سے

لہ من جعل بینہ و بین اللہ وسائے تکلیف علیہم و یدعوہم کفر اجماعاً لان ذلك کفعل عابدی الاصلنام قائلین فان عبدہم الا لیقر بونا الی اللہ ذلنی۔ (رقمہ اور اس کی شرح دیکھو) لہ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو رب بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو صرف یہ علم کیا گیا ہے کہ فقط ایک مہبود کی عبادت کیا کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

(۲) چونکہ بادشاہ اکیلا سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا اور نہ ہی تنہا اپنے دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، لہذا اس کو اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حق تعالیٰ کو نہ کسی ناصر و مددگار کی ضرورت ہے اور نہ کسی معین و ظہیر کی، وہ کائنات کے تمام اسباب و آلات کے خالق، رب، مالک ہیں، ان کی ذات تمام اشیاء سے غنی و بے نیاز ہے، سارا عالم ان کا فقیر و محتاج ہے، مملوک و مرہوب ہے۔

(۳) چونکہ بادشاہ اپنی رعایا کی نفع رسانی اور خیر گیری میں سُستی اور غفلت کر سکتا ہے، لہذا اس کو کسی ایسے محکم کی ضرورت ہے جو اس کو اپنے فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرے لیکن اس قسم کے کسی محکم کی حق تعالیٰ کو ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود خلق پر ماں باپ سے زیادہ رحیم ہیں۔

عقائد کے ان بدہیات کو ماننے کے بعد اگر کوئی یہ خیال کرے کہ حق تعالیٰ اور ان کے بندوں کے درمیان ان وسائل کی ضرورت ہے جو سلاطین اور رعایا کے درمیان ضروری ہیں اور وہ وسائل انبیاء اولیاء ملائک یا اور موجودات ہیں تو وہ کھلا بُت پرست ہے جو اپنے اصنام اور اولیاء کو حق تعالیٰ کے دربار میں شفیع، وکیل، حمایتی، مقرب سمجھتا ہے اور اسی خاطر ان کی عبادت کرتا ہے! وہ خالق اکبر کو مخلوقِ اتر کے مشابہ سمجھتا ہے جو بغیر اپنے اعوان و انصار کے، بغیر اپنے معین و ظہیر کے کائنات کا انتظام ہی نہیں کر سکتا۔ **فَلَا تَقْفِرُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ تَعَالَى اللَّهُ عَنِ ذَٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيرًا۔**

شفاعت اسی سلسلہ میں شفاعت کا صحیح طور پر علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ شفاعت کے معنی ہیں سفارش دنیا میں سفارش یا شفاعت کئی قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) شفاعت و جاہت: بادشاہ کے دربار کا ایک امیر، بادشاہ کے پاس ایک چور کی سفارش کرے جس کی چوری ثابت ہے، بادشاہ سزا دینا چاہتا ہے لیکن اس امیر کی سفارش سے دب کر اس چور کی تقصیر کو معاف کر دیتا ہے تاکہ امیر کی ناخوشی کی وجہ سے امور سلطنت میں خلل نہ پڑے۔

۱۔ ان امم کی مزید توضیح کے لیے دیکھو ابن تیمیہ کا رسالہ قاعدہ واسطیہ جو توسل پر ایک بے نظیر رسالہ ہے جس سے ہم نے یہاں استفادہ کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص کسی فرشتے یا نبی یا ولی کو حق تعالیٰ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھتا ہے وہ سخت جاہل اور کھلامشک ہے۔

(۲) شفاعتِ محبت :- اس چور کی سفارش بادشاہ کا کوئی معشوق یا منظور نظر کرتا ہے اور بادشاہ اس کی محبت سے ناچار ہو کر چور کو معاف کر دیتا ہے اور اپنا غصہ پی جاتا ہے۔
ظاہر ہے کہ اس قسم کی بھی شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تصور نہیں کی جاسکتی۔ بندہ اپنی عبودیت کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا!

(۳) شفاعتِ بلاذن: اس چور کی سفارش بادشاہ کی مرضی پا کر، اس کی اجازت سے کی جاتی ہے نہ اس وجہ سے کہ سفارش کرنے والا اس کا قرابتی ہو یا آشنا یا حمایتی۔ بس یہی ایک شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ممکن ہے۔ اسی کا ذکر قرآن کریم و احادیث نبوی میں آیا ہے شفاعت بلاذن کے متعلق مندرجہ ذیل چند امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) شفاعت نہ ہوگی مگر حق تعالیٰ کے اذن سے! ان آیات سے اس کی توضیح ہوتی ہے :-

۱۔ یَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (پت ۷۵) اس روز سفارش نفع نہ دیگی مگر اس شخص کے لیے جس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اجازت دیدی ہو اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کر لیا ہو!

ب۔ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ (پت ۷۶) ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے۔

ج۔ لَا تَغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنَ بَعْدِ أَنْ يَأْذِنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُضَيِّقُ (پت ۷۷) یعنی ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہیں اجازت دیدیں اور راضی ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ شفاعت حق تعالیٰ کے حکم و اجازت سے ہوگی نہ شفیع کی مختاری خودرائی سے کہ اپنے جس دوست کے حق میں چاہا بغیر رضی حق کے معلوم کرنے اور بدون اجازت سفارش کر دی۔

کفار و مشرکین ہی سمجھتے تھے کہ ان کے معبودان کی سفارش کریں گے اور عذاب سے بچائیں گے اس سفارش کو حق تعالیٰ باطل کر رہے ہیں اور جس سفارش کو ثابت کر رہے ہیں وہ اس بندہ محکوم کی شفاعت ہے جو اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے بدون اس کی اجازت و امر کے پیش قدمی نہیں کرتا پہلی قسم کی شفاعت شریک کی شفاعت ہے اور حق تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، دوسری قسم کی شفاعت بندہ محکوم کی ہے و دشتان بین ذلک! جب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے اسی کے واسطے سفارش کا حکم دیں گے تو یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ واقع میں سفارش حق تعالیٰ ہی کی ہوتی اور جو شخص ان کے سامنے سفارش کرے گا وہ ان کے امر و اجازت سے کرے گا۔ ابن قیم کے الفاظ میں "وہ ذات پاک خود اپنے نفس سے سفارش کریگی یعنی اپنے آپ ہی بندہ پر رحم کرنا منظور ہوگا۔ یہی معنی ہیں قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا اور نیز اس آیت کے قَالَهُمْ مِنْ دُونِ مَنْ وَّلِيٌّ وَّلَا شَفِيعٌ اِلَّا مَنْ سِوَا ذٰلِكَ كُوْنُوْا لِلّٰهِ اُوْدِيًّا اور جس نے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی و شفیع ٹھہرایا، اس کی مثال ایک کڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا جو سب سے زیادہ بودا اور کمزور ہے! اتھوڑی دیہ کے لیے اس آیت پر غور کرو، شرک فی التصرف اور شفاعت کو کس خوبی سے رد کیا جا رہا ہے۔

قُلْ اَدْعُوا الَّذِيْنَ دَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا مِّنْ دُوْنِ السَّمٰوٰتِ وَلَا مِنَ الْاَرْضِ وَمَا لِهٰمْ فِيْهَا مِنْ شَرِكٍ وَّمَا لَهُمْ مِنْ ظٰلِمِيْنَ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَ الَّذِيْنَ اُذِنَ لَهُ۔ یعنی آپ فرمائیے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے نہ آسمانوں میں اور نہ زمینوں میں اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے اور خدا کے سامنے سفارش کسی کی کام نہیں آتی مگر اس کے لیے جس کی نسبت وہ اجازت دیتے (پ ۹۷) مشرک نے جس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے اس سے وہ بفع کی امید کرتا ہے اور بفع اسی سے پہنچ سکتا ہے جس میں ان چار صفات میں سے کم از کم ایک صفت ہوتی ہے۔

۱۔ یا تو وہ اس شے کا مالک ہو جس کی امید یہ عابد کر رہا ہے اور جس کے لیے وہ دعا کر رہا ہے۔

۲۔ اگر مالک نہ ہو تو مالک کا "شریک" ہو۔

۳۔ اگر شریک بھی نہ ہو تو کم از کم اس کا معین و ظہیر یعنی مددگار ہو۔

۴۔ اگر معین و ظہیر بھی نہ ہو مالک کے نزدیک شفیع ہو۔ (ابن قیم)

ان ہی چار صورتوں میں عابد کو اپنے معبود سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اب حق تعالیٰ ان چاروں کی ترتیب وار نفی فرما رہے ہیں، اعلیٰ صفت سے شروع کر کے ادنیٰ صفت کی طرف رجوع فرما رہے ہیں، مالک و شریک و مظاہرت (مددگاری) و شفاعت کی کلی نفی فرما رہے ہیں اور اس شفاعت کا اثبات کیا جا رہا ہے جس سے شرک کو کوئی فائدہ نہیں اور یہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے اذن سے ہوگی۔ یہ آیت ایک نور ہے، برہان ہے۔ اس سے توحید کا قطعی اثبات ہوتا ہے اور شرک کی ساری جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

(۲) اذن نہ ہوگا مگر اس شخص کے لیے جس کے قول و فعل کو حق تعالیٰ پسند فرمائینگے۔

حق تعالیٰ شفاعت کا حکم اسی شخص کی نسبت عطا فرمائینگے جو قول و فعل کے لحاظ سے ان کا پسندیدہ ہوگا۔ لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ (پ ۲۶) یعنی جن کو شفاعت کا اذن دیا گیا ہو وہ بجز اس کے جس کے لیے خدا تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے۔

(۳) کسی کا قول و عمل پسند نہ ہوگا مگر توحید و اتباع رسول۔

ابوالعالیہ فرماتے ہیں کلماتان یبطل عنہما الاولون والآخرون، ماذا كنتم تعبدون و فاذا اجبتهم المرسلین۔ یعنی دو باتوں کا تمام اولین و آخرین سے سوال کیا جائیگا، تم کس کی عبادت کرتے تھے اور تم نے رسولوں کی کن کن باتوں پر عمل کیا؛ حدیث ابو ہریرہ میں آیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ من اسعد الناس بشئ اعنتک یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا من قال لا الہ الا اللہ خالصاً من قلبہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت اہل اخلاص کے لیے ہوگی جنہوں نے کوئی شرک نہیں کیا۔ بخاری نے ابو ہریرہ سے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ شفاعتی لمن قال لا الہ الا اللہ مخلصاً بصدق قلبہ لسانہ ولسانہ قلبہ۔ اس کو امام احمد نے صحیح کہا ہے۔ مسلم نے جو روایت ابو ہریرہ سے کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

انی لختبات دعوتی شفاعت لامتی یوم القیامتہ فیہی نائلۃ ان شاء اللہ، من
مات لا یشرک باللہ شیئاً۔

شفاعت کے متعلق ان تین اصول کو سمجھ جانے کے بعد شرک کا استیصال ہو جاتا ہے۔ بالفاظ
دیگر جس نے یہ سمجھ لیا کہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے حکم و اجازت سے ہوگی اور اسی کے لیے ہوگی۔
جس کے قول و فعل کو وہ پسند کرتے ہوں گے اور وہی قول و فعل ان کو پسند ہوگا جو شرک و بدعت سے
متبرہ اور توحید و سنت کے مطابق ہو تو اب وہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا شفیع کیسے ٹھہرا سکتا ہے
اور مشرکین کی طرح ہولاً و شفاعاً و ناعبداللہ کا کب قائل ہو سکتا ہے، حق تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور
کی طرف کس طرح اپنے قلب کو رجوع کر سکتا ہے، وہ جانتا ہے کہ افضل ترین مخلوقات حضور انور
صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہونگے، اپنے رب اپنے مولیٰ و مالک کی حمد و ثنا
میں رطب اللسان ہونگے لیکن سجدہ سے سر نہ اٹھائینگے اور شفاعت کے لیے اس وقت تک زبان
نہ کھولینگے جب تک کہ حق تعالیٰ کی اجازت نہ ہوگی کہ ”قل تسمعوا لشفعہ تشفعہ و سل تعطہ۔ پھر
آپ نے تصریح فرمادی کہ فیحدلی حدلاً، کہ میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی یعنی آپ شفاعت
ان ہی کی فرمائینگے جن کا قول و فعل حق تعالیٰ کو پسند ہوگا، یعنی جو مشرک نہ ہوگا، جس نے صدق دل سے
توحید الوہیت کا اقرار کیا ہوگا، اسی کی شفاعت کا اذن ہوگا اور اس کی شفاعت کی جائیگی اور
اسی پر حق تعالیٰ رحم کرنا منظور فرمائینگے!! اسی کی بالاخر نجات ہوگی، جب اذن شفاعت دینے والے
حق تعالیٰ ہی ہیں، اور قبول کرنے والے بھی وہی ہیں، مشغور کہ کو ایسے کاموں کی توفیق دینے والے
بھی وہی ہیں جس کی وجہ سے وہ مستحق شفاعت ٹھہرتا ہے تو پھر صاف ظاہر ہے کہ شفاعت درحقیقت
حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے! قل اللہ الشفاعۃ حیثیکلے ہی معنی ہیں! یہی وجہ ہے کہ جس
شخص نے اپنے اللہ ہی کو معبود ٹھہرایا، اسی کے لیے اذن شفاعت ہوگا، اور جس نے غیر اللہ
کو معبود ٹھہرایا اس کی نہ کوئی شفاعت کریگا اور نہ کوئی شفاعت اس کے.....

لہ متفق علیہ کہہ سنا جائیگا، شفاعت قبول کی جائیگی۔ انک دیا جائیگا۔

لیے مفید ہوگی۔ ان ہی متحذین شفعاء کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: قُلْ اتَّبِعُونِ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ شَيْئًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ يُشْرِكُونَ۔ یعنی کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا کو معلوم نہیں
نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے (پس ۷۷) اس طرح ان
کے افترا و شرک کو ظاہر فرمادیا!

نذر لغير الله | مشرکین کی عبادت کا ایک اور عمل جس پر پہلے مقالہ کے آخر میں بحث کرنی باقی ہے
وہ "نذر لغير الله" ہے مشرکین اپنے مال کا ایک حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان کے
لیے جانور ذبح کرتے تھے، اس طرح ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے: وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِنَّا ذَرَئًا مِّنْ حَرْثِ
وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا (پس ۳۶) اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی
پیدا کیے ہیں، ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزرگ خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا
ہے اور یہ نہاں سے معبودوں کا ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّنَّا رِزْقًا ثُمَّ يَصِفُونَ تَاللَّهِ لَئِن سَأَلْتُمْ مِمَّا
كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ (پس ۱۳۷) ان افترا پردازوں کی ضرور باز پرس ہوگی۔

حضرت شاہ عبدالقادر ان آیات کی تفسیر میں صراحت فرماتے ہیں کہ "کافر اپنی کھیتی اور
مویشی کے بچوں میں اور تجارت میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے تھے جنہیں
وہ اپنی جہالت اور بے خبری سے معبود، یا مالکِ نفع و ضرر سمجھتے تھے حق تعالیٰ ان کے اس ظلم
اور بے انصافی اور افترا پردازی کی مذمت فرماتے ہیں۔

نذر و نیاز کا رواج اسلام کی "غربت" کے اس زمانہ میں اس کثرت سے ہو گیا ہے کہ میں بیان
اس کی تحقیق ضروری نظر آتی ہے۔ ہر دماغ کے مشرکین کے قلوب میں ایک نمایاں تشابہ ہوتا ہے، وہ وہی
بات کہتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزرنے والے مشرکین نے کسی کھی اور اس پر عمل
کیا تھا: كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهتْ قُلُوبُهُمْ (پس ۱۳۷)

نذر (نیاز) لغت میں وعدہ کرتا ہے نیکی کا ہویا بدی کا اور شرع میں کسی عبادت کا لازم کر لینا ہر
 جو لازم نہیں تھی۔ نذرات نذرا اذا وجبت علی نفسک شیئاً تبرعاً من عبادۃ او صدقۃ او
 غیر ذلک، (ہنایہ) تمام فقہاء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نذر اللہ کی قربت اور عبادت ہے۔ چنانچہ
 قاضی حسین اور مثولی اور رافعی، اور سوان کے دوسرے علماء شافعیہ اور زین الدین بن نجیم اور علامہ
 قاسم وغیرہ علمائے حنفیہ نے اپنی تصانیف میں اسی کی صراحت کی ہے اور

وَمَا تَفْقَهُمْ مِنْ تَفَقُّهِ اَوْ نَذْرًا لِمَنْ
 نَذْرًا فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ (پطع ۵) اتنے ہو تو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے۔

سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابوالمسعود میں وضاحت کی گئی ہے کہ اوند زتم، النذر
 عقد الضمیر علی شیءٍ والتزام یعنی نذر دل میں کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کو لازم کر لینا ہے۔

جب نذر عبادت ہوئی تو غیر اللہ کے لیے اس عبادت کا بجالانا شرعاً صریحاً منکر ہے۔ عوام
 الناس بزرگوں کی جو نذر و نیاز کرتے ہیں وہ حاجت برآری کے خیال ہی سے کرتے ہیں یا تو کسی مقصد
 کا حصول پیش نظر ہوتا ہے یا پھر کسی بلا کا ٹالنا، گویا اس طرح وہ ان بزرگوں کو رشوت دینا چاہتے
 ہیں، اس خیال سے تو حق تعالیٰ کی نذر بھی بردہ نہیں کہ وہ ذات مقدس بھی اخذ رشوت سے پاک
 ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
 کہ لا تذروا فان النذر لا یعنی من القدر شیئاً وانما يستخرج به من الخيل (متفق علیہ)
 یعنی نذر نہ مانو اس لیے کہ نذر تقدیر کے نوشتے کو نہیں مٹا سکتی، اس کے ذریعہ تو فقط بخیل کا مال
 نکالا جاتا ہے۔ طیبی نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کر دی ہے کہ جس نذر سے روکا گیا ہے
 وہ نذر مقید ہے جس کا ناسخ والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تقدیر کے لکھے سے بچا لیتی ہے، جیسا کہ
 بہت لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور ہم اپنے زمانہ کی کتنی جماعتوں کو اسی اعتقاد پر پالتے ہیں۔

غرض عوام جو بزرگوں کی نذر کرتے ہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ تمہاری اس نذر کا مقصد کیا ہے؟

۱۱۹، والنذر للمخلوق لا يجوز لانه عبادة والعبادة لا تكون للمخلوق۔

۱۔ تقرب اور عبادت؟ یہ تو صریحاً شرک ہے۔

۲۔ مقصود یابی اور حاجت براری؟ یہ بھی شرک و حرمت دونوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ ایصالِ ثواب؟ ہاں یہ جائز ہے، لیکن یہاں نیت کی تصحیح سخت ضروری ہے، غور کرو،

تمہیں خود اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیے، خود ثواب کمانے پر نائل ہونا چاہیے اس کو چھوڑ کر تمہیں

دوسروں کو ثواب پہنچانے کی فکر زیادہ دامن گیر معلوم ہوتی ہے اور پھر تمہارے آباؤ اجداد اس امر کے

زیادہ مستحق ہیں کہ تم انہیں ثواب پہنچاؤ، اس کا تم کو زیادہ خیال نہیں ہوتا، پیروں اور شہیدوں

کی نیاز اور فاتحہ التزام کے ساتھ کرتے ہو، ذرا اپنے قلب کی طرف ایمان کی روشنی میں دیکھو، کیا

تمہاری غرض یہ تو نہیں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال میں برکت ہوگی، بال بچے تندرست اور

عافیت سے رہینگے، تجارت میں خسارہ نہ ہوگا، زمانہ کے لگدکوب سے نجات ملیگی یا اگر تم اس غرض

سے نذر و نیاز بزرگوں کی کیا کرتے ہو (مثلاً حضرت پیڑ کی گیارہویں یا کندوری دسترخوان یا سرنی

تو مشرک کی طرح تم ان بزرگوں کو اپنا معبود بنا رہے ہو، ان کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ رہے ہو، اور یہ

کھلا شرک ہے! اس کی تصریح قرآن و حدیث سے اوپر تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ علامہ قاسم شامی

درر کے اس بیان پر غور کرو۔

النذر الذی ینذرہ اکثر العوام کان یقول یا سیدی فلان یعنی بدولیتا ونبیاً ان ردغائبی

او عوفی مریضی او قضیت حاجتی فلك من الذهب او الفضة او الطعام والشراب او الزيت کذا

فہذا باطل بالاجماع لانہ نذر مخلوق وهو لا یجوز، لان النذر عبادة والعبادة لا یكون لمخلوق

والنذر ولہ میت والمیت لا یملک وانہ ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور کفرا لا ان قال: یا اللہ

انی نذرت لک ان فعلت معی کذا ان اطعم الفقراء الذین بیاب السدۃ النقیستہ والامام

الشافعی ونحوہ فیجوز حیث یکون فیہ نفعاً للفقراء والنذر للہ۔

یعنی وہ نذر جو عوام الناس کہتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ اے میرے بزرگ کسی ولی یا نبی کو مخاطب

کر کے، اگر میرا غائب واپس آجائے یا بیمار اچھا ہو جائے، یا میری حاجت برکے تو آپ کے لیے ناشائستہ

یا چاندی یا طعام و شربت یہ تیل بطور نذر پیش کروں گا۔ سو یہ باطل ہے بالاجملع، اس لیے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور یہ جائز نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کی روا نہیں، جس کے لیے نذرانی ہے وہ میت ہے اور میت کسی چیز کا مالک نہیں، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نذر ماننے والا یہ بھی خیال کرے کہ میت کو کاموں میں اختیار حاصل ہے تو وہ کافر ہو جائے۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ "یا اللہ میں نے تیری نذر کی کہ اگر تو میرے ساتھ یہ معاملہ کرے تو میں سداً نقیسہ والے فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا، یا امام شافعیؒ کے دروازے والوں کو کھانا دوں گا" تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں نفع ہے فقیروں کا اور نذر ہے اللہ عزوجل کی۔"

دیکھو اس بیان کا تجزیہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور واضح طور پر پیش ہو جاتے ہیں۔
۱۔ عوام کا لانا عام جو نذر اپنے پیروں بزرگوں کی حاجت براری کی خاطر کرتے ہیں وہ بالاجملع باطل ہے اور قطعاً شرک ہے، کیونکہ

۲۔ مخلوق کی نذر کسی معنی میں جائز نہیں اس لیے کہ وہ عبادت ہے اور سوائے خالق کے کسی کے لیے روا نہیں۔

۳۔ عوام کی غرض بزرگوں کی نذر و نیاز سے یہی ہوتی ہے کہ آفات و بلیات سے وہ محفوظ رہیں، مال و دولت میں اضافہ ہو، صحت و عافیت حاصل ہو، اگر وہ زبان سے اس امر کا اقرار بھی کریں کہ ہمیں صرف ایصالِ ثواب ہی منظور ہے تو بھی وہ اپنے نفس کو دھوکہ دے رہے ہیں، انہیں ایسا نذاری کے ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

۴۔ یہ بھی کہنا درست نہیں کہ یہ فلاں ولی یا نبی کی نذر ہے بلکہ انہیں یہ کہتا چاہیے کہ یہ اللہ کی ہے اور ثواب اس کا فلاں کو پہنچے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی نبی یا ولی کی نذرانی بھی جائز ہے تو وہ معتقد نہیں ہوتی کیونکہ لاوقاء لندنی معصیۃ یعنی نذر معصیت کی وفا ضروری نہیں۔ اور ظاہر ہے

۱۔ یہ حدیث مسلم بن عمران بن حصین سے مروی عامرونی ہے۔

کہ عبادت غیر اللہ معصیت ہے اور نذر منجملہ عبادات ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ ومن نذر ان یعصیہ فلا یعصہ جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر کی اس کو چاہیے کہ اطاعت کرے اپنی نذر پوری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر کرے وہ نافرمانی نہ کرے۔

توحید الوہیت کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ دعوتی کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی رو سے اللہ تعالیٰ ہی ہے اللہ قرار پاتے ہیں، اللہ کے معنی ہیں معبود و رب، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہے اللہ کے معبود ہیں اور ہمارے رب، اللہ تعالیٰ کے سوا ہمارا نہ کوئی معبود اور نہ کوئی رب یا مستعان۔ توحید الوہیت میں یہی ”توحید معبودیت“ و ”توحید ربوبیت“ شامل و داخل ہیں۔ شرک واقع ہوتا ہے عبادت و استعانت ہی کی راہ سے، یعنی اگر غیر اللہ کی عبادت کی جائے، یا اس سے استعانت کی جائے تو شرک پیدا ہوتا ہے۔ دیکھو قول انما ہوا الہ واحد و انتی بربی مما نشکر کون (پ ۸۶) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شرک الوہیت ہی کی راہ سے پیدا ہوتا ہے۔ و اعبدوا اللہ ولا تشركوا به شیئا سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے اور قل انما ادعوا ربی ولا اشرك به احدا سے واضح ہوتا ہے غیر اللہ کو پکارنا (دعا و ندا) شرک ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین کی تعلیم دے کر عبادت و استعانت کو بطریقِ حضرت حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور اس طرح توحید الوہیت کی کامل حفاظت کر دی گئی۔

توحید الوہیت کے اس معنی کو پیش نظر رکھ کر مشرکین عرب کی عبادت پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اپنے صنم و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و ضعیف جان کر ان سے وقت حاجت فرما دے چاہتے تھے اور اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے۔ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں بتلایا گیا کہ استغاثہ استعانت، دعا و نداء نذر و نیاز سب افعال عبادت ہیں۔ لہذا ان افعال کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی سے ہونا چاہیے۔ مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے دہرا رکھا تھا اسی لیے انہیں تنذیر کی گئی کہ قُلْ اجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُونَ پس ان کا شرک بھی

غیر اللہ کی عبادت اور اس سے استعانت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ حق تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ ان کی ذات ہی میں کسی غیر کو شریک کہتے تھے۔

غیر اللہ کی عبادت ہی شرکِ محض اور کفرِ بحت ہے، یہ شرکِ اکبر انسان کے خون و مال کو حلال کر دیتا ہے اور اس کو "مخلد فی النار" بنا دیتا ہے، جب کسی کے کانوں تک توحید کی دعوت پہنچ چکی اور اس پر حجت کا قیام ہو گیا اور اس کے باوجود وہ شرک پر چارہا اور کفر کا اعلان کرتا رہا تو وہ کافر مشرک ہو گیا، اب اس کی نجات کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کرے اور توحید پر ایمان لائے اور اگر نام کا مسلمان ہے تو تجدیدِ اسلام کرے۔

احادیثِ نبویہ میں کلمہ توحید کے چند قیود و شرائط بیان کیے گئے ہیں، مثلاً کسی قسم کا شبہ، الوہیتِ الہی میں شکرے، متکبر نہ بنے، جائز نہ ہو، یہ کلمہ اس کو گناہوں سے روکے وغیرہ۔ انسان حیوان پر غور کرتا ہے تو اس کو اپنی ہلاکت کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا کیا ذکر جو غیر اللہ کی عبادت بجا لاکر کھلے شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ سائے اربعے نے تارکِ صلوٰۃ، مانعِ زکوٰۃ، یا تارکِ اذان یا نمازِ عید سے قتال کرنا واجب قرار دیا ہے کیونکہ یہ شعائرِ اسلام ہیں، پھر اہل شرک و کفر سے قتال کا کیا ذکر بعض نے تو اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔ جب نماز، روزہ، حج یا زکوٰۃ کے ترک کرنے سے کفر لازم آتا ہے تو ترکِ توحید و اخلاص سے کس طرح شرک لازم نہیں آئے گا۔ امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلك عصموا منی دماءہم واموالہم الا بحق الاسلام وحسابہم علی اللہ!

مقالہ کے دوران میں جو آیتیں شرک و کفر کے رد میں پیش کی گئیں ان کو عرب ہی کے مشرکین کفار اور عابدینِ اصنام و اوثان کے حق میں سمجھنا غلطی ہے۔ ان کا اطلاق ہر زمانہ کے مشرکین پر ہوتا ہے، ہر زمانہ کے مشرکوں کے درمیان ایک ہی امر جامع مناسب ہے اور وہ شرکِ بائیس ہے لہذا حکم ایک ہی ہو گا کیونکہ جامع موجود ہے اور فارق معدوم، چنانچہ اصولِ فقہ کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ العبرة

لہ اسی کو پیش نظر رکھ کر شاید اقبال نے کہا ہے جو ہی گویم مسلمانم بلزوم ہ کہ دانم مشکلات لا الہ الا اللہ (ارمغانِ حجاز)

بعموم الا لفاظ لا بخصوص الموارد یعنی اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا، اس کے احکام شرعیہ کا مدار اسی اصول پر ہے اور حدیث میں صراحت کی گئی ہے کہ حکمی علی الواحد حکمی علی الجماعۃ اس کے انکار سے یہ بات لازم آئیگی کہ جو حکم کسی خاص سبب کی بنا پر کسی گزشتہ واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوا ہے وہ اسی کی حد تک محدود ہے اور متعدی نہیں، یہ قطعاً باطل ہے۔ اس سے احکام شرعیہ کا تعلق لازم آتا ہے۔ کیونکہ جتنی آیات حدود جنایات و مواریث ہیں وہ سب خاص خاص واقعات ہی کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے اور قیامت تک باقی ہے۔ چنانچہ ابن عباس نے ان آیات کی بابت جو بنی اسرائیل کے حق میں اتری ہیں فرمایا تھا: فذا نزل علی بنی اسرائیل وانه علینا مثلهم وما اشبه لللیلۃ بالبارحۃ۔ اسی چیز کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ نعم الاخوة بنی اسرائیل اذ کان کل حلوق لکم وکل عرقہ لہم! اور ائمہ ثلاثہ نے تو اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ شرائع ما قبل ہمارے لیے بھی شرع ہیں اور امام شافعیؒ بھی اسی اصول کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسی صورت میں جب کہ اس کی توضیح ہمارے شرع میں بھی آپ کی ہو۔ اب ہمارے شرعیات نے بھی ان مسائل کی توضیح کر دی ہے۔ اور کتاب و سنت ان پر ناطق ہیں۔ ان کا تعلق اہم سابقہ اور مشرکین عرب ہی کے ساتھ سمجھنا کس قدر فاحش غلطی ہے۔

پھر ذرا غور تو کرو کہ جس چیز سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کو منع فرمایا، خلاف ورزی پر ان سے مقاتلہ فرمایا، جس پر قرآن مبین نازل ہوا وہ شرک ہی تو تھا اور کفر، ان کے متعلق ساری آیتیں محکم ہیں اور غیر منسوخ، اول و آخر ہر ایک کے لیے یکساں ہیں، علاوہ ازیں قرآن کریم میں ایسی آیتیں بھی ہیں جو خاص انبیاء بلکہ افضل انبیاء اور مومنین کے حق میں اتری ہیں ان میں شرک کو مجتہد اعمال قرار دیا گیا ہے۔ سورہ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَوْ اَنَّكَ كُفِرْتُمْ عَنْهُ لَمَّا كَانُوا يَعْلَمُونَ، کسی جگہ خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا سُلُوكَ الَّذِينَ كَفَرُوا، ایک جگہ اہل ایمان کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ!

ہمکے اس زمانہ کے مومن مشرک بھجوائے حدیث لتتبعن سنن من قبلکم اپنے پیشرو مشرکین
عرب اور یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر "توحید الوہیت" ہی کا انکار کر رہے ہیں یعنی وہ اس امر کے
قائل نہیں رہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی لائق دعا و عبادت، خوف ورجا، استغاثہ استغاثہ
نہیں جس کے لیے جانور ذبح کیا جائے یا نذر مانی جائے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ
کے سوا ان کے انبیاء و اولیاء بھی شہادت و مصائب و آفات و بلیات میں ان کی فریاد سن کر ان
کی حالت سے مطلع اور واقف ہو کر ان کی مدد کر سکتے ہیں، کشفِ ضرر کر سکتے ہیں۔

اسی لیے ان کے اہل علم و فضل بھی اس کی علی الاعلان تعلیم کرنے لگے ہیں کہ حالتِ درود
مصیبت میں پکارنا چاہیے، حضرت معروف کرہؓ کو، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو، حضرت سالار
مسعود قازمیؒ کو، حضرت شاہ بدیع الدین مدار کو، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کو، حضرت قطب
الدین گاکیؒ کو، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جاہل اور عالم دونوں غیر اللہ سے اس طرح استغاثہ
ہر مصیبت کے وقت کرتے ہیں، ان کے لیے مرغ، بکری، گائے ذبح کرتے ہیں، نذر و نیاز لاتے
ہیں، منت مانگتے ہیں، چرخ روشن کرتے ہیں، ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں، سجدہ کرتے
ہیں۔ وہ ان بزرگوں کو اپنے پیش روؤں کی طرح اللہ کی ذات میں شریک نہیں کرتے بلکہ ان کو اللہ
کا مملوک و محکوم ہی مانتے ہیں، اللہ ہی کو حاکم و مالک و رب سمجھتے ہیں، مستقل معبود اللہ ہی کو جانتے
ہیں اور اپنے ان بزرگوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں لیکن پھر اپنے پیشروؤں کی طرح ان کا عقیدہ
یہ ہے کہ ان کے یہ بزرگ، صلحاء، مقرب الہی ہیں وہ ان کی نذر و نیاز، ان سے دعا و التجا و استغاثہ
اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی وجاہت و شفاعت و قرب سے اللہ کے غصے اور خفگی و ناراضی سے
نجات پا کر قرب حاصل کر لیں۔

اس مختصر مقالہ میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعینہ یہی عقیدہ "شُرک فی اللوہیت"
ہو۔ یہی مذہب الجہل اور ابولہب کا ہے سوا، لبوا، حضرت عیسیٰؑ و حضرت عزیرؑ و ملائکہ و انبیاء کے
پکارنے والے بعینہ اسی مسلک پر قدم زن تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن دُونِهِ لَا يَأْتُوا

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ - وَقَوْلُهُ تَعَالَىٰ: وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شَفَعَاءُنَا عِنْدَ اللَّهِ!

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ الی وامی) نے دین حق کا پیغام لا الہ الا اللہ پیش فرما کر افرادِ عبادت اللہ کی طرف دعوت دی، ساری عبادت کو اللہ ہی کے لیے مختص کر دیا خواہ استعانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت، قلبی ہو یا قالیبی! مشرکین نے جن وسائل کو تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دیا تھا ان کی نفی فرمائی، وضاحت فرمادی کہ توسط ان اولیاء و انبیاء و شہداء و ملائکہ کا اس اعتقادِ فاسد و زعمِ کاسد کے ساتھ کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے، بغیر اذن و مرضی حق کے کارآمد نہیں ہوگا، جو چیز کہ نفع دے گی وہ یہی عبادتِ خالص و توحیدِ مفرد ہوگی جو کلمہ اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد عبده و رسوله ثابت ہے، جو شخص اس کلمہ کے معنی پر چلا، اس کے مقضیٰ پر عمل کیا، وہی مومن موحدا و محسنِ مخلص کہلایا اور جس کا قول و فعل حال و خیال اس کے معنی و مقضیٰ کے خلاف ہو وہ مشرک کا فرہو یا مبتدع ضال!

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَكِن أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَقَّعُكُمْ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ أَقِمَّ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِن الظَّالِمِينَ وَإِن يَمَسُّكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْخَوُّرُ الرَّحِيمُ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَمِن نُّورِهِ قَمِينَ اهْتَدَىٰ قَائِمًا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهِ مَا آتَاكُمْ بِتُوكِيلٍ وَاتَّبِعْ مَا يُؤْتِيكَ الْبَيْتِ وَأَصْبِرْ لِحُكْمِ اللَّهِ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ

صَالِحَات

”إِنَّ الدِّينَ أَمْنٌ وَعَمَلٌ وَالصَّالِحَاتُ
لَتَدْخِلَنَّكُمْ فِي الصَّالِحِينَ“ (پہلے ۱)

راہِ خدایکے مسافر، طریقِ طلب اور راہِ سفر کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) اصحابِ بحث و افکار جنہیں حکما و عقلا کہا جاتا ہے، اور (۲) اصحابِ کشف و ابصار جو عرفا و اولیاء کہلاتے ہیں۔ اہلِ بحث و نظر مقدمات کی ترکیب، دلائل و برہان کی تقریر، اور نظر و استدلال سے حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ممکن کے وجود سے واجب کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، مصنوعات سے صانع کا، مخلوقات سے خالق کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ حکما و متفکرین کی جماعت ہے۔ ان کا طریقہ گو محمود ہے، لیکن نظر و استدلال کا انجام حیرتِ مذموم کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی حیرت کو ”حیرتِ نظار“ سے تعبیر کیا گیا ہے، جو تصادمِ شکوک و تعارضِ دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے۔ اس کے برخلاف اصحابِ کشف و ابصار بھی ایک قسم کی حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کو حیرتِ ادلی الایصار کہا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہوتا ہے مشاہدہ و حدائیت والوہیت کا، آثار و عجائب ربوبیت کا، توالی تجلیات کا، اور یہ حیرت محمود ہے۔ ”رَبِّ زِدْنِي قِيَامًا تَحِيْرًا“ کی دعا، اسی حیرتِ محمودہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب اسلام کے نام لیوا حکما و متفکرین، فلاسفہ یونان کے اتباع میں انبیاءِ علمیم الاسلام کے عقائد سے اختلاف کرنے لگے ہیں تو وہ بقول شاہ ولی اللہ قدس سرہ کثوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کتنے بھی پرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتے، اور یہ احمق دو ہزار سال کی پرانی ہڈیوں کو اب تک جھجھوڑنے میں لگے ہیں! ان کی ضلالت و گمراہی کا سبب ان کی ”عقلِ ناقص“ کے سوا کچھ نہیں۔

وَفَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

مصطفیٰ اندر جہاں انگہ کے گوید ز عقل آفتاب اندر فلک انگہ کے جوید سہما

اہل کشف و بصیرت وہ ہیں جو تصفیہ باطن، تخلیہ تخیل، کمال عقل، اور دوام توجہ سے ہتھکے مقصود کو پہنچتے ہیں "وہو الوصول الی معرفۃ اللہ ولقاءۃ" انہیں صراطِ مستقیم کے جاوہ پیمانہ کہا جاتا ہے، اور یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ کامل ملتِ حنیفیہ و دینِ مصطفویہ پر (صلوات اللہ علیہ و علیہم اجمعین) یہ گروہ مقدس اُن ہستیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی خود حق تعالیٰ نے ثنا کی ہے (مُحَمَّدٌ وَآلُ مُحَمَّدٍ) اور حضرت الوہیت سے ان کی تائید کی جاتی ہے (أَوْلَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَ لَهُم مِّن دُونِهِ) یہ خدائے علم نزل و لایزال کے پسندیدہ بندوں کا طبقہ ہے (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) یہ اپنے خالق کے وجود کا ادراک مقدماتِ عقلیہ قائم کیے بغیر کیلتے ہیں، اور حق کو نور حق ہی سے پہچانتے ہیں (أَقْسَمُ بِشَرَحِ اللّٰهِ صِدْقَهُ لَلِاسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْبٍ مِّن رَّبِّهِ) انہیں نظر و استدلال کی حاجت نہیں ہوتی! بنیاد کو رنگوں کے ادراک میں نظری دلیلوں سے کام لینے کی کب ضرورت ہوتی ہے (إِنِّي اللّٰهُ شَكُّ فَا طِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) چنانچہ کسی نے حضرت جتید سے پوچھا کہ وجودِ صانع پر تمہاری کیا دلیل ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "القد اغتنی الصباحُ عن اللصباح" مجھے دن کی روشنی نے چرخ کی روشنی کا محتاج نہیں رکھا ہے

حق راز حق شناس نہ از محبتِ مقياس خورشید را چه حاجتِ شمع است و مشعلہ (جانی)

یہ مقدس ہستیاں درجہ کمال پر فائز ہوتی ہیں، انہیں مکتبِ خانہ و علمناہ من لدنا علمناہ سے سبق ملتا ہے، یہ شکوک و اوہام سے آزاد ہوتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے علوم کی وارثان کی تعریف میں کسی نے کیا خوب کہا ہے :۔

آہنا کہ ربودہ است اند	از عہد است باز مستند
در منزل در دستہ پابند	در دادن جاں کشادہ دستند
چالاک زوند پس بیک گام	از جوئی حدوٹ باز جستند

فانی ز خود بد دست بانی
 این طرفہ کہ نیستند و ہستند

این طائفہ انداہلِ توحید
 باقی ہمہ نوشتن پرستند

یہ بزرگ ہستیاں طہارتِ فطرت پر ہوتی ہیں، دریا کے توحید میں غرق ہوتی ہیں، خلق نے جو کچھ
 حکایت سنا کر وہ اپنی بصیرت کے نور سے دیکھتی ہیں، خلق کے لیے جو "غیب" ہے، ان کے لیے شہادت
 ہے۔ چنانچہ عارفِ رومی نے ان کے اس کمال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

دفرِ مصوفی سوادِ حرفِ نیست
 جز دلِ اسپید، پتھرِ پرفِ نیست

زادِ دانشمند آثارِ مسلم
 زادِ صوفی چیتِ اسرارِ قدم

انچہ تو در آئینہ بینی عیاں
 پیراندر خشتِ بندیش از ازاں

دردِ دلِ انگور می را دیدہ اند
 درنسا، محض شیخ را دیدہ اند

لیکن ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں، اور ان کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی، وہ گم نام ہوتی ہیں، اور زاویہ
 گنہامی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی صاحبِ کمال ہستی سے
 اخذ فیض کا ہمیں کچھ موقع مل گیا، یہ محض فضلِ یزدانی و موہبتِ ربانی ہے کہ ہم ان کے کچھ ارشادات
 عالیہ کو یہاں پیش کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان ارشادات کا تعلق مرتبہ صاحبیت سے ہے۔

حق تعالیٰ نے صاحبین کے دو وصف بیان فرمائے ہیں ایمان و عملِ صالح۔

ان الذین امنوا و عملوا الصالحات لندخلنہم فی الصالحین (۲۹-۶-۱)

ایمان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ ذات
 اللہ ہی کو اللہ قرار دینا، یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا
 توحید ہے، توحید ایمانی ہے اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید
 داخل ہوتی ہے جس ذات پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کی رسالت کے اقرار و
 تصدیق سے دل سے کفر نکلتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں ہیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

رسالت اور صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ کی الوہیت کی تصدیق ہے۔ توحید میں حق تعالیٰ کی عبودیت اور بوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت واستعانت کی تصدیق داخل ہے۔

اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک "نفاق" ہے، جس کا نتیجہ لہدی جہنم ہے۔

"وَعَدَا اللّٰهُ لِلنّٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَالكٰفِرِیْنَ اَنْ یَّجْعَلَ لَہُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا" (پ ۶ ع ۹)

اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے جس کا نتیجہ خلود نار و حبط اعمال ہے۔

وَمَنْ یُّرْتَدِْ مِنْكُمْ عَنِ دِیْنِہِ فِیْمَتٍ وَهُوَ کٰفِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُہُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ہُمْ فِیْہَا خٰلِدِیْنَ (پ ۶ ع ۱۲)

ارتداد، شرک کی طرح دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لیے ناقابلِ معافی!

کفر و شرک، نفاق و ارتداد بڑے جرائم ہیں، سخت گندگی و نجاست ہیں۔ ان سے قلب

کی تطہیر ضروری ہے۔ یہ تطہیر ان سے توبہ اور لا الہ الا اللہ کے اقرار و تصدیق ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہی وہ

علم ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخر الزماں (علیہ الصلوٰۃ

والسلام) تک پیش کیا ہے اور دعا کی ہے، کہ:-

"اللّٰهُمَّ تَوَقَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَالْحَقْنَآ بِالصّٰلِحِیْنَ غَیْرِ خِزَیَا وَلَا مُفْتَوِیِّیْنَ"

ایمان محض تصدیق قلب کا نام ہے، اور اعمال جو ارجح اس میں داخل نہیں ہیں۔ امور ذیل

پر غور کرنے سے یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۱) ایمان لغت میں تصدیق یا صحابہ کو کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ برادران یوسف علیہ السلام

کی زبان سے فرماتے ہیں:-

وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَاَلَوْ كُنَّا

گو ہم سچ ہی کیوں نہ کہتے ہوں آپ کو تو بھاری بات کا

صدیقین

یقین آنے کا نہیں

(۲) خود حق تعالیٰ ایمان کو فعل قلب قرار دیتے ہیں:-

مَنْ کَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖ اَلَا

جو شخص کفر چھوڑ کیا جائے، مگر اس کا دل ایمان کی طرف

مَنْ أَكْبَرَهُ وَقَلْبُهُ مَطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ
 وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكَفْرِ صَدْرًا
 فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ وَ لَهُمْ
 عَذَابٌ عَظِيمٌ (پہا ۲۰ ع)

سخت عذاب ہوگا۔

یہاں قلب کو طرفِ ایمان قرار دیا جا رہا ہے اور ایسے شخص کو کفار کے زمرہ میں سے نکال لیا جا رہا ہے جو جو چہرہ و اکراہ کے سبب سے اعمالِ ظاہری کی پابندی کو چھوڑ دیتا ہے، مگر دل سے مسلمان ہے اور موردِ غضبِ خداوندی وہی شخص قرار دیا جا رہا ہے جس کے دل نے خوشی سے کفر کو قبول کر لیا ہے۔
 (۳) قرآن کریم میں اکثر جگہ اعمالِ نیک کی جزا اور ثواب کے لیے ایمان کو شرط ٹھہرایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ شرطِ مشروط سے خارج ہوتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمالِ ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مَن ذَكَرَ أَوْ
 إِنَّمَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ
 الْجَنَّةَ وَلَا يظَلَمُونَ (پہا ۱۸۶ ع)

جو شخص کوئی نیک کام کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت
 بشرطیکہ وہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل
 ہونگے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مَن ذَكَرَ أَوْ
 إِنَّمَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ
 الْجَنَّةَ وَلَا يظَلَمُونَ (پہا ۱۸۶ ع)

جو شخص کوئی نیک کام کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت
 بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو بالطف
 زندگی دینگے، اور ان کے اچھے کاموں کے عوض میں
 ان کا اجر دینگے۔

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيًا
 وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ
 مَشْكُورًا (پہا ۲۶ ع)

جو شخص آخرت کی نیت رکھیگا اور اس کے لیے جیسی
 سعی کرنا چاہیے ویسی سعی کریگا بشرطیکہ وہ شخص مومن
 بھی ہو تو ایسے لوگوں کی سعی مقبول ہوگی۔

(۲۶) حق تعالیٰ گنہگاروں کے لیے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں:-

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ
 لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ
 الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ

آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے آپ پر
 زیادتیاں کی ہیں تم خدا کی ذات سے ناامید مت ہو
 بالیقین خدا تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا، واقعی وہ

(پ ۲۲۳-۲۲۴) بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

ہست سی آیتوں میں مغفرت و نوب کی نوید ہے، اس کے برخلاف کفر کے لیے عذابِ مخلد کی

وعید ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ صَدُّوا عَن سَبِيلِ
 اللَّهِ ثُمَّ مَا تَوَّأَوْا وَهُمْ كَافِرًا فَلَنُيَغْفِرَ
 اللَّهُ لَهُمْ (پ ۸۶۲۶)

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے اللہ کے
 راستے سے روکا، پھر وہ کافر ہی رہ کر مر گئے، سو خدا نے
 تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا۔

اگر اعمال داخل ایمان ہوتے اور ان کا نہ کرنا داخل کفر، تو ان کی نسبت بھی بصورتِ عدم
 تعمیل، کفر کی طرح عدم مغفرت اور دوام عذاب کی وعید ہوتی نہ کہ مغفرت و رحمت کی نوید!

۵) حق تعالیٰ نے دو صاحب تصدیق قتال کرنے والے گروہوں کو یوں کہہ کر یاد فرمایا ہے:-

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا
 فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغْتِ أَحَدُهُمَا
 عَلَى الْآخَرِي فَقَاتِلُوا الَّذِي تَبَغَّىٰ حَتَّىٰ
 تَبْغِيَ إِلَىٰ آلِهِمُ اللَّهُ فَإِن قَاتَلَا فَاصْلِحُوا
 بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
 الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ
 فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ
 لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (پ ۱۳۶)

اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان کے درمیان
 اصلاح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی
 کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہے یہاں تک کہ وہ
 خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے، پھر اگر رجوع ہو جائے
 تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو،
 اور انصاف کا خیال رکھو، بیشک اللہ انصاف والوں کو
 پسند کرتا ہے، مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں
 کے درمیان اصلاح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ

اگر اعمال جزو ایمان ہوتے تو اس باہمی قتال سے دونوں کافر ہوتے ان کو یوں نہ کہا جاتا، نہ

ان میں صلح کرانے کی یہ وجہ بیان کی جاتی کہ مسلمان باہم بھائی ہیں۔
 ان آیاتِ بینات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہے کہ اعمالِ ایمان میں داخل نہیں۔
 حق تعالیٰ نے صلح اسی شخص کو کہا ہے جو ایمان بھی رکھتا ہو اور عملِ صلح بھی کرتا ہے۔ اب عملِ
 صلح کے معنی کا تعین ضروری ہے۔

عملِ صلح کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ صواب: یعنی عمل کا موافق سنت
 صحیحہ کے ہونا۔ اخلاص: یعنی شرکتِ غیر اللہ سے پاک و صاف ہونا۔ نیت صحیحہ
 وہی عملِ صلح ہوگا جو موافق سنت صحیحہ ہو اور نیت صحیحہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے امتثال میں
 اپنی کی رضا و خوشنودی کے لیے کیا جائے۔ ان تین خصوصیات کو اجمالی طور پر خوب سمجھ لو۔

۱۔ نیت کے متعلق جو اصول حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے:
 "أَمَا الْعَمَلُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى" آگے مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی
 ہے: "فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهِيَ هِجْرَةٌ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا
 أَوْ إِلَى نِسَاءٍ أَوْ إِلَى بَنِيهَا أَوْ إِلَى أَمْوَالِهِ أَوْ إِلَى أَسْرَائِلِهِ أَوْ إِلَى شَيْءٍ مِمَّا يَدْرِكُونَ فَذَلِكَ هِجْرَةٌ لَمْ يَكُنْ هَاجِرًا
 إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ" پھر جس نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی، اس کی ہجرت اللہ
 اور رسول کی طرف ہوئی اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کی جو اس کو بیگی یا کسی عورت کی طرف جس
 سے وہ نکاح کرے گا تو یہ ہجرت اسی کی طرف ہوئی۔"

یہ حدیث اصولِ دین میں سے ایک عظیم الشان اصل ہے، ارکانِ اسلام میں سے ایک متمم
 بالشان گن ہے۔ اسے اعمال کا نیت ہی پر دار و مدار ہے۔ بے نیت کے کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، نہ
 اس کا کچھ اعتبار ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے، یعنی دوسری کتب حدیث کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم)
 میں بھی ہے۔

ب۔ اخلاص کے متعلق حضور انور کا یہ ارشاد بہت واضح ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اخْلَصُوا أَعْمَالَكُمْ فَإِنَّ اللَّهَ يُبْغِضُ الْفَاسِقِينَ

تبارك وتعالى لا يقبل من الاعمال الا

کے لیے کرو کیونکہ حق تعالیٰ عملِ خالص کے سوا

ما اخلص (رواہ البزار عن الضحاك بن قيس) کوئی عمل قبول نہیں کرتے۔

جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ

نصیحت فرمائیے، تو ارشاد ہوا:-

اخلص دينك يكتفيك العمل القليل تو اپنے دین کو خالص کر، تجھے تھوڑا سا عمل کفایت

(رواہ الحاکم) کریگا۔

عمل جب حق تعالیٰ ہی کے امر کے اقتال میں اور ان ہی کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے اور اس سے انہی کی ذات مقصود ہوتی ہے تو وہ "خالص" ہوتا ہے اور ایسا ہی عمل "صالح" کہلایا جاتا ہے۔

ج۔ صالح ہونے کے لیے عمل کا مطابق کتاب و سنت ہونا ضروری ہے۔ من احدث في

امرنا هذا ما ليس منه فهو رد (اخرجه الشيخان) اس پر نص ہے یعنی جو شخص دین کے کام میں وہ چیز

نکالنا ہے جو اس میں نہیں وہ مردود ہے۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا گیا ہے: من صنع امر اعلیٰ غیر ما نفعہ

(رواہ ابو داؤد) ایک اور طرح بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو رد (رواہ مسلم)

ان نصوص سے ظاہر ہے کہ جس کام کے کرنے کا دین میں حکم اور اذن نہ ہو وہ کام دین میں

بدعت ہے، گو یہ کام بظاہر کیسا ہی اچھا کیوں نہ نظر آئے! جب اسلام میں اعمالِ صالحہ و افعالِ حسنہ

بے حدود بے شمار ہیں تو ان اعمالِ ثابتہ کو چھوڑ کر افعالِ مستحدثہ کو اپنا دین ٹھہرانا عقل کا ہیضہ نہیں تو

کیا ہے! "بہتر بات تو خدا کی بات ہے، بہتر ہدایت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے اس کے

بدتر کام وہ ہیں جو نئے نکالے گئے ہیں۔ ہر بدعت گمراہی ہے" (عن جابر)

بدعت بھی عجیب بلا ہے۔ دیکھو گنہگار یا فاسق خواہ وہ کتنا ہی بد کردار کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ

سمجھتا ہے، جی میں اس کام کو برا جانتا ہے گو ٹنڈے سے نہ کہے، اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ جس چیز کو برا جانتا ہے

اس سے کسی روز توبہ کر لیگا! لیکن صاحبِ بدعت کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن

سمجھ کر کر رہا ہے! حضرت ابن عامر نے حضرت ابو بکرؓ سے مرفوعاً جو حدیث روایت کی ہے وہ اس روز

کے تجربہ کو عجیب و غریب طریقہ سے ظاہر کرتی ہے :-

”ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کا مرتکب کر کے ہلاک کر دیا اور انہوں نے مجھے گناہ سے توبہ کر کے برباد کیا۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو پھر میں نے ان کو بوٹی و بدعت میں مبتلا کر کے ہلاک کیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق پر ہیں اس لیے استغفار نہیں کرتے، اس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں“

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ :-

”کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار!“

ایمان اور عمل صالح کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد اب مومن لامعبود الا اللہ کے شغلیں میں مشغول ہو جاتا ہے اور جملہ معبودانِ باطل کی قلب سے نفی کرتا ہے اور یہ معبودانِ باطل اس کے حق میں تین ہیں :- دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی۔

لامعبود الا اللہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ کے سوا میں امورِ دنیا میں سے کسی کا مطیع و منقاد نہیں جب بھی امورِ دنیا سے کوئی خطرہ میرے قلب میں آتا ہے تو میں حق ہی کی حولِ قوت سے اس کی نفی کرتا ہوں اور لا الہ الا اللہ کی تلوار سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں، میرا عمل میری ہر حرکت حق تعالیٰ کے امر کے اقتال میں ہوتی ہے اور میرے تمام جذبات احکامِ الہیہ کے پابند ہوتے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں، میرا کوئی عمل اسی وقت صالح یا قابلِ قبول ہوگا جب میں حق تعالیٰ ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے اُن ہی کے بتلائے ہوئے طریقے سے اس کو انجام دوں !۔

اسی طرح میں خلق کو اپنے کسی عمل میں شریک نہیں کرتا، ریا و سمعہ کا کوئی خطرہ جب میرے قلب میں خطو کرتا ہے، عمل کے وقت جب کسی مخلوق کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو یہ جان کر کہ ایسی حالت میں حق تعالیٰ کی بچائے یہی میرا معبود بن جاتا ہے، لا الہ الا اللہ کی تیغ سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں۔

اسی طرح جب عمل کے وقت نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش، جاہ و عزت، خود نمائی، عجب و کبر یا کسی لذتِ نفسانی کا گزر میرے قلب میں ہوتا ہے تو صاف طور پر یہ جان کر کہ ہر چہ در بند

آنی بندہ آئی اور حق تعالیٰ کی اس تہدید کا خیال کرنے کے کہ: "أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ" میں لا
 اللہ الا اللہ کی تلوار سے ان تمام خطرات کی نفی کرنا ہوں تاکہ ماسوی اسٹڈ کی عبادت کی ذلت سے پوری
 طرح نجات پاؤں! مجھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بددعا یاد آتی ہے جو انہوں نے اُس شخص کے
 حق میں کی تھی جو مال و دولت کو عمدہ لباس و شہرت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور جس کا سارا عمل
 ان ہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

نفس عبد اللہ ینا رو نفس عبد اللہ مرہم و نفس عبد الحمید صیر و انتکس و اذا شیک فلا انتقش!

"تباہ ہوا اشرفی کا بندہ اور روپیہ کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ (یعنی جو رات دن بس انہی کی طلب اور فکر میں

رہے) منہ کے بل گرے پھر سر کے بل الٹ جائے، اور جب اس کے کانٹا چبھے تو کوئی اس کا کاٹنا نہ

نکلے (راتنی بھی بددندہ کرے کیونکہ وہ بندہ زہر ہے)"

جب میرے قلب پر سے ان معبودانِ باطل کی حکومت کا بل طور پر اٹھ جاتی ہے اور سریرِ دل پر صرف
 حق تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور میرے تمام جذبات اوامرِ الہیہ کے پابند ہو جاتے ہیں تو میں آزادی
 و حریت کا وہ ذوق محسوس کرنے لگتا ہوں جو ہفت کشور کے بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہو سکتا!

عارفِ رومی نے اسی حلاوت کو محسوس کر کے فرمایا ہے: ہ

گر تو خواہی حری و دل زندگی بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی مقصود بہر بندگی است زندگی بے بندگی شرمندگی است

ہرگز اندر عشق یابد زندگی کفر باشد پیش او جز بندگی

ذوق یابد تا دید طاعات بر مغز یابد تا دید دانہ شجر!

عبودیت ہی حریت کا اصلی سبب ہے، حریت کیا ہے؟ "هو انقطاع الخاطوع عن تعلق ماسوی

اللہ تعالیٰ بالکلیہ!" سچی آزادی اس انسان کو نصیب ہوتی ہے جس نے اغراضِ نیادی و خواہشاتِ نفسانی

سے اپنے قلب کو آزاد کر کے حق تعالیٰ سے بندگی و افتقار کی نسبت جوڑ لی ہے! حریت نہایت عبودیت کا

نام ہے "آزادگی بے بندگی" نہیں ہے کہ بستگانِ کندہ تو رستگار بندہ (حافظ) و نعم باقیل۔

خواہگی را خواہگی از بندگی ست بندگی کردن کمالِ خواہگی ست!

من ازاں روز کہ در بند تو ام آزادم بادشاهم کہ بدست تو اسیر افتادم!

لا الہ الا اللہ کے معنی اول لا معبود الا اللہ کے ہیں۔ عبادت کے معنی غائت تذل و افتقار کے ہیں۔ زندگی کو جی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کے ہیں۔ زندگی کی ہر حرکت امتثال امر الہی میں ہو، ہر فعل کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہو یعنی مقصود و محبوب اللہ ہی ہو! لا مقصود الا اللہ، لا محبوب الا اللہ یہ ہیں دوسرے معنی لا الہ الا اللہ کے۔

لا الہ الا اللہ یعنی لا معبود الا اللہ کے شغل سے سالک کے قلب سے دنیا، خلق اور ہوسے نفسانی یا جذبات کا تسلط اٹھ جانا ہر لیکن باطن میں حق تعالیٰ کے سوا اور مقصود موجود رہ سکتے ہیں جن کا لا مقصود الا اللہ کے شغل سے دور کرنا ضروری ہے، یہ مقاصد بھی تین ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ ۱: بہشت و ما فیہا من اکور و القصور۔ ۲: مقامات کشفی مثلاً کشف قبور، کشف قلوب، یا کشف بلا وغیرہ۔ ۳: تجلیاتِ قرنی۔

مقصود حقیقی حق تعالیٰ ہوں تو جنت بھی بالذات مطلوب نہیں قرار پاتی ہے۔ اگر جنت کا سوال

کیا جائے تو محض اس بنا پر کہ وہ نحل دیدار محبوب ہے ۶

عاشقان جنت ہر لئے دوست می دارند دوست!

و رضوان من اللہ اکبر سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضائے حق کو جنت سے اکبر قرار دیا گیا ہے۔

نہ ہی مقصود وہ مقامات کشفی ہیں جو اولیاء اللہ کو تبعا حاصل ہوتے ہیں جیسے کشف قبور یا کشف قلوب،

یا کشف بلا۔

اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جنت کی طلب ایمان یا کمال ایمان کے منافی ہے۔ انبیاء الطہیم السلام خصوصاً سید الانبیاء، رضی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کمال کون ہو گا۔ باہر ہمہ قرآن و حدیث میں ان حضرات کی جو دعائیں نقل کی گئی ہیں ان میں جنت کا سوال بار بار کیا گیا اور دوزخ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ البتہ بندہ مومن کا اصلی اور اولیٰ محبوب و مطلوب پس حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا ہی ہونا چاہیے۔ "وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ"۔

دریں منزل بود کشف و کرامات و لے باید گزشتن زان مقامات

نہی وہ تجلیاتِ قرنی مقصود ہیں جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہیں مثلاً ولایت و خویشیت و تطہیرت وغیرہ،

مقصود صرف ذاتِ حق ہے، ان کا حضور ان کا ذکر ان کی فکر ان کی یاد ہے

یارب ز تو آنچه من گدایم طلبم افزوں ز ہزار پادشاهی طلبم

ہر کس ز تو حاجتی می خواہد من آیدہ ام ز تو ترا می طلبم

اس شغل کے تسلسل سے حق تعالیٰ کی محبت دل پر ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ ایک لحظے کے لیے بھی ان کے

غفلت نہیں ہوتی، اور اس کا یہ حال ہو جاتا ہے:۔

از بس کہ خیالت بہ نظر می دارم

در ہر چہ نظر کنم توئی پس دارم

یہ مقام تلوین ہے، یہاں عاشقوں کے قلب و زبان سے فریاد نکلتی ہے، حال طاری ہوتا ہے، لیکن وہ

اس حال سے ترقی کرتے ہیں اور محض رضا کے حق ان کا مطلوب ہو جاتا ہے جس حال میں رکھیں

اس سے راضی رہتے ہیں، ہجر و وصال دونوں سے راضی ہو جاتے ہیں۔

معتوقہ کہ شد بجا ما عائق من گفتا کہ نہ بہ عاشقی لائق من!

وصل است ز من کام تو آئےستی تو عاشق کام خویش لے عاشق من

اب ہر فعل و حرکت میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں، حق تعالیٰ کے جملہ افعال و احکام میں سے کسی

فعل یا حکم پر جو خود ان کی جان پر یا جہان پر جاری ہو جاتا ہے۔ کوئی اعتراض نہیں کرتے، اور

ہر چہ از دست می رسد نیکو است

کہہ کر تسلیم خم کر دیتے ہیں! توافق بالقضاء، اعراض عن الاعتراض ان کا شعار ہو جاتا ہے، مرض ہو یا

خلاف نفس کوئی چیز ہو اپنے محبوب کے حکم اور اس کی مشیت کا اس کو نتیجہ سمجھ کر اس سے معذور و خوش وقت

ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے ایسے وقت بس ہی نکلتا ہے، کہ

عاشقم بر من خویش و درد خویش! بہر خوشنودی شاہ فرد خویش!

اور عارفِ روحی کے الفاظ میں اپنے یقین کا اس طرح اظہار کرتے ہیں : ۷

آن کے راکہ چنیں شاہے کشد سوئے بخت و بہتریں جاؤ کشد

نیم جاں بتاند و صد جاں دیدہ اچہ ذرہمت نیاید آن دیدہ

اور ہر حال میں رضوان کا مقام ہوتا ہے : ۷

زندہ کنی عطا کے تو در کبھی فدائے تو

جاں شدہ مبتلا کے تو ہر چہ کیتی اٹھائے تو

اب " لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ " کا یہ نفوسِ قدسیہ صحیح مصداق بن جاتے ہیں

رضی اللہ عنہم و رضوان (عنه) نتیجہ سے جذبات اور عقلی پرواز کو اوامرِ الہیہ کے تابع کرنے اور ان کو محمد

مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں قربان کر دینے کا ہے

ایں راہِ طریقت زبانی عقل است خاکِ قدم عشق و رانی عقل است

سیرے کہ فرشتہ چوں از ایں بیخبر است لے غافل بے عقل چہ جائے عقل است (دلائل علم)

نیکی علم ہے

علمی کہ درو عمل بنا شد عار است

ہر سچہ کہ بے ذکر بود ز ناراست

ہر کس کہ بہ علم بے عمل می نازد

عالم نبود علمی مشعل در راست

سید علی حسینی

یونان کے شہر آفاق مفکر سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ یہ چھ اجلاسے تو ہیں یہی مشہور قول ہے:

کہ ”نیکی علم ہے اور بدی جہل“ اس سے سقراط کا بظاہر یہی مطلب ہے کہ اگر عمل صالح (نیکی) علم صحیح کا نتیجہ

ہے، اور علم صحیح تین کے درجہ میں عمل نیکی سے جدا و منفک نہیں، ان میں ایک ضروری لازمی

رابطہ پایا جاتا ہے، یہ لازم و ملزوم ہیں، سچ پوچھو تو ارباب علم کی تعریف ہی اس طرح کی جاسکتی ہے

الذین یعملون بما یعلمون یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔ ہر کتاب خواں و کتاب

داں عالم نہیں قرار دیا جاسکتا، وہ عالم نہیں، مسئلہ ذیالمسائل ہے۔ مسائل علمیہ کا حافظ اور

ان سے لذت اندوز ہونے والا ہے۔ عوام کا یہ تین مختلف ہے کہ ہر کرم کتابی کو وہ عالم سمجھتے ہیں، اعلیٰ

مشعل دار کو مینا جانتے ہیں، اور اپنے اس وہم کی تائید میں تحلیل محفل سے کام لیتے ہیں۔ اس مختصر

مقالہ کا مقصد اس بنیادی غلطی کا ارتقاع اور اس کی تائید میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان

کا ابطال ہے۔ ۶۔ یک تقیہ دماغی باید کرد۔

ذرا سقراط کے اس قول کو کہ ”نیکی علم ہے“ اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش

کہو، کیا علم صحیح عمل صالح کے لیے ضروری نہیں؟ کیا جہاز رانی کے لیے جہاز کی ساخت اور

اس کے کام سے واقف ہونا ضروری نہیں؟ اسی طرح حکمرانی کے لیے مملکت کی ماہیت و

مقصد و غایت کا جانتا لازمی نہیں؟ بالکل اسی طرح جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ نیکی کیا ہے،

جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ خصائلِ حسنہ کیا ہیں، تقویٰ کیا ہے، عفت و شجاعت کیا ہے، حکمت

لہ رواہ اللاری۔

عدالت کیا ہیں، اور ان کی ضد خصائل سیمہ کیا ہیں، کیا ہم نیک بن سکتے ہیں، تقویٰ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا ہے، ہم نیک بن سکتے ہیں!

یہاں تک تو عوام کو بھی سقراط کی رائے سے اتفاق ہو گا کہ جب تک آدمی کو نیکی کا علم نہ ہو وہ نیک نہیں بن سکتا، اس معنی میں قطعاً نیکی علم ہے، لیکن سقراط فطرت انسانی کا رازدار تھا، اس کی رائے میں فطرت انسانی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ شر کو خیر پر ترجیح دے، وہ قطعاً خیر ہی کا ساتھ دے گی۔ کیونکہ خیر ہی میں اس کا ذاتی فائدہ ہے، نفع ہے، بھلا ہے، خیر کے ہم سب عاشق ہیں، خیر ہی ہمارا محبوب ہے، ہم سب اسی کے پروانے ہیں، یہ ممکن ہے کہ جہل کی وجہ سے ہمیں شر خیر نظر آئے، شر کو ہم خیر سمجھنے لگیں اور اس ظلم باطل کی وجہ سے شر کا ساتھ دیں اور اس کو اختیار کریں، لیکن یہ ہماری فطرت کا قصور نہیں، یہ ہمارے ارادہ کا نقص نہیں، یہ ہمارے ظلم کا قصور ہے، جہل کی تاریکی میں ہمیں خیر کے صحیح ضد و خال نظر نہیں آتے اور ہم سراب کو آب سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر گرتے ہیں، اسی لیے ”بدی جہل ہے“ اور صرف جہل ہی بدی ہے، اور جہل نام ہے علم صحیح کے فقدان کا! جہل میں بھی جو علم نظر آتا ہے وہ علم صحیح نہیں، دھوکہ ہے اور اس کا عالم حائر نہیں جاہل ہے!

اگر فطرت انسانی کے متعلق سقراط کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں اس کا یہ قول ماننا ہی پڑتا ہے کہ ”کوئی شخص ارادہ بد نہیں“ کوئی شخص ارادہ شر کو اختیار نہیں کرتا، اور جب وہ دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوتا ہے، تو بڑی بڑی برائی پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جب وہ چھوٹی بڑائی کو چن سکتا ہے، اور میں یہ بھی ماننا پڑتا ہے جہل ہی کی وجہ سے ہم شر کو اختیار کرتے ہیں، گناہ میں ٹپتے ہیں، لہذا جہل ہی گناہ ہے، بدی ہے۔ جہل سے مراد یہاں عدم علم نہیں بلکہ سفاہت یا حماقت ہے۔ اس لیے جاہل ایک معنی میں عالم کہلایا جا سکتا ہے، لیکن ہر معنی میں وہ احمق ضرور ہے۔ عوام جنہیں اپنی رائے میں عالم قرار دیتے ہیں وہ حقیقی معنی میں سفیہ یا احمق قطعاً ہوتے ہیں، وہ خیر کی ماہیت سے جاہل ہوتے ہیں، اپنے نفع و ضرر سے بے خبر ہوتے ہیں، وہ مائتہ کے بطون سے واقف نہیں ہوتے، وہ

مظاہر کے حسی علم میں گرفتار ہوتے ہیں، وہ اصل میں مست خواب ہوتے ہیں، لیکن خواب میں اپنے کو بیدار سمجھتے ہیں۔ ۶۔ ختمہ دائم خویش را بیداری بیند خواب۔ (صائب)

جذبات سے زیادہ جمل کی صورت کوئی اور شے نہیں۔ اسطو نے سقراط کے اس قول پر جو تنقید کی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اسطو کی رائے میں انسان کے اکثر اعمال پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے، ان کی محرک شہوتیں ہوتی ہیں، عقل یا علم صحیح نہیں، عمل جذبات کے تابع ہوتا ہے، اور جذبات اسطو کے الفاظ میں ”روح کا غیر عقلی حصہ ہوتے ہیں“ سقراط کا عمل اس کی عقل کا تابع تھا، اس نے خیال کیا کہ شخص کا عمل اسی طرح عقل کا تابع ہوتا ہے، اسی لیے اس نے نیکی کو علم قرار دیا، لیکن روح انسانی کے غیر عقلی حصے، جذبات اپنی قوت و شدت کے لحاظ سے مردانگیں ہوتے ہیں، اور انہی کا تسلط انسان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے، یہ عقل و حکمت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، ان کا پیدا کروہ عمل بھی علم اور نیکی سے جاری ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان راہ مستقیم کو جاننے کے باوجود بھی جذبات کے زیر اثر مگر ایسی اختیار کرتا ہے، ہاتھ میں شمع رکھنے کے باوجود چاہ میں گر جاتا ہے وہ اعمی اشعل دار ہے“ چارپائے ہر دو کتابے چند“ کا مصداق ہے، زبان سنت میں ”علم باللسان“ اور جاہل بالقلب“ ہوتا ہے، اس کے وجود ہی سے حافظ کی یہ مشکل پیدا ہوتی تھی۔

مجلس دارم زدا نشند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتری کشند

اسطو کی اس تنقید سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیکی محض علم ہی نہیں، ہر عالم مرد صالح نہیں، علم کے باوجود انسان کا نیک کردار بن جانا ضروری نہیں، جذبات اس راہ کے مزاحم ہیں۔

میان بیل و پروانہ فرق بسیار است
کجا بر حیرت کرداری رسد گفتار!

سقراط کا یہ کتنا صحیح ہے کہ علم یا بصیرت نیکی کے لیے قطعی ضروری ہے، اس کے بغیر نیکی کی راہ نہیں ملتی۔ لیکن اسطو کہتا ہے کہ محض علم ہی کافی نہیں، ارادہ بھی ضروری ہے، علم کا استعمال ہونا چاہیے، اس کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے، مجاہدہ سے عمل آسان ہوتا ہے، عمل کی تکرار سے عادت

قائم ہوتی ہر عمدہ عادتوں کے قیام ہی سے انسان نیک بنتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ۶
چند روز جسد کن باقی بچند!

اسطو کی تنقید جواب نظر آتی ہے، لیکن سقراط کی بات پر غور کرو، شاید بالآخر تم اسی کی
بات سے اتفاق کرو گے، تم کہتے ہو کہ عالم بے عمل کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ محض علم نکی
نہیں جس کا دعویٰ سقراط کرتا ہے، انسان کو علم و یقین ایک بات کا ہوتا ہے اور وہ عمل اس کے
خلاف کرتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا یہ علم یقین کس پایہ کا ہے، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو لوگ
دوسروں کو ترک دنیا کا سبق دیتے ہیں، اور خود سیم و غلہ جمع کرتے ہیں، ترک دنیا کے قائل ہیں،
اس پر یقین رکھتے ہیں، ان کا قلب اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے؟ وہ خود بھی شاید یہ سمجھتے
ہیں کہ انہیں اس پر یقین ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں یقین صرف اسی چیز کا ہے جس پر وہ عمل
کرتے ہیں، اگر انہیں روحانی اقدار کی حقیقی قیمت کا یقین ہوتا تو وہ قطعی اسی کی تلاش کرتے
اور حطام دنیوی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، انسان کی فطرت ہی میں یہ داخل ہے کہ وہ
اپنا بھلا چاہتا ہے، فائدہ کی تلاش کرتا ہے، اور نقصان یا ضرر سے بھاگتا ہے، میں جانتا ہوں کہ
آگ پر انگلی رکھنے سے شدت کی سوزش ہوتی ہے، اس لیے میں آگ کے قریب نہیں جاتا،
اگر اسی قسم کا یقین مجھے ہو جائے کہ آخرت قابل ترجیح ہے، کیونکہ یہی باقی رہنے والی ہے تو پھر میرے
لیے یہ ناممکن ہے کہ میں آخرت کی پروا نہ کروں اور ”تجربہ مستورہ دنیا“ کی نار برداری کرتا رہوں جیسا کہ
ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، جہل یعنی صحیح علم و یقین کے فقدان ہی سے شرکازن کتاب عمل میں آتا
ہے، اور بہر حال یہ نفسیاتی قانون صحیح ہے کہ ”عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم و یقین“ لہذا
عمل ہی سے حال و یقین ظاہر ہوتے ہیں، کسی شخص کے یقین کا پتہ چلانا ہو تو اس کا عمل دیکھا
جانا چاہیے نہ کہ محض قول، خود اس شخص کو اپنے یقین کی کیفیت اس کے اپنے عمل ہی سے معلوم
ہوتی ہے، نفس کے دھوکوں کا حال عمل کے محاسب سے ظاہر ہو جاتا ہے، اور حال قابل اعتبار

لے ترک دنیا ہر دم آموزندہ: خوشن سیم و غلہ اندوزندہ۔

ہر نہ کہ قال، کردار پر تصفیہ ہوتا ہے نہ کہ محض گفتار پر۔

قدم باید اندر طسریقت نہ دم کہ اصلے نداد دم بے قدم

غرض یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر شخص اپنے علم و یقین کے مطابق ہی عمل کر رہا ہے تو سقراط کی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نیکی علم صحیح کا نام ہے، علم صحیح قطعاً عمل صالح پیدا کرتا ہے، انسان کو اپنے فائدہ کا علم اور اس پر یقین ہونے کے بعد اس کو اختیار کیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی بنی ہے کہ وہ خیر کی طرف راغب ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کو خیر کا علم ہو جائے اور خیر ہی کے علم کو صحیح معنی میں "علم" کہا جاسکتا ہے اور لقاے حق ہی سے دیدہ بینا حاصل ہوتا ہے۔

دیدہ بینا از لقاے حق شود حق کجا ہمراہ ہر احمق شود
(ردی)

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے "حکمت یونانیاں" سے حکمت ایمانیاں کی طرف رجوع کرتے ہیں، نور عقل و جس کو نور حق سے زمینت بخشتے ہیں۔

نور جس را نور حق تزیں بود معنی نور علی نور این بود (ردی)
نیکی علم ہے، کیونکہ علم کی اصل "خشیتہ اللہ" ہے (خوف خدا ہے) اذما یخشى الله من عباده العلماء (پہ ۱۹۶) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، اس لیے ابن مسعود وغیرہ نے کہا ہے کہ کفی بخشیتہ للہ علماً و کفی بالاعتزاز باللہ جهلاً جب علم خوف خدا کا نام ہے، کثرت روایت کا نہیں، معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں (لیس العلم بکثرة الروایة ولكن العلم خشية) تو ایسا علم قطعاً عمل کو درست کر دیتا ہے، یعنی اس سے نیکی پیدا ہوتی ہے، انسان صالح بن جاتا ہے اور اسی معنی میں کہا جاسکتا ہے کہ نیکی علم ہے، اور عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ من خشی اللہ فهو عالم ومن عصاه فهو جاهل۔ اس بنا پر ہم ہر کتاب خوان و کتاب دان کو عالم نہیں کہہ سکتے، امام شیعہ اپنے

لہ امام احمد نے معروف سے نقل کیا ہے۔

وقت کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں "تملذذ بالمسائل" (Intellectual
 Epicure) جو مسائل سے بحث میں تمہیں لذت ملتی ہے، اور یہی لذت تمہاری غایت
 ہے۔ عالم سے مراد عاقل باللہ فی اللہ عارف باللہ ہے، یعنی عالم وہ ہے جو عرفان حق و خوب
 خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے اور عمل کا مقصود اللہ ہی کی رضا و محبت
 کو قرار دیتا ہے۔

اسی علم نو زبان سنت میں "علم نافع" کہا گیا ہے اور اس کی وضاحت کی گئی ہے، یہ
 علم ایک نور ہے جو عالم کے حجابات کو رفع کرتا ہے اور اس کو عرفان حق عطا کرتا ہے، اسی
 علم کی وجہ سے وہ اپنے رب کی طرف راہ یاب ہوتا ہے، اس کو اپنے سے قریب، بلکہ اقرب
 پاتا ہے، اس کو حاضر و ناظر جانتا ہے، اس یافت قرب کی وجہ سے عالم کا اللہ سے
 بڑھتا جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں علاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرض عبودیت
 میں سرور و مسرت حاصل ہوتی ہے، اب اس کا مقصود حق تعالیٰ ہو جاتے ہیں، جان و
 مال، فرزند و زن سے وہ زیادہ عزیز و محبوب بن جاتے ہیں اور وہ انہیں مخاطب کر کے
 کہتا ہے:

خوابم کہ ہمیشہ در ہوئے تو زیم غلکے شوم و زیر پلے تو زیم
 مقصود من خستہ ز کونین توی از بر تو میرم و بے تے تو زیم (صحابی استرآبادی)

جب یہ تعلق عید میں اور اس کے رب میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح جان پہچان ہو
 جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے لیے کافی ہو جاتے ہیں کفی باللہ و کیلا! جو کچھ وہ مانگتا ہے
 اس کو ملتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ چاہتا وہی ہے جس میں ان کی
 رضا ہوتی ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہم کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر شے کا عوض حق تعالیٰ
 میں، لیکن ان کا عوض کوئی شے نہیں۔

لہ لئن سألتنی لاعطیتہ ولئن استعازتنی لاعینتہ۔

لكل شيء اذا فارقت عوض وليس لله ان فارقت من عوض

عارف رومی نے اسی مطلب کو اپنے سربلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے بادشاہ سے انس پیدا ہو جاتا ہے تو پھر سارے درد و غم کا اس کو علاج مل جاتا ہے اور اس کی طرف رخ کر کے وہ سارے جہان سے فارغ ہو جاتا ہے۔

آنکہ شد آسش بہ شاہ فرد خویش یافت در ماہنکے جملہ درد خویش

چوں از اقبال شیریں شد دہاں سر و شد بر آدمی ملک جہاں

جس کو یہ علم نافع عطا ہوتا ہے اس کو مزید تین چیزیں دی جاتی ہیں۔ قلب خاشع، نفس قانع اور دعا مسموع۔ جب اصل علم خشیتہ اللہ ہے تو علم کے ساتھ ہی خدا کا خوف بھی عالم کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے، وہ طالب دنیا نہیں رہتا، وہ طالب علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا، اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہم مصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں رکھتا، اس کو مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی آرزو نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسنؑ کے الفاظ ہیں وہ زاہد فی الدنیا، راعب فی الآخرة، بصیر بدینہ، مواظب علی عبادۃ ربہ ہوتا ہے یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف راعب ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ ہوتا ہے۔ دوسری روایت میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے الذی لا یحسد من فوقہ ولا یستخز من دونہ ولا یوخذ علی علم علیہ اللہ یعنی وہ کسی سے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا تمسخر نہیں کرتا اور اس علم کی وجہ سے جو اس کو اللہ نے سکھلایا ہے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا۔ یوں جو اس کا علم زیادہ ہوتا جاتا ہے، اللہ سے اس کا خوف، تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اہل العلم النافع کلتا از داد و من هذا العلم از دادوا اللہ تواضعاً و خشیتاً و انکساراً و ذلاً، عباد ابن عمر، علم میں خاک کی طرح غمسل

نے ہر چیز کا جو تجھ سے ہاتی ہے بدلہ ہے، لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا ہے تو اس کا کوئی بدلہ نہیں۔

دل و افتقار پیدا ہو جاتا ہے، کبر و فخر و عنوت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔
 در خاک بیلقاں بر سیدم بر عابدے گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن
 گفتا برو چو خاک تحمل کن لے حقہ یا سر چہ خواندہ ہمہ در زیر خاک کن
 علم نافع کا عامل اس فقر الی اللہ کی وجہ سے سارے عالم سے غنی ہوتا ہے وہ غنی ہوتا ہے
 نہیں وہ غنی عن اشئی ہوتا ہے، اس کا برگ و ساز قرآن عظیم ہے، اس کا قلب سوز و ساز، ذوق
 و شوق تسلیم و رضا سے مملو ہوتا ہے وہ سراپا صدق و اخلاص و نیاز ہوتا ہے، اس کے فقر کا
 کچھ حال اقبال کی زبانی سنو:-

چسیت فقرائے بندگان آب و گل	یک نگاہ راہ بین، یک زندہ دل
فقر کار خویش را سنجیدن است	بر دو حرف لا الہ الا اللہ است
فقر خیر بایران شعیر!	بستہ قرآن او سلطان میر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا است	ماہ سینیم این متاع مصطفیٰ است
فقر بگردو بیابان طبعوں زند	بر نوامیس جہاں شمعوں زند
برگ و ساز اوست قرآن عظیم	مرد درویشی نہ گنج در گیم

غرض وہ علم نیکی سے جس کی اصل خشیت اللہ ہے جو اپنے عامل میں قلب فاشع و نفس
 قانع پیدا کرتا ہے، اور اس کی وجہ سے دعا و سموع حاصل ہوتی ہے، اور جس شخص سے یہ علم
 نافع فوت ہو جاتا ہے وہ ان آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے
 پناہ مانگی تھی یعنی یہ علم اس پر وبال و محبت ہو جاتا ہے، اپنے علم سے وہ کوئی نفع نہیں پاتا، اس
 کا دل اپنے رب کے لیے نہ خشوع اختیار کرتا ہے، اور نہ اس کا نفس دنیا سے سیر ہوتا ہے، اور
 نہ اس کی دعا رخصی جاتی ہے، یہ علم نہیں جہل ہے اور تمام بدیوں کا مبداء، ہیں اس عارف
 کی تلاش ہے جو اپنی شمع سے محفل کو روشن کر دے اور ہمارے قلب سے کانٹوں کو نکال کر

اس کو گلشن بنادے ۵

عارف دل و جان تو معین سازد
 خاکے کہ کند بجائش گلشن سازد
 کامل ہمہ را ز نقص برول آرد
 یک شمع ہزار شمع روشن سازد

(قادری ہندوستانی)

تعلیم کا مقصد

گر جرحہ زجام معرفت زوش شود دین کشمکش ہوا فراموش شود
 قلب عارف زیر فلک کے گنجد کے دریا را حباب سرپوش شود (صحابی استرآبادی)

نزول کے اعتبار سے قرآن مبین کی سب سے پہلی آیت اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ پیدا کرنے والے نے ہمیں پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لیے بنایا ہے۔ ہمیں کان، آنکھ اور دل (یا قرآن کے الفاظ میں سمع، ابصار و قواد) مشاہدہ، تجربہ و استنباط منلج ہی کے لیے عطا کیے گئے ہیں! عام طور پر پہلے علم کا معروض ہماری ذات یا انفس ہے، پھر آفاق ہے اور پھر انفس و آفاق کا پیدا کرنے والا! انفس و آفاق کی نشانیوں کا جاننا حق تعالیٰ کی معرفت کے لیے ضروری ہے اور قرآن نے علم کی حقیقی غایت حق تعالیٰ ہی کے عرفان و وجدان کو قرار دیا ہے! حق تعالیٰ کے عرفان ان کی یافت و نشو و سے بڑھ کر اور کیلئے ہو سکتی ہے جس سے انسان ایک محظوبی مطمئن و شاد کام ہو سکتا ہو۔

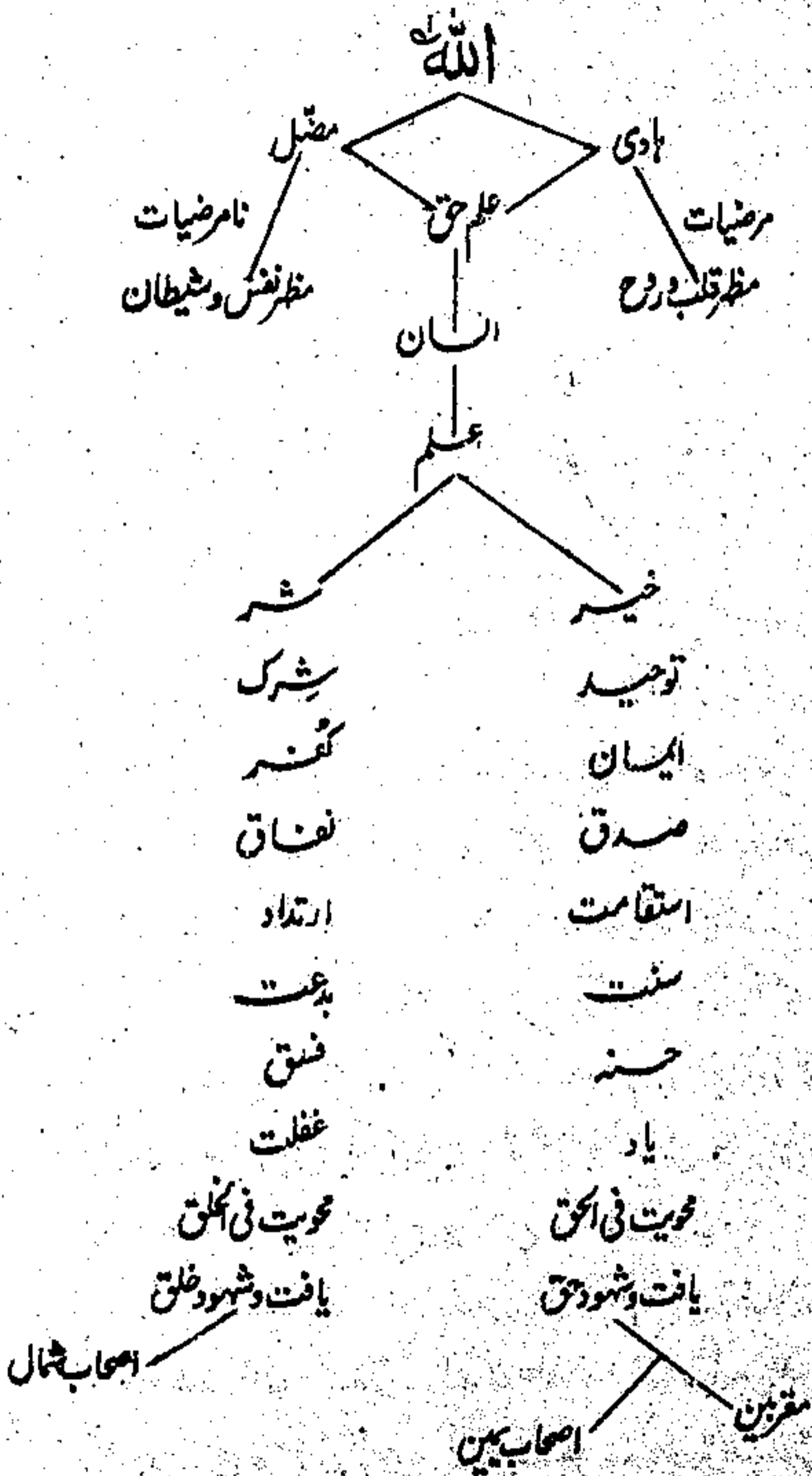
تاہم دل شاد بائیں یک نفس کیست زو بہتر بگوئے پیچ کس
 اچھے می خواہم من از تو ہم توی من نہ شادی خواہم منے خسروی (ردی)

علم کا مقصد اولین حق تعالیٰ کا عرفان ہے، یعنی یہ جاننا ہے کہ حق تعالیٰ کن اسماء و صفات علیہ و افعال باہر سے موصوف و متصف ہیں، ان کا اظہار کس طرح کائنات کی لامتناہی اشیا، لہذا انفس کے لا تعداد احوال و آثار میں ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں عقل کو تابع وحی کر کے آفاق پر نظر ڈالی جائے تو ہر ورق معرفت کردگار کا دفتر بن جاتا ہے اور ہر ذرہ اس کی وحدت کا گواہ، اور تمام عالم اسی کے جمال کا اپنے نظر آ رہا ہے!

ہمہ عالم جمال طلعت اوست گر کے را کہ این نظر باشد! (سعدی)
 ایمان کی اس نظر میں جب کائنات جلوہ گاہِ حق دکھائی دینے لگتی ہے تو نتیجہ کے طور پر
 حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت، ان کی خشیت و محبت سے انسان کا قلب معمور ہو جاتا ہے اور
 عبادت و لذت سے آشنا ہو جاتا ہے جو ذاتِ حق کا خاصہ ہے!

کلے بلبل جان ست بیاد تو مرا سے پایہ غم پست بیاد تو مرا
 لذاتِ جہاں را ہمہ دریا ننگند ذوقیکہ دہد دست بیاد تو مرا (جالی)

اسما و صفات و افعالِ حق کے عرفان کے بعد علم کا مقصد قرآن کی رو سے یہ جاننا ہے کہ
 کون سے اعمال، احوال، اقوال یا اعتقادات ہیں جو حق تعالیٰ کو محبوب و پسندیدہ ہیں اور وہ چیزیں
 کونسی ہیں جو ان کو پسند نہیں اور جن سے انہوں نے انسان کو روکا ہے! قرآن مجید نے حق تعالیٰ
 کی مرضیات کی تفصیل ایمان، توحید، صدق، استقامت، سنت، حسنہ، یاد، محویت فی الحق،
 یافت و شہود حق کے سلسلہ میں شرح و بسط کے ساتھ کی ہے اور شرک و کفر، نفاق و ارتداد، بدعت و
 فسق، غفلت و محویت فی المخلوق اور یافت و شہودِ مخلوق کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور مقررین
 اصحابِ بین، اور اصحابِ شمال کے مقام و صفات کو واضح طور پر معین کر دیا ہے۔ خیر و شر، علم
 ہدایت و علم اضلال قطعاً حق تعالیٰ ہی عطا کرتے ہیں، خیر و شر میں امتیاز کرنا وہی سکھاتے ہیں
 و ہدیناہ النجدین سے یہی مراد ہے، بد کرداری اور پرہیزگاری کا تقابلی ان ہی کی جانب سے
 ہوتا ہے، تاکہ کتاب و سنت کی روشنی میں بد کرداری سے گریز اور پرہیزگاری پر عمل کیا جاسکے۔
 فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (پت ۱۶) سے یہی مطلب ہے جو حق تعالیٰ ہی کو علم کا مبداء قرار دے کر
 علم ہدایت و علم اضلال کی تشریح ایک نقشہ سے کی جاسکتی ہے جو قرآنی تفصیلات کے اظہار میں
 الیم فی السم یا دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے!



جو شخص علم کی ان تفصیلات سے واقف ہو جاتا ہے وہ علم ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتا ہے یہی کرتا ہے جس میں حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے اور ان چیزوں سے گریز کرتا ہے جن کو وہ مکروہ و ناخوش رکھتے ہیں! اپنے اس مجاہدہ و ریاضت کی وجہ سے اصحابِ بہین کے درجہ سے بلند ہو کر مغربین میں شامل ہو جاتا ہے اور جنت ذات میں قیام پیدا کر لیتا ہے۔ فرج و رحمان و جنت نعیم!

خواہم کہ ہمیشہ درہم کے تو زیم خلکے شوم و بہ زیر پکے تو زیم
مقصود میں خستہ زکونین توئی از بہر تو میسرم و بیکے تو زیم (تاکم)

قرآن کریم نے علم کے یہی دو مقصود قرار دیے ہیں، چنانچہ امام احمد نے معروف سے نقل کیا ہے کہ اصل علم حق تعالیٰ کا ڈر ہے، یعنی سائے علم کی جڑ وہ علم ہے جو موجب خشیت و محبت و قرب حق ہو اور بندہ کو حق تعالیٰ سے مانوس کرے اور ان کے شوق کا شعلہ اس کے قلب میں پیدا کرے اور یہ جیسا کہ اوپر کہا گیا، حق تعالیٰ کے اسماء و صفات و افعال کو جاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کے احکام اور اس قول یا عمل یا حال یا اعتقاد سے انسان کو واقف کرانے جو ان کو محبوب ہیں اور پسندیدہ! اس علم کو زبان سنت میں "علم نافع" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے از یاد کی دعا کی گئی ہے۔ اللّٰهُمَّ اَنْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِّمْنِي وِزْدِنِي عَلِمًا وَاِرْزُقْنِي عَلِمًا تَنْفَعُنِي بِهِ (رواہ الترمذی) "حق تعالیٰ جو علم آپ نے مجھے سکھایا ہے اس سے نفع اندوز کیجئے اور جو علم نافع پر وہ مجھے سکھلایا ہے اور میرے علم میں زیادتی کیجئے اور وہ علم مجھے عطا کیجئے جس سے میں نفع اندوز ہوں۔"

دوسری حدیث میں علم نافع کا سوال کیا گیا ہے اور غیر نافع سے استعاذہ:-

اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عَلِمًا نَافِعًا وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ اَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ
مَاجِدٍ لَفْظًا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَاَلُوْا اللّٰهَ عَلِمًا نَافِعًا وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ
جس شخص کو علم نافع حاصل ہو گیا اس نے اس کے ثمرات کے طور پر "قلب خاشع" بھی پایا۔
نفس قانع بھی اور دعائے مسوع بھی! اس کا قلب اپنی رحمت کے لحاظ سے ساری کائنات میں

نہیں سما سکتا۔ کیا حجاب دریا کا سر پوش ہو سکتا ہے ؟

مَنْ وَسِعَ الْحَقَّ فَمَا ضَاقَ عَنْهُ
خَلَقَ فَكَيْفَ الْأَمْرُ يَا سَامِعَ الشَّيْخِ الْكَبِيرِ

علم کے ان ثمرات پر ایک نظر ڈالو :-

۱) قلبِ خاشع : علم نافع جب قلب میں اُتر جاتا ہے تو اب وہ قلب حق تعالیٰ کے لیے خاشع اور شکستہ ہو جاتا ہے اور اس کی ہیبت و جلال کے سامنے اس کی خشیت و محبت و تعظیم کے لیے سراغ بندہ اور ذلیل ہو جاتا ہے ! اور جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معرفت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ان کی خشیت و محبت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کا دل انکسار بھی روز افزوں ! اسی کیفیتِ قلبی کو سعدی نے ان مشہور اشعار میں ادا کیا ہے :-

در خاک بلیقاں بر سیدم بجابد سے

گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن !

گفتا برو چو خاک تحمل کن لے نقیہ

یا ہر چہ خواندہ ہمہ در زیر خاک کن !

علم کا ثمرہ ہی خشیتِ اللہ ہے ! اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (آیت ۱۶۳) حق تعالیٰ

سے ان کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں ! اسی لیے ابن مسعود وغیرہ نے کہا ہے :
كفى بحشية الله علماً وكفى بالاعتذار بالله جهلاً۔ علم کا نتیجہ خوفِ خدا، اور جہل کا نتیجہ بے
خوفی اور دھوکا ! علم خوفِ خدا کا نام ہے کثرتِ روایات کا نہیں۔ معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا
نہیں، دماغ کو علومِ ربی سے پر کرنے کا نہیں۔ لیس العلم بکثرة الروايات ولو لکن العلم خشية
عالم رہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے، ”من خشى الله
فهو عالم ومن عصاه فهو جاهل“

عالم کی اس تعریف کو پیش نظر رکھ کر ہم ہر کتاب خواں اور کتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے
چنانچہ اسی معیار سے جانچ کر امام شعبیؒ اپنے زمانے کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں متلذذ
بالمسائل (INTELLECTUAL EPIGURE) ہو۔ تمہیں علمی مسائل سے بحث کرنے میں

لے جس میں حق سما گیا وہ غلق سے کیونکر تنگ ہو سکتا ہے اور اس کا کیا حال ہو گلانے سننے والے۔

لذت ملتی ہے اور یہی لذت تمہارا مقصد و غایت ہے اسی پر تم فدا ہو عالم در عمل عامل اللہ فی اللہ باللہ ہے یعنی عالم وہ ہے جو عرفان حق اور خوف خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے۔ اس کے عمل اور مجاہدہ کا مقصد اللہ ہی کی رضا و محبت ہوتی ہے اس کا مطلوب و محبوب صرف حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں!

دل از غم کائنات برداشتمہ بہ! جز یاد تو ہر چہ ہست بگذاشتمہ بہ!
چشمے کہ نہ از لور تو روشن باشد بشگافتہ و بجا ک انباشتمہ بہ!

(۲) نفس قانع: قلب خاشع کا لازمی نتیجہ نفس قانع ہے۔ جب دل میں خشوع پیدا ہو گیا، حق تعالیٰ سے ذل و افتقار کی نسبت قائم ہوگی تو اب نفس اللہ سے راضی اور غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اب غنی عن الاشیاء ہو جاتا ہے! وہ جانتا ہے کہ کوئی شے حق تعالیٰ سے برتر نہیں جس کے حصول کی وہ خواہش کر سکے، اب سب کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے! اسی لیے فرمایا گیا ہے۔ لَکِیْلًا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَا تَکْمُوْا لَا تَقْرَحُوْا بِمَا تَاکْمُوْا اس کو علوئے تکمیل حاصل ہو جاتی ہے، وہی مخاطب ہوتا ہے اس قول کا: اَنْتُمْ اِلٰہِ عَلٰی وَاَللّٰهُ مَعَكُمْ!

نفس ساری کائنات کو پا کر بھی حریف رہ سکتا ہے۔ ہل من مزید کا نعرہ لگا سکتا ہے! لیکن جب وہ حق تعالیٰ کو پالیتا ہے، ان سے مانوس ہو جاتا ہے تو پھر دنیا اس کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت و جلال سے اس کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے! اثر اسرائیلی میں اس کا ذکر بڑی خوبی سے آیا ہے:-

ابن آدم طلبنی تجدنی، فان وجدتنی وجدت کل شیء وان فیک
فانک کل شیء وانا احب الیک من کل شیء۔

ابن آدم تو مجھے طلب کر تو مجھے پائیگا۔ جب تو نے مجھے پالیا تو گویا تمام چیزیں تجھ کو مل گئیں۔ اگر تو نے مجھ کو کھو دیا تو گویا تو نے تمام چیزوں کو گم کر دیا، میں تیرے نزدیک ہر شے سے زیادہ محبوب

پسندیدہ ہوں، اسی مفہوم کو کسی عاشق نے یوں ادا کیا ہے :-

لِکَلِّ مَشِيٍّ إِذَا فَارَقْتَهُ عَوْضٌ وَلَيْسَ لِلَّهِ إِنْ فَارَقْتَهُ مِنْ عَوْضٍ

عارف رومی نے اسی چیز کو اپنے سر پہ نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے شاہِ دیکھا سے انس و پیار پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کو سارے دردوں کی دوا مل جاتی ہے اور وہ اس کی طرف اپنا رخ پھیر کر سارے جہان سے فارغ و بے فکر ہو جاتا ہے :-

آنکہ شد آنسش بشاہِ فردِ خویش یافت در ماہنامے جملہ درد خویش

چوں ازاں اقبال شیریں شد ایں سرد شد بر آدمی ملک جہاں (رومی)

حق تعالیٰ سے مانوس ہو کر اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کے اطوار سے بیزار ہو جاتا ہے، وہ طالبِ علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا، اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ محضوں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں کرتا، اس کو لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو نہیں رہتی، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی خواہش نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسن کے الفاظ میں (الزاهد فی الدنیا الراغب فی الآخرۃ، البصیر بدینہ، للمواظب علی عبادۃ ربہ ہو جاتا ہے یعنی دنیا میں ہر اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف مائل ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے، اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ بن جاتا ہے) وہ اپنے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا مذاق نہیں اڑاتا۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے حق تعالیٰ کا خوف بڑھتا جاتا ہے، تواضع و انکسار میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ اہل العلم النافع كلما ازدادوا من هذا ازدادوا لله تواضعا و خشية و انکسارا و ذلا (ابن عمر)

وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے زندہ رہتا ہے، مال و گنچ کے لیے نہیں، وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے جان دیتا ہے، خوف و رنج سے نہیں مڑتا۔

لے ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی ہے بدلہ ہے لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا ہے تو اس کا کوئی بدلہ نہیں۔

ہر کجا امر قدم را مسلکیست	زندگی و مردگی ہمیشہ یکسخت
بہر نیماں می زیدنے بہر گنج	بہر زیداں می مرد ز خوف و رنج
ہست ایانش برائے خواہ او	نے برائے جنت و شمار و جوا
ترکی کفرش ہم بے حق بود	نے زہیم آنکہ در آتش رود
این چنین آمد وصل آن خوی او	بے ریاضت نے بچھوے او
آنکھاں خند کہ او بیند رضا	بچھو لوئے شکر اور اقصا (رومی)

(مس) دعائے سموع :- جب قلب میں خشیت پیدا ہوگئی اور وہ حق تعالیٰ کی محبت سے منور ہو گیا اور دنیا سے شکم سیر ہو گیا تو اب وہ حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہو جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، اولیٰ فرض عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اب وہ اپنے رب سے جو کچھ مانگتا ہے، اس کو دیا جاتا ہے، جو دعا کرتا ہے قبول کی جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں صاف وعدہ کیا گیا ہے :-

لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّىٰ أُحِبَّهُ إِلَيَّ قَوْلَ فَلَنْ سَأَلَنِي لِأَعْطِيَنَّهُ وَلَا نِ اسْتَعَاذَنِي لِأُعِينَنَّهُ (وفی روایت) وَلَمَنْ دَعَانِي لِأَجِيبَنَّهُ (رواہ البخاری)

جب بندہ کو حق تعالیٰ سے انس و تقرب حاصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی دعا و سموع ہوتی ہے، اس کا سوال پورا کیا جاتا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی پرورش میں آ جاتا ہے، وہ اس کے ولی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ :-

لے پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے، ہمیشہ میرا بندہ نزدیک ہوتا ہے مجھ سے بڑی نوافل کے تا آنکہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو تو ہوتا ہوں میں شنوائی اس کی جو سنتا ہے وہ اس سے اور بینائی اس کی جو دیکھتا ہے اس سے اور اتنا اس کا جو پڑتا ہے اس سے اور پیر اس کا جو چلتا ہے اس سے، اور اگر سوال کرے مجھ سے تو دیتا ہوں میں اس کو، اور اگر پناہ مانگے مجھ سے تو البتہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو اور ایک روایت میں بھی ہے کہ اگر وہ دعا کرے مجھ سے تو البتہ میں اسکی دعا قبول کرتا ہوں۔

”يا غلام! احفظ الله يحفظك، احفظ الله تجده امامك، تعرف الله في الرخاء يعرفك
 الله في الشدة“ یعنی اے لڑکے تو حق کو نگاہ رکھ (اس طرح کہ اوامر و نواہی کو بجالا اور قضا، قدر
 کو مان) تو اللہ تجھ کو اپنی حفاظت میں رکھیگا، تو اللہ کو نگاہ رکھ (مراقبہ علم و حضور و معیت کے ساتھ)
 تو اس کو اپنے سامنے پائیگا (وہ تجھ کو دنیا و آخرت دونوں کی آفتوں سے محفوظ رکھے) تو اللہ کی
 یاد آرام و چین کی حالت میں کروہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کریگا (تیری دعا کو قبول کریگا اور
 تیری مصیبت کو دور کریگا!) اسی لیے تو عارفِ رومیؒ نے کہا تھا:-

زندگی بے دست جاں فرسودہ است مرگِ حاضر غائب از حق بودن اسر
 عمر و مرگ این ہر دو با حق خوش بود! بے خدا آبِ حیات آتش بود! (رومیؒ)
 جب علمِ نافع نے ہمیں قلبِ خاشع، نفسِ قانع، دماغِ مسموع کی نعمتوں سے بہرہ یاب
 کر دیا تو اب اس میں حق تعالیٰ ہی میں مشغولیت حاصل ہو جاتی ہے، تمام عالم سے بخود فانی ہو کر
 باقی حق ہو جاتے ہیں، ماسوی اللہ سے قلب کا تخلیہ ہو جاتا ہے اور یافت و شہودِ حق ہی ہمارا
 عمل ہو جاتا ہے، یعنی ہم مخلوقات کو چھوڑ کر خالق میں، معلومات کو ترک کر کے عالم میں مصروف ہو
 جاتے ہیں۔ یہ ہے علمِ نافع کا ثمرہ اور اس کا انجام!

چوں بہ مطلوبت رسیدی لے طبع شد طلب گاری علم اکنون قسبح
 چوں شدی بر باہمائے آسمان سر و باشہ جستجوئے نردبان (رومیؒ)
 نسأل الله علما نافعاً ونعوذ به من علم لا ينفع ومن قلب لا يتشبع ومن
 نفس لا تشبع ومن دعاء لا يسمع، اللهم اننا نعوذ بك من هوان الاربعة

انسانِ کامل

دی شیخ با چراغِ ہی گشتِ گردشِ سر کز دام و دردِ بلوغم و انسا تم آرزوست!

زیں ہر ہاں سست عناصرِ دلِ گرفت شیر خدا و رستم دستا تم آرزوست!

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما گفت آنکہ یافت می نشود اتم آرزوست! (روح)

ان اشعار میں عارفِ روم نے دیو جانس کلہی کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر کسی گم شدہ شے کی نہایت توجہ اور اہتمام کے ساتھ تلاش کر رہا تھا۔ لوگوں نے یہ نظارہ دیکھ کر پوچھا کہ اجی آخر ڈھونڈتے کیا ہو؟ کہا کہ انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں! اسی حکیم کا ذکر ہے کہ ایک روز وہ اونچے مقام پر چڑھ کر پکارنے لگا کہ لوگو! ادھر آؤ! جب چند لوگ اس کے قریب پہنچے تو اس نے انہیں اپنے سونٹے سے مار بھگا یا اور کہا کہ میں نے تو انسان کو بلایا تھا تم تو بول و براز ہو!

گویا دیو جانس کی نظر میں انسانِ کامل اور اس انسانِ ناما صورت میں وہی فرق ہے جو کسی شخص میں اور اس کے بول و براز میں ہو سکتا ہے۔ دیو جانس اور اس کے منبعین نے انسانِ کامل کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی زیادہ تفصیل تو ان کے ہاں نہیں ملتی البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کامل کی زندگی کا مقصود ذواقیت اور لذت پرستی نہیں بلکہ حق طلبی و حق رسی ہے جس کو وہ اپنی زبان میں نیکی سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیکی سے ان کی مراد خواہشات سے قلب کا کامل تخلیہ ہے؛ جب انسان کا قلب تمام نفسانی خواہشات سے خالص ہو جاتا ہے، لذتوں کی تمنا اور آرزو اس کے دل سے نکل جاتی ہے، مال و دولت، جاہ و عزت کی طلب بالکل جاتی رہتی ہے تو وہ بحال

۱۔ یہ مقالہ لشرگاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔

کے اس زینہ تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کے عروج کا آخری زینہ ہے! کلبیہ کا لغزہ تھا۔

خرنستی از آب و علف دست بدار سگ نستی از حیفہ دنیا بگذرا

قلب لذت کی خواہش سے آزاد ہو جائے، لذت کے مؤیدات جاہ و شہرت، مال و دولت سے مستغنی ہو جائے۔ اتنی بات تو صاف ہے لیکن قلب کے اس تجلیہ کے بعد اس کا تجلیہ کس چیز سے ہو؟ کلبیہ کا جواب ہرنیکی سے! نیکی سے کیا مراد ہے؟ اس کا ایجابی تضمن کیلئے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ نیکی سے مراد خواہشات نفسانیہ سے قلب کا تزکیہ! اس دور سے کلبیہ نہیں نکلتے اور خود نیکی یا کمال کا کوئی ایجابی تضمن نہیں ان سے معلوم نہیں ہوتا یا پھر فلسفہ کی تاریخ میں محفوظ نہیں کیا گیا۔

اب ہم اس تلاش میں یونان کے اس فلسفی کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی نگاہ زلزلہ عالم افکار ہے، جو یونان کا سب سے بڑا مفکر ہے، ہماری مراد افلاطون سے ہے۔ یونان کے مفکرین میں سب سے پہلے افلاطون ہی نے روح انسانی کی تشفی بخش نفسیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ روح انسانی کی تین ملکات میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے ایک کی فطرت عقلی ہے اور دوسری غیر عقلی۔ سب سے ادنیٰ ملکات جو روح کا غیر شریف اور دنیٰ حصہ ہیں، وہ احساسات، خواہشات اور اشتہات ہیں۔ ان کی فطرت غیر عقلی ہے۔ ان میں نہ کوئی نظم ہوتا ہے نہ ترتیب، ان کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ قاعدہ! ضروری ہے کہ ان پر ایک اعلیٰ ملکہ کی حکمرانی ہو، قہرمانی ہو، جو ان کو حد اعتدال میں رکھے، عفت و پاکبازی کے اصول کے تحت ان پر حکومت کرے! یہ اعلیٰ ملکہ عقل کا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے شریف ہے جو حکمت کا مقام ہے! جس طرح خواہشات اور اشتہات کا کام عقل کی فرمانبرداری و اطاعت پذیری ہے اسی طرح عقل کا فطری والی حق حکمرانی و قہرمانی ہے۔ عقل جذبات و خواہشات پر حکمرانی کے لیے بنائی گئی ہے! ان دو ملکات کے درمیان روح کا تیسرا ملکہ ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ارادہ سے تعبیر کر سکتے ہیں یہ احساسات و اشتہات کی طرح دنیٰ و ذلیل نہیں، فطرتاً

مائل پشہ نہیں۔ یہ خلقتاً شریف ملکہ ہے اور حیب اس کی صحیح رہبری کی جاتی ہے تو یہ اعلیٰ کمالات کے حصول کا ایک قوی ذریعہ بن جاتا ہے لیکن چونکہ یہ بذات خود غیر عقلی ہے اور گورانہ جذبہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے، لہذا اس کا مقام عقل سے فروتر ہے۔ عقل کا خادم ہے جس کو جذبات و اشتہات کو مطیع اور رام کرنے کے کام پر لگایا جاسکتا ہے، افلاطون ادنیٰ ملکات کا مقام جگر کو قرار دیتا ہے، عقل کا سر کو، اور ارادہ کا گردن سے نیچے کے حصہ کو، اس مقام کی وجہ سے وہ جذبات و خواہشات کو روک سکتا ہے اور عقل کی ہدایت و رہبری حاصل کر سکتا ہے۔

افلاطون کی رائے میں تینوں ملکات حقیقی معنی میں ایک دوسرے سے جدا و علیحدہ ہیں اگر فطرت انسانی کو کامل وحدت قرار دیا جائے تو پھر اس امر کی توجیہ کسی طرح نہیں کی جاسکتی کہ کیوں عقل کو اکثر دفعہ جذبات کے خلاف اپنی پوری قوت سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ سچ پوچھو تو عقل ہی روح ہے اور جو اس بدن کے محض وظائف ہیں۔ تاہم یہ نہ خیال کیا جائے کہ ان کے درمیان کوئی ربط و تعلق نہیں۔ ایسا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلے ادنیٰ ملکات اعلیٰ ملکات کی خدمت و اطاعت کے لیے ہیں، جسم روح کی خدمت گزار کی لیے ہے اس ربط و تعلق کو افلاطون نے ایک مشہور مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے جو رتھ بان اور پردار گھوڑوں کی مثال کہلاتی ہے۔ ان دو گھوڑوں میں سے ایک شریف ہے اور دوسرا ذلیل، اس لیے ان دو کو ایک ساتھ قابو میں رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ شریف گھوڑا ارادہ کی تعبیر ہے اور ذلیل، جذبات و خواہشات کی رتھ بان عقل ہے۔ شریف عنصر کا رخ آسمان کی جانب ہوتا ہے، اس کا رجحان میلان علو و رفعت کی طرف ہے، وہ جمال و کمال کا دلدادہ ہے، لیکن جسم اس کو زمین کی طرف کھینچتا ہے، زمین کی لذتوں اور شہوتوں پر وہ جان دیتا ہے، ہر اچھی چیز کا تعلق شکم ہی سے قرار دیتا ہے یا پھر ساری کائنات کا محور و مرکز آلہ تناسل کو سمجھتا ہے، اور اسی کا شیفتہ و ربودہ ہے۔ اب رتھ بان یا عقل قنبراں کا کام ہے کہ اپنے ان دونوں گھوڑوں کو قابو میں رکھے،

ادنی و رذیل کو اعلیٰ و شریفین کے تابع کر دے، ان کا رُخِ علو و رفعت کی جانب پھیر دئے نتیجہ کے طور پر روح میں عدالت کی صفت پیدا ہوتی ہے جو اس کا کمال ہے، یعنی روح کا کمال اس کے مختلف ملکات یا حصوں کا ایک خاص ربط و تعلق ہے جس میں ہر ملکہ یا حصہ اپنی فطرت و ثابت کے لحاظ سے اپنے صحیح مقام پر اپنے خاص فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتا ہے اور وضع آئی ہوئی اعلیٰ محلہ کے اصول کی تعمیل و تکمیل ہو جاتی ہے! فرد عقلمند و حکیم اس وقت سمجھا جاتا ہے جب عقل روح کے دوسرے ملکات پر حکومت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کس چیز میں مضمر ہے۔ فرد میں شجاعت کی صفت کا اس وقت ظہور ہوتا ہے جب ارادہ، لذت و الم، کرب و طرب میں عقل کی ہدایت پر عمل کرتا ہے کہ کس چیز سے خوف کیا جائے اور کس چیز سے نہیں۔ اس میں عفت کی صفت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ارادہ اور جذبات و شہوات عقل کے حکم و اقتدار کا اتباع کرنے لگتے ہیں۔ جب عقل، ارادے اور شہوتوں میں توافق و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر ایک اپنا مناسب فرض ادا کرنے لگتا ہے تو فرد میں عدالت کی صفت کا ظہور ہوتا ہے اور چارہائے فضائل ہی چارہ ہیں: حکمت و شجاعت، عفت و عدالت۔

اب انسان کامل کی روح میں کامل توافق و ہم آہنگی و ربط پایا جاتا ہے، جس میں اعلیٰ کا ادنیٰ پر کامل اقتدار ہوتا ہے جس کی وجہ سے حکمت، شجاعت، عفت و عدالت کی صفات حسنہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ متجلی ہوتی ہیں، اور یہی صفات جملہ فضائل کا مبداء و منبع ہیں، تمام محاسن کا ان ہی سے ظہور ہوتا ہے! ان کا حامل انسان کامل ہے، اپنی قیمت کے لحاظ سے "دارائے دو جہان" ہے! گو "کشتگانِ شہوت" کی نظر میں حقیر و صغیر ہی کیوں نہ ہو۔

پیشِ خلقان خوار و زار و ریشِ خرد: پیشِ حق محبوب و مطلوب و پسند! (روحی)

انسان جسم و روح پر مشتمل ہے، جسم عناصر کثیر سے مرکب ہے اور روح میں کئی ملکات پائے جاتے ہیں، اس طرح انسان ایک کثرت ہے لیکن جب جسم کو روح کا تابع کر دیا جاتا ہے اور روح کے مختلف ملکات عقل کے منقاد ہو جاتے ہیں تو اب انسان میں ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے، ایسی

وحدت جس کی تکوین مختلف عناصر سے ہوئی ہے اور جو اپنا ظہور کثرت میں کرتی ہے۔ اسی لیے افلاطون کہتا ہے کہ کمال توافق، ہم آہنگی یا وحدت کا نام ہے اور مرز کمال وہ مطرب (Musician) ہے جو گویا مختلف آوازوں کی ترتیب سے ایک دلفریب نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ دلفریب نغمہ توحید کا نتیجہ ہے؛ چونکہ حق تعالیٰ واحد میں لہذا کمال یا فضیلت عدالت افلاطون کے الفاظ میں "تشبہ باللہ" ہے۔

اس وحدت یا کمال کا لازمی، ضروری قطعی نتیجہ مسرت ہے۔ روح انسانی کی فطری خوبی یہی کمال یا فضیلت ہے اور اس کا فطری نتیجہ مسرت ہے۔ انسانِ کامل ہمیشہ مسرور و شادان ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لگد کو بھان سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہوتا؛ اس کے دوست و احباب اس کے ساتھ بے شرمی کا برتاؤ کر سکتے ہیں، وہ کورا نہ نفرت کا شکار ہو سکتا ہے، اس کو کشاں کشاں زندان میں جھونکا جا سکتا ہے، اور تازیانہ کی سزادی جاسکتی ہے، وہ اپنے مصائب کا انجام سولی پر پا سکتا ہے، تاہم "عدالت کے سوا ہر چیز کو کھو کر وہ مسرور و شادان ہو سکتا ہے! اس کی روح نغمہ الہی کی گونج سے ہمیشہ فرح و انبساط، ذوق و مستی کی حالت میں ہوتی ہے، وہ اغیار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

کیست زو بہر گوئیے بیچ کس تابداں دل شاد باشی یک نفس
من نہ شادی خواہم و نے خسروی انچہ می خواہم من از تو ہم نوی (ردی)
افلاطون کا یہ بیان حکمت ایمانی کی نظر میں اسی وقت کامل مانا جائیگا جب عقل کو بھی شرع کے تحت کر دیا جائے:

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول (قبال)

امام غزالی کا فلسفہ مذہب

کس را پس پرده قناراه نشد وز سرف در پیش کس آگاہ نہ نشد
 ہر کس ز سیر قیاس چیزے گفتند معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نہ نشد (غزالی)

میری تحقیق کی رو سے (اور مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے) فلسفہ عقل و استدلال کے ذریعے کسی شے کی آخری و انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور فلسفہ اپنی موزوں ترین شکل میں تمام موجودات کی انتہائی ماہیت کو دریافت کرنے کی سعی کے سوا کچھ نہیں۔

اس کے برخلاف سائنس کا سارا تعلق عالم مظاہر سے ہے، سائنس واقعات تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے۔ عالم سائنس۔ مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ متعلقہ واقعات کو جن کی اس کو تحقیق کرنی ہو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل و ترکیب کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر ان کا اصطفا کرتا ہے پھر پھر ان شرائط یا علل کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ ان کی یکسانیت عمل کا تعین کرتا ہے، یعنی ان کے قوانین عمل کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کر دیتا ہے اور یہاں پر اس کا کام عالم سائنس کی حیثیت سے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اس نے واقعات تجربیہ یا مظاہر کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا، ان کے طرز وقوع و طریقہ عمل کو سمجھا دیا۔ غرض عالم سائنس کا کام اس عالم شہادت سے ہے۔ اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر کی جانب لگی رہتی ہے، اس کی توجہ تجربات کی طرف ہوتی ہے۔ اشیاء کے باہمی ربط کو وہ دریافت کرتا ہے، ان کے پیش کرنے میں وہ خرم و احتیاط کے

لے یہ مقالہ نشر گاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔

کام لیتا ہے اور اس طرح وہ ان قوانین و علل کو معلوم کر لیتا ہے جن کے تحت عالم شہادت کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اس علم سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے اور کائنات کی تسخیر میں وہ کامیاب ہوتا ہے!

عالم سائنس کے برخلاف فلسفی کو عالم غیب کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ مظاہر کے ماوراء پر پہنچ کر حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے، حقائق کے انتہائی علوم پر مطلع ہونا چاہتا ہے اس حقیقت کی گامیت سے واقف ہونا چاہتا ہے جو انتہائی و آخری حقیقت ہے جو اشیاء کا باطن ہے، جو باوجود اشیاء میں شدت ظہور کے غیب الغیب ہے، جس کا علم انسان کے حواس و قیاس و ادراک و فہم و عقل کے لیے مستور ہے۔ اس غیب کے علم کی طلب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کی جستجو و طلب ہی نے اس کو حیوان سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کے تمام علوم و فنون، حکمت و فلسفہ اسی غیب کے یقین اور اس کی پیہم جستجو کا نتیجہ ہیں! اسی غیب کی یافتگی کی تڑپ میں وہ تن کی پرورش کو بھی ایک حقیر و ذلیل عمل قرار دیتا رہا ہے!

لیکن جن غیبوں تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے وہ صحیح معنی میں غیب نہیں بلکہ ہمارے عالم شہادت ہی کے ذرا مخفی اور دور افتادہ گوشے ہیں جن کو عین اضافی یا اعتباری غیب کہا جاسکتا ہے! غالب نے اس حقیقت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے:

ہر غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جگے ہیں خواب میں
باقی اصلی اور حقیقی غیب یا "غیب الغیب" تک انسانی عقل اور ذراغ علم کی رسائی کسی کو بھی نہیں ہو سکتی! **اَقْلٌ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ (پارہ ۱۱)** یعنی غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے کہہ کر قرآن اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے اور انسان سے اس علم کی قطعاً نفی کر رہا ہے۔

تاریخ فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ میں ادعائی فطامات کے پیش ہولے کے بعد ہی جب غیب کے کلی یقینی علم کا فلسفیوں نے دعویٰ کیا تو ارنیست ہارٹ اور لا اوریت نے ان کے ان ملینڈ بانگ دعویوں کی شدت سے تردید شروع کر دی اور انسانی علم

کو عالم شہادت ہی تک محدود کر دیا۔ ہیوم نے فلسفہ جدید میں نہایت قوت کے ساتھ واضح کر دیا کہ انسان کا سارا علم مظاہر ہی کی حد تک محدود ہے، کیونکہ اس کا دار و مدار ارسامات یا ان کی نقل "تصورات" پر ہے۔ لہذا محسوس ہی کو ہم موجود کہہ سکتے ہیں اور غائب کا ہمیں کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ ہیوم کی ارسامیت نے کانت کو اس کے خواب ادعائیت سے جگایا اور جاگنے کے بعد اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حقائق اشیاء کا علم نہ صرف یہ کہ اب تک انسان کو حاصل نہیں ہوا بلکہ عقل و استدلال کی راہ سے ہمیشہ کے لیے ناممکن الحصول ہے۔ حقائق اشیاء کو کانت کی اصطلاح میں "نواطن" (Noumena) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسانی علم اس کے مقابلہ میں "ظواہر" (Phenomena) یا قرآن کی اصطلاح میں "عالم شہادت" تک محدود ہے! تاریخ فلسفہ میں غزالی ہی وہ اولوالعزم اور جلیل القدر فلسفی ہیں جنہوں نے وجدان حقائق کو پیش نظر رکھ کر عقل نظری کو علم وحی کے تابع کر دیا اور مشکوٰۃ نبوی سے اخذ نور کر کے کائنات کے متعلق وہ نظریہ پیش کیا جو "ماوراء عقل" (Supra-rational) ضرور ہے۔ عین قطعاً خلاصہ عقل (Contra-rational) نہیں جس سے واقف ہو کر انسان اس صداقت کا قائل ہو جاتا ہے:

باہر کمال اندکے آفتنگی خوش است ہر چہ عقل کل شدہ بے جنوں مباش

غزالی عقل و ایمان (جن کو جنون الہی سے تعبیر کیا جاتا ہے) حکمت و شریعت 'علم استدلالی' و قبول ایمانی کے وجدانات سے استفادہ کر کے ہمیں اس حقیقت الحقائق سے مانوس کر دیتے ہیں جن کے یافت و حصول کی تڑپ فطرت انسانی میں روز آفرینش ہی سے موجود ہے۔ اسی لیے عمیق ان کا فلسفہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ ہم اس مختصر تحریر میں ان کی اسی یافت کے چند روشن پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کر رہے ہیں۔

غزالی نے اہل عقل کی توجہ اس روشن حقیقت کی طرف منعطف کی کہ جو ہر انسانی

اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے بالکل سادہ پیدا کیا گیا ہے اور اس کو حق تعالیٰ کے لاتعداد عالموں کی ابتداء میں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس کو عالم کی خبر ادراک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ہر ادراک اس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ موجودات کے کسی خاص عالم کا علم حاصل کرے۔ سب سے اول انسان میں قوتِ لامسہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ موجودات کے بہت سے عوامل کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ مثلاً گرمی، سردی، خشکی، تری، سختی، نرمی، گرمیہ قوتِ رنگ اور آوازوں کے ادراک سے بالکل قاصر ہے۔ "ہنگامہ رنگ و صوت" اس کے لیے قطعاً معدوم ہوتا ہے! لامسہ کے بعد انسان میں قوتِ باصرہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ رنگ اور شکلوں سے واقف ہوتا ہے، عالم کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرتا ہے! پھر قوتِ سامعہ بیدار ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ آوازوں اور نعروں کو سنتا ہے اور کیفیت اندوز ہوتا ہے پھر انسان میں قوتِ ذائقہ پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مختلف لذتوں سے بہرہ یاب ہوتا ہے!

اب وہ عالمِ محسوسات کے دائرہ سے گے قدم اٹھاتا ہے اور سات سال کی عمر کے قریب اس میں قوتِ تمیز پیدا ہوتی ہے! یہ حالت اس کے اطوارِ وجود میں سے ایک طور ہے اور اس حالت میں وہ ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جو عالمِ محسوسات سے ماورا ہوتے ہیں! پھر وہ ترقی کرتا ہے اور اس حالت پر فائز ہوتا ہے جس میں اس کے لیے عقل پیدا کی جاتی ہے اب وہ واجب و محال، ممکن و ناممکن، جائز و ناجائز کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کا شعور اس کو پہلی حالتوں میں حاصل نہ تھا!

غزالی بتلاتے ہیں کہ عقل کی سرحد کے ماورا ایک اور درجہ بھی ہے جس میں انسان کی دوسری آنکھ کھلتی ہے، جس کے ذریعہ وہ غیب کی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کے ادراک سے عقل ایسی ہی قاصر ہے جیسے قوتِ تمیز ادراکِ معقولات سے اور قوتِ حس بدرکاتِ تمیز سے! اسی درجہ کا نام نبوت ہے!

بعض لوگ اس درجہ کے منکر ہیں، لیکن ان کا یہ انکار عین جہالت ہے اور اس انکار کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں کہ وہ خود اس حالت پر فائز نہیں ہوئے اور چونکہ ان کے حق میں یہ حالت کبھی موجود نہیں ہوتی اس لیے وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ حالت فی نفسہ موجود نہیں، عدم علم سے وہ عدم وجود کا استنباط کرتے ہیں! اگر اندھے کو متواتر روایت کے ذریعہ رنگوں اور شکلوں کا علم نہ ہوتا اور اول مرتبہ ان امور کا اس کے سامنے ذکر کیا جاتا تو وہ ان کو ہرگز نہیں سمجھتا اور ان کا کبھی اقرار نہ کرتا!

اہل عقل کا نبوت کے درجہ سے انکار ایک معنی میں جائز ہے۔ غزالی خود صراحت کرتے ہیں کہ "تصدیق تو ہمیشہ سمجھنے کے بعد ہوتی ہے" بغیر سمجھنے کے کسی چیز کی تصدیق سخت شوار ہے۔ اس لیے وہ نبوت کی خاصیت کا ایک نمونہ خود انسان کے تجربات زندگی ہی میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے روشن نمونے اور صفات مثال کے بعد انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، ذرا اس نمونہ پر غور کرو۔ یہ نمونہ خواب ہے۔ دیکھو خواب میں انسان کو بعض دفعہ ہونے والے واقعات کا صحیحاً علم ہو جاتا ہے یا تمثیل کی صورت میں ان کا انکشاف ہوتا ہے جو تعبیر کے ذریعہ سمجھ میں آ جاتے ہیں (Veridical Dreams) اس بات کا اگر انسان کو خود تجربہ نہ ہو ہوتا اور اس سے یہ کہا جاتا کہ بعض وقت آدمی مردہ کی مانند بے ہوش ہو جاتا ہے، اس کی قوتِ حس، اس کی شنوائی و بینائی زائل ہو جاتی ہے اور غفلت و ذہول کی اس حالت میں اس کو غیب کا ادراک ہوتا ہے، وہ ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو یہ سن کر انسان اس کے مننے سے قطعاً انکار کرتا ہے، اس کو محال قرار دیتا ہے اور اس پر یوں دلیل قائم کرتا ہے کہ آلاتِ ادراک تو قوتِ حسی ہی ہیں جس شخص کو ان آلات کی موجودگی کی حالت میں ایسے واقعات کا ادراک نہیں ہو سکتا تو پھر ان قوی کے معطل و زائل ہو جانے کے بعد کس طرح علم ہو سکتا ہے؟ مگر اس قسم کے قیاس کی تردید کیا وجود اور مشاہدہ سے نہیں ہو رہی ہے؟ جس طرح عقل کے ذریعہ انسان کو وہ نظر حاصل ہوتی ہے جو تعلات و تصورات کا مشاہدہ کرتی ہے جن کے ادراک سے حواس بالکل قاصر ہیں، بالکل اسی طرح نبوت سے

مراد ایک ایسی حالت ہے جسکی وجہ سے ایسی نورانی نظر حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ امور غیب اور وہ امور جن کا عقل قطعاً ادراک نہیں کر سکتی ظاہر ہونے لگتے ہیں، لہذا

بند احکام عقل میں رہنا یہ بھی ایک نوع کی حماقت ہے (رد)

ان فلسفیوں کو جو عقلیت کے پرستار ہیں اور عقل کے سوا علم و عرفان کے کسی اور بلکہ اور قوت کے قائل نہیں، نبوت کے درجہ کی خبر دے کر، اس کے واضح اور اجاگر نمونہ کو خود ان کے تجربہ میں مبتلا کر اور یہ ثابت کر کے کہ حقائق ایمان کی یافت میں عقل کی آنکھ اتنی ہی معتبر ہے جتنی کہ مادر زاد اندھے کی آنکھ رنگوں کے ادراک میں، اغزالی ارکان و حدود شرعی کی حقیقت کو مشکوٰۃ نبوی سے اخذ کر کے فلسفیانہ طریقہ پر اس کی جو تفہیم کرتے ہیں وہ بڑی دھچپ ہے:

زیر شہدیک انگشت سنا نم ببت از لذت اگر محو نگردی تفت کن

فرماتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے بنایا گیا ہے: جسم اور قلب۔ قلب سے مراد حقیقت روح انسانی ہے جو عرفان الہی کا محل ہے، وہ گوشت و خون کا ٹکڑا جس میں مردے اور چار پائے بھی شریک ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے جسم ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے جسم کی صحت جسم کے لیے باعث سعادت ہے اور اس کا مرض اس کے لیے باعث ہلاکت۔ اسی طرح قلب کے لیے بھی صحت و عافیت کی ایک حالت ہوتی ہے اور مرض و تکلیف کی ایک کیفیت، جیسا کہ قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ **فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ** (ان کے دلوں میں بیماری ہے) اللہ کا نہ جاننا زہر مہلک ہے اور خواہشات نفسانی کی پیروی کر کے احکام الہی کو ترک کرنا اور معصیت میں مبتلا ہونا قلب کا سخت روگ ہے۔ اللہ کی معرفت اس کے لیے زندگی بخش طریقہ ہے اور خواہشات نفسانی کی مخالفت اور احکام و اوامر الہی کی متابعت اس کے لیے دوائے شافی ہے جس طرح بدن کا علاج دوائے استعمال ہی سے ہو سکتا ہے اسی طرح قلب کے امراض کا معالجہ بھی دواؤں کے استعمال ہی سے ممکن ہے جس طرح حصول صحت جسمانی میں دواؤں کی تگ

کو عقلاء اپنی بصاعتِ عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس میں ان کو اطباء کی تقلید واجب ہے اسی طرح انبیاء نے امراضِ قلبی کے علاج کے لیے جو عبادتیں خاص حد و مقدار میں مقرر کی ہیں ان کی وجہ تاثر کا سمجھنا بھی عقلاء کی بصاعتِ عقل کے لیے ممکن نہیں، ان کو انبیاء کی تقلید واجب ہے۔ انبیاء نے ان خواص کو نورِ نبوت سے معلوم کیا ہے نہ کہ بصاعتِ عقل سے۔ نیز جس طرح دوائیں نوع اور مقدار سے مرکب ہوتی ہیں کہ ایک دوا دوسری دوا سے وزن و مقدار میں مضاعف استعمال کی جاتی ہے اور ان کی مقدار کا اختلاف حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اسی طرح عبادات بھی جو دوائیں ہیں امراضِ قلوب کی مختلف نوع و مقدار کے افعال سے مرکب ہوتی ہیں، مثلاً سجدہ رکوع سے دو چند ہوتا ہے، نماز فجر مقدار میں نماز عصر سے نصف ہوتی ہے! یہ مقداریں اسرار سے خالی نہیں اور یہ اسرار ان خواص میں سے ہیں جن سے نورِ نبوت کے سوا کسی اور کو آگاہی نہیں ہوتی، جو شخص طریقِ عقل سے ان امور کی حکمت کو جاننا چاہتا ہے یا ان کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ یہ محض اتفاقی طور پر مذکور ہوئے ہیں اور ان میں کوئی ایسا راز نہیں جو بطریقِ خاصیت موجب حکم ہوا ہو، وہ نہایت احمق اور جاہل ہے!

غرض انبیاء امراضِ قلوب کے طبیب ہوتے ہیں جن کے احکام کی تعمیل شفا کے قلبی کے طالبوں کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ شفا کے بدنی کے جو یا کے لیے امراضِ جسمانی کے طبیبوں کی ہدایتیں۔ اور عقل کا فائدہ صاف ظاہر ہے، اسی کے ذریعہ ہیں اس نکتہ کا علم ہوتا ہے! وہ نبوت کی تصدیق کرتی ہے اور خود کو ان امور کے ادراک سے عاجز پاتی ہے جن کو نورِ نبوت نے اور منکشف پاتا ہے! عقل ہمارا ہاتھ پکڑ کر اسی طرح نبوت کے حوالہ کر دیتی ہے جس طرح اندھوں کو راہبر اور متحیر مصیبتوں کو طبیبِ شفیق کے حوالہ کر دیا جاتا ہے عقل کی رسائی اور اس کی پرواز بس ہمیں تک ہے، اس سے آگے وہ قدم نہیں بڑھا سکتی! اب طبیب جو کچھ سمجھائے سمجھ لینا چاہیے، اور اس کی ہدایتوں پر کاربند ہونا چاہیے! اسی مفہوم کو حضرت اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

خرد سے راہِ روشن بھری خرد کیلے چراغِ رہز رہے!
 درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغِ رہز کو کیا خبر ہے؟ (ہاں جبریل)

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے (۲۰)
 جب عقل جذبات اور شہوات کے اثر سے بہک کر نورِ نبوت کا انکار کرتی ہے اور خود غیب کے دائرہ میں قدم زن ہوتی ہے تو اب اس کے ارشاداتِ عالیہ کی قیمت ان مستی کے اندوں سے بھی گری ہوئی ہوتی ہے جو کبھی کبھی مرغی بغیر مرغ کے دینے لگتی ہے اور اس قسم کی عقل والے کی باتیں سن کر ہم کہہ اٹھتے ہیں۔

ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیر دے خروس
 یہ ہیں غزالی کی یافت کے چند روشن پہلو! وقت کی تنگ دامانی ہیں مزید تفصیل کی اجازت نہیں دیتی ورنہ

یہ حنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
 ہمیر تہنہ مستقی و دریا ہچماں باقی!

تصحیح فکر

اے۔ اور تو ہمیں اندیشہ مابقی استخوان و ریشہ
گر گل است اندیشہ تو گلشنی و ربود خاکے تو ہمہ گلشنی (روحی)

افکار و خیالات ہی سے مقاصد و قایات کا تعین ہوتا ہے۔ مقاصد کو دارِ افعال و اعمال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے، جیسی سیرت ویسی قسمت لہذا جیسے خیالات ویسی کائنات۔ انا عند ظنک عبدی بی۔

یہ قانون ذہن کے دائرہ میں وہی صداقت و اہمیت رکھتا ہے جو قانون تجاذب دائرہ فطرت میں، قطعی و یقینی، جب سیرت اور قسمت کی تشکیل و تعین میں افکار و خیالات ہی کی کار فرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے افکار و خیالات کی اصلاح اس کا اپنا تہا بیت اہم فریضہ ہے۔ قوم سازی اور فرد کی روح کی تکمیل اصلاح خیال پر منحصر ہے۔

یک تنقیہ دماغی باید کرد

مقاصد و قایات کا دائرہ ذہن انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت و غایت سے خالی نہیں ہوتا، اب مقاصد کا تعین غور و فکر، سوچ اور بچار پر منحصر ہے۔ فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے، اور ہی ان دنوں انسان میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ قوت ہے۔ اس کی تربیت ہی کے متعلق مجھے یہاں کچھ کہنا ہے۔

۱۵۔ یہ مقالہ "بزم فلسفہ" کی کربھی نشینی کے موقع پر مستایا گیا جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبہ فلسفہ کی بزم مباحثہ ہے، اور "معارف" اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے اس کے لئے آپ کو چند قوانین پر عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہاں جائے، پھر اس جگہ کو مسطح اور خش و خاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر زمین پھولوں یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب کرنا چاہیے، اور اس عمرگی سے تیار کی ہوئی زمین میں انہیں بونا چاہیے۔ ہمیں اس امر کا بھی خیال ہے کہ بیج عمدہ ہیں، ناقص نہیں، پھر موسم گرمیاں ان بیجوں کو پانی دینا پڑتا ہے، تاکہ شدتِ تمازت انہیں جلانہ ڈالے۔ اب ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وقت مقررہ گزر جائے اور بالآخر گل تر رونمائی کرے، اگر بے صبری سے ہم بیجوں کو کھود کر دیکھنا چاہیں کہ یہ جل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجوں کو نشوونما کا موقع نہیں ملے گا۔ بعض دفعہ ہمیں کچھ زیادہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم نے زمین کو خش و خاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کی، آبیاری کی ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ ایک دن زندگی دامنِ زمین چیر کر پودوں کی شکل میں جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانہ میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ باد و باران، آفتاب و حرارت، بیجوں کے نشوونما کے لئے ضروری ہے، طوفان تک انہیں نقصان نہیں پہنچا سکے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کر رہی ہیں!

فرض کر دو کہ انتظار کی مدت بھرا اللہ گزر گئی، باریک بیجوں نے خوش رنگ و دل فریب لالہ و یاسمن کی شکل اختیار کی، فطرت کا زبردست لیکن مانوس مجروحہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، شروع ہی سے ہم جانتے ہیں، اور یہ علم مرتبہ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزاروں باریکیوں کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزوں کا اعادہ کرتا ہے جو اس پودے میں پائی جاتی ہیں، جس کا یہ بیج ہے، کیا اس بیج کو اصلی پھول کی نہ بھولنے والی صورت یاد رہتی ہے؟

پھول کی غایتِ تخلیق سے تو ہم واقف نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ ہمارے

دل کا سرور، آنکھوں کا نور ہے، کسی کے پاکیزہ الفاظ میں ہم اس کو "ربیع قلبی" نورِ بصیری، جلاورِ حزنئی، ذہابِ ہی، کہہ سکتے ہیں!

باغیانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہیں، کوئی بات نئی نہیں، لیکن میری دانست میں نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں، جو زندگی کہ بیچ میں مستور ہے، وہی ہم میں سے ہر ایک میں موجود ہے، ان چیزوں کے حصول کے لئے ہمیں زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولوں کے بیجوں کی ہم نے کی تھی۔

دلِ فریب پھولوں کے لئے آپ نے خارج (عالمِ اکبر) میں باغ لگایا تھا، شادمانی و مسرت کے حصول کے لئے آپ کو باطن (عالمِ اصغر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محل وقوع ٹھیک کہاں ہے؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدانِ فکر" میں لگانا ہے، کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں ایک عظیم الشان میدانِ فکر موجود ہے جس کی وسعت کو ارض و سما نہیں پاسکتے، صرف ہمارا دل ہی اس کو سما سکتا ہے، افسوس ہے کہ یہ میدانِ خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے، یہ جانتے ہو کہ یہ خس و خاشاک کیا ہے؟ وہی سلبی افکار و خیالات جن کو مختصر طور پر "شرانگیز" بد، غلط خیالات کہنا کافی ہوگا، واقفانِ راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہیں، ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہیے۔ اس راز کو سمجھنے کے لئے اس نفسیاتی قانون پر غور کرو، جس کا ہم نے ابتداء ہی میں ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اب یہ مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں، اعمال کی تکرار، عاداتِ راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرتِ سولہ ان عاداتِ راسخہ کے منظم مجموعہ کے کوئی اور چیز نہیں، اور ہماری سیرت ہی ہماری قسمت کا دوسرا نام ہے! سلبی خیالاتِ فاسدہ مقاصد کا

تعیین کرتے ہیں، انہی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادت بن کر سیرتِ بد کی تشکیل کرتا ہے، اب میکاھی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات سے ہم سب واقف ہیں، درد و رنج، غم و اہم، سرن و یاس۔

میدانِ فکر کا سببی خیالات کے خن و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے، اور نیک خیالات کی تخم ریزی لازمی، سببی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا زور مرد افگن ہوتا ہے، جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ بیماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے، اب حیات (یا چشمہ حیات) کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں، اس کے استیصال کی خاطر سہی، تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اور اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اگر ہمیں بے خوابی کا مرض ہے، تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظِ دیگر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائے گی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بھول جائیں تو ہم ٹھنڈی نیند سو جائیں گے، اسی طرح شر کے مقابلہ سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہیے، ظلمت کا مقابلہ نور سے۔ ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہیے۔ ظلمت کا مقابلہ ظلمت سے کرنا "ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے۔ اگر تمہیں نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو، خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و بہمت پر نظر جماؤ۔ خود غرضی کے بجائے ایثارِ نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمہیں غصہ کے بجائے حلم، بیماری کے بجائے صحت، کج خلقی کے بجائے خوش خلقی، شکایت کے بجائے صبر و شکر، حلق کی بہہ سانی

سے امداد میں حضرات و دوسروں کو دور کرنے کے لئے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور جو علاج پیش کر رہے ہیں اس کا استنباط ان ہی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عیب الابرار نفسیاتی طریقہ ہے۔

کے بجائے رازقِ مطلق کا خیال اپنے ذہن میں جانا چاہیے، تمہارا معروضِ فکر جو ہوگا، رفتہ

رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے، یہی معنی ہیں جایِ سامیٰ کے اس قولِ بلیغ کے

گرد و دل تو گل گذر دگل باشی و ر بلبل بے قرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است گردنے چند اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اس فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو، دُنیا میں وہی چیز بُری ہے جس کو ہم بُرا سمجھتے ہیں، اگر ہم اس کو بُرا نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے، لیکن وہ ہمارے قلب کو چھو نہیں سکتی، یاد رکھو دُنیا میں ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے، اور رائے تمہارے اختیار میں ہے، جب چاہو رائے کو ترک کر دو، پھر اس ملاح کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمتِ دری پہاڑیوں سے بچا نکالا ہو تمہیں ہر طرف سکون نظر آئے گا۔ اگر تم اپنی رائے کو ترک کر دو، تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی، کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا، اس شکایت کو ترک کر دو کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ عقلمند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں۔“

خیالات کا ماحول پر اثر ناقابل انکار ہے، خیالات کی سختگی اور قوت انسان کی روح کو سخت جسمانی تکلیف میں بھی مطلق اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا، یعنی خیال و فکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، ان ہی پر توجہ کو مرکوز کرتا ہے، ان ہی کو ذہن میں دہراتا ہے، اللہ تاپلنتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملو ہوتی ہے اور یہی خیالات عالمِ آثار میں عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں، خیال حقیقت ہے، عمل اس کا ظہور ہے۔ ولیم جیمس نے سچ کہا ہے ”زندگی کا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے ساری مشکل ذہنی مشکل ہے“

میدانِ فکر کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو۔ بارغ کے بچوں کی طرح خیالات کے انتخاب میں بھی حزم و احتیاط ضروری ہے، اور جس طرح سچ کو پونے کی

شکل میں نمایاں ہوتے کچھ عرصہ لگا تھا، اور تمہیں انتظار کہنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب میں تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل میں ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے، تمہیں پست ہمت نہ ہونا چاہیے اور نہ رنجیدہ۔ اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے، جس و خاشاک کو صاف کیا ہے نیک خیالات کے بونے میں احتیاط برتی ہے، تو شادمانی، دسترت، طمانیت و بردِ قلبی، سرور و کیف وہ گلہائے شاداب ہیں جو نتیجہ کے طور پر تمہیں حاصل ہوں گے۔

ان حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتے ہیں، کہ دنیا میں اس کا کوئی دشمن ہے تو خود اس کا نفس ہے، اعدایِ عدو و لہ نفسک التي بین جنبتک البیہقی من حدیث ابن عباسؓ) اس لئے نہ وہ کسی پر طاعت کرتا ہے اور نہ کسی کی مذمت، بردِ قلبی کے ساتھ محاسبہ، نفس کرتا ہے، صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید فرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بد یا سلی خیال کو داخل ہونے نہیں دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً نیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے، اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حالِ نتیجہ ہے ماضی کا، قسمت، نتیجہ ہے خیالات کا!

کامل گوید جہان تمام و اہل است
ناقص گوید کہ کوتاہ است و سہل است
شطرنج ہماں عرصہ ہماں رخت ہماں
ایں بردن و بافتن ز علم جہل است

(سحابی استرآبادی)

احساس

جانا بقمار خانہ رندے چند اند با مردم کم عیار کم پیوند ند
رندے چند اند کس نداند چند اند بزنیہ و نقد ہر دو عالم خندند
(محمود)

اس صداقت سے انکار مشکل ہے کہ 'احساس' فکر سے زیادہ عظیم قوت ہے جب حالت اضطراب میں ہم دماغ کے لئے ماتہ اٹھاتے ہیں، تو دماغ کے الفاظ (افکار) نہیں، بلکہ وہ شدید احساس جو ان افکار کے پیچھے ہوتا ہے زندگی میں تغیر پیدا کرتا ہے! ان جذبات و احساسات ہی کی قوت کے بل پر ہم چنچ اٹھتے ہیں۔

کوئین را چو نعلین انداختیم و رفتیم!
دیوانگانِ شاہیم رند برہنہ پائیم!

افکار کے ساتھ جب تک جذبہ و احساس کی آمیزش نہیں ہوتی، افکار و تعلقات میں قوت نہیں پیدا ہوتی، وہ بے جان ہوتے ہیں! ان میں گرمی ان ہی جذبات کی آتش درونی سے پیدا ہوتی ہے! مجھے اس صداقت کا احساس ابتدا میں ایک بیوہ سے گفتگو میں ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "یا وجود بے سرو سامانی کے میں کبھی فقر و قلت میں مبتلا نہیں ہوتی" اور اس کی وجہ اس نے یہی بتلائی کہ وہ ہمیشہ ہی محسوس کرتی تھی، کہ وہ غنی ہے! یعنی اس کا ہمیشہ یہ یقین رہا، کہ "حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کیا غم کیا کم!" ایک غنی مطلق کی معیت کا ادراک اس کے قلب کو غنا و بے نیازی سے بھر چکا تھا۔ اور اسی احساس نے فقر و اقلال کو

اس سے دور رکھا تھا!

حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:-

لَا تَحْشَى مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَابًا

یعنی خدائے قدیر سے قلت و فقر کے بارے میں ڈرو مت! اگر ہم اس علم صحیح کے بعد قلب سے خوف کو دور کر لیں اور خود کو غنی محسوس کرنے لگیں تو ہماری تمام ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں اور اتنا بچ رہتا ہے، کہ ہم انفاق بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہمارے قلب میں فقر کا خوف جاگزیں ہو جائے، تو پھر ہر اچھی چیز ہم سے بھاگنے لگتی ہے! گل تر بھی خار خشک ہو جاتا ہے۔

یہی حال صحت کا بھی ہے۔ یا وجود بیمار ہونے کے اگر ہم خود کو تندرست محسوس کریں، باطنی طور پر، تو بہت جلد ہم تندرست ہو جاتے ہیں! یا وجود بیمار ہونے کے تندرست کس طرح محسوس کریں؟ جواب یہ ہے کہ اگر ہم واقعی بیمار ہیں اور صحت قطعاً ٹوٹ گئی ہے تو ہمیں آرام لینا چاہیے اور دوسروں کو اجازت دینی چاہیے کہ ہمارا علاج کریں، لیکن اگر ہماری صحت محض خراب ہے تو تندرست محسوس کرنا تندرست ہونے کی حتمی تدبیر ہے! یہاں بھی یہ احساس کہ حق تعالیٰ "قوی" ہیں اور "سلام" ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ہیں، قریب ہیں، اقرب ہیں، محیط ہیں، ہمارے ظاہر و باطن، اول و آخر ہیں، ہمارے جسم و جان کو صحیح و تندرست رکھنے کے لئے کافی ہے، لیکن محض جاننا کافی نہیں، اس کا تحقق ضروری ہے۔ وہ احساس اور وجدان کی چیز ہے۔

تعقل علیٰ عہدہ چیز ہے اور وجدان قلب علیٰ عہدہ۔ تعقل یا عقلی علم "عقلیہ" ہے، روک ہے، مانع و حاجز ہے، اسی لئے عزراں حق کے لئے ہمیں عقلی علم کو ترک

کرنا پڑتا ہے۔ جب یہ علم ترک کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا آخری نشان بھی باقی نہیں رہتا اور اس کی کامل نفی ہو جاتی ہے تو ہمیں سب کچھ مل جاتا ہے اور ہم صحیح اٹھتے ہیں:

از کناہ خویش یا بم ہر دے من بوئے یار
چوں نہ گیرم خویشتن را ہر شے اندر کسار

(روحی)

صداقتِ مطلقہ کی یافت اُس وقت ہوتی ہے جب ہم تعقل کی سرحد عبور کر جاتے ہیں جب ہم علمِ انسانی سے دست بردار ہو جاتے ہیں تو ہمیں وہ دولت مل جاتی ہے جو ہمیشہ سے ہم ہی میں موجود تھی! جب ہم 'فکر' چھوڑ دیتے ہیں تو ہم 'سیکینت' لگے سمندر میں تیرنے لگتے ہیں۔ حضور و شہودِ حق و جہاننا و احسانا نصیبِ جان ہو جاتا ہے! دولتِ قرب و وصال ہمیں حاصل ہو جاتی ہے۔

موج دریاے ہوس ایجا غیا رسینہ است
گر شود این آب ساکن تحتہ آئینہ است

(درد)

تعقل و تفکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کو پانے کی جب تک کوشش کی جاتی ہے، وہ جانِ قلبیں پر ایک غلاف "شدید و غلیظ" پڑ جاتا ہے، یہ علم کا "حجابِ اکبر" ہے، یہ حق کی یافت میں سب سے بڑا حجاب ہے۔ جب ہم قلب کی سخت کوحی کی طرف کر دیتے ہیں، تو حجاب اٹھ جاتا ہے۔ "آگاہی و حضور" بالمرن قلب کی اسی کشش و نگرانی کا نام ہے جو ذوق و شوق، سرور و انشراح، جذب و مستی سے ہمیر ہوتا ہے! باطن کی یہی حالت فیض لے کیف بلا مزاحمتِ خطراتِ غیر و خیالاتِ ماموئی بلکہ بلا امتیازِ اعتباراتِ صفا تیبہ و اسامیہ و مقام ہے جس کی بشارت "الذین یؤمنون بالغیب" سے دی گئی ہے جس کو

متاخرین سلسلہ نقشبندیہ نے کمالات نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے!

اب ہمیں کُل میں اپنا صحیح مقام معلوم ہو جاتا ہے! سیاراتِ سماوی کی طرح ہم اپنے محور پر گردش کرنے لگتے ہیں، کُل توازن و توافق کے ساتھ! ہماری زندگی بے ساختہ و بے تکلف ہو جانے سے جس میں ہر چیز اپنے صحیح وقت پر اور صحیح طریقہ پر وقوع پذیر ہوتی ہے، ہمیں کُل سکینت و طمانیت نصیب ہوتی ہے اور ہمیں "فی جَنبِ اللہ" ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے، ذاتِ قیوم کا اسرار مل جاتا ہے اور ہم ساکن ہو جاتے ہیں یا رحمتِ حق کے سمندر میں تیرنے لگتے ہیں اور ہر جانب وجہ اللہ کا شہود ہونے لگتا ہے! ہر شے کو اپنے صحیح مقام پر ہر واقعہ کو اپنے صحیح وقت پر وقوع پذیر ہوتا پاتے ہیں۔

اس دولت کا حصول تعقل یا تفکر سے ممکن نہیں، یہ اور اے طور عقل ہے، عقل شاید دیر ہی تک رہبری کر سکتی ہے، اس کے بعد ہمیں وجدان و احساس کی مدد سے آگے قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ قرب و وصال کی نعمت کا اندازہ فکر و تعقل کے ذریعہ ممکن نہیں یہ صرف احساس و وجدان سے کیا جاسکتا ہے۔ "مَنْ ذَاقَ وَجْدًا، جَمَعَهُ حِکْمًا" پایا اسی کی پرورش ضروری ہے جو تعقل و استدلال سے بالکل مختلف چیز ہے۔

چوں جوں اس راہ میں قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں صداقت سادہ معلوم ہونے لگتی ہے! حق تعالیٰ کے عرفان کے لئے ہمیں زیادہ تر اس علم نظری کو ترک کرنا پڑتا ہے جو ہم نے ان کے متعلق حاصل کیا تھا، یہاں تک کہ ہر عقلی حکم کی نفی ہو جائے، جب اس طرح ہر شے کی نفی ہو جاتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں سب کچھ مل گیا! جو ہر جہاں ہنر کر کے ہم جاننا کو پاتے ہیں! ع

لعل تو چوں حاصل امرت جو ہر جاں گو میاش

عقل کے تہائے ہوئے وہ تمام بچیدہ نظریات، رموز و اسرار جو ہم نے سیکے تھے سب

”گو مباحس“ کے حکم میں آجاتے ہیں، جب ہمیں حق کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو پھر حق کے متعلق سارے نظریوں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی! اب جس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے وہ صرف تصور و شہودِ حق ہے! اسی ”نسبتِ باطن“ کی تقویت ہے! تصور و شہودِ ذاتِ حق علی الدوام بلا ملاحظہ اعتبار کے اذاعتبارت کر نیے و مسرور و ملتذ بودنِ باطن بہ اس حالت و جذب و کشیدگی دائمی الی اللہ علیٰ نبی مجہول الکلیفیت اس طرح کائنات کی قدیم گتھی حل ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات سے توصلیٰ تام حاصل ہو جاتا ہے۔ نظری و عقلی طور پر نہیں بلکہ عملی و واقعی تجربہ کی بنا پر!

ہر روز ہم اس مراقبہ کے لئے وقت نکال سکتے ہیں، ہم خدا کی عقلی تعریف کرنے کی کوشش نہیں کرتے، کیونکہ خدا تمام تعریفات سے ماوراء ہے۔ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ۔ ہم خدا کو عقل سے جاننے کی خواہش نہیں کرتے، ہم قلب کی گہرائیوں میں اس کو پاتے ہیں یا انفس کی گہرائیوں میں اس کی سکینت کا احساس کرتے ہیں! جب ہم مراقب ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ کو ہم اپنے پاس ہی پاتے ہیں۔ إِنَّهُ سَبْحَانَهُ تَعَالَى هُوَ الْأَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ فِي الْوَجْدِ كَذَلِكَ فِي الْوَجْدِ انْ

تجدنی فی سواد اللیل عبدی

قرباً منک فاطلبنی تجدنی

رات کی تاریکی میں اے بندے تو مجھے اپنے قریب پائے گا، مجھے ڈھونڈ

مجھے پائے گا ضرور!

مرا اندر شب تاریک یابی

ز جانِ خویش ہم نزدیک یابی

مرا نزدیک خود پیوستہ می دان

نمی دانی و گردانی بیابانی

یا پھر جب ہم "مراقبہ" میں خاموش بیٹھتے ہیں۔۔۔ خاموش، اشخاص و
 تعینات سے نظر قلب کو ہٹا کر ماسومی سے قلب کا تخلیہ کر کے، حق سبحانہ تعالیٰ
 کی ذات کی طرف توجہ بے جہت لگا کر نو ہمیں "توحیدِ محمدی" و توحیدِ مطلق کی
 حالت نصیب ہوتی ہے اور مبداءِ فیاض سے فیوض و برکات کی بارش ہونے
 لگتی ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارا مادی جسم تحلیل ہو رہا ہے اور
 ہم روح مجرد بن رہے ہیں! تمام مذاہبِ حقہ کا یہی مقصود ہے۔ مادہ سے روح
 کی طرف عروج، زمانی و حادث سے سرمدی و لازمانی کی طرف صعود! اسم - رسم
 سے گذر کر، نام و نشان سے پھوٹ کر فنیہ توجہ تنزیہِ مطلق و غیبِ صرف کو قرار
 دینا علو بہت اسی کا نام ہے اور بلند بہت حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہے۔
 اِنَّ اللّٰهَ يَجِبُ مَعَالِيَ الْاَلِهَمِّ! کیا خوب کہا ہے کسی نے:

اَنْ لَقَمَهُ كَهْدَرٍ دِيَاوَلٌ زَهْدٌ طَلَبُ

کیونکہ مقصود 'وصول' ہے نہ کہ 'حصول' اور مطلوب 'قرب' ہے نہ کہ 'ادراک'

يَسْمُ تَابِدُ اِيْنَ عَنَقَا بَدَا مَم

تنید نہائے دامش را غلام

کسے را اگر چہ برگ این سفر نیست

ہر از سود لے او چیزے دیگر نیست

دونوں صورتوں میں، خواہ ہم وصول تکمیل قائل ہوں یا حصول کے، قرب کے قائل
 ہوں یا ادراک کے۔ اکابر و ہودیہ کے پیرو ہوں یا اکابر شہودیہ کے، صورت حال
 مدارائے طور عقل ہے، درجہ ان قلبی کے دائرہ کی چیز ہے اور ہر وقت قلب کا نیاز و
 شکستگی کے ساتھ ذات الہی کی طرف متوجہ رہنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ توجہ
 الی اللہ بے مزاحمت خاطر ملکہ بن جائے اور یہی صورتیہ کی اصطلاح میں "حضور" کہلاتا

ہے، ذکر کا مقصود یہی حضور ہے! زندگی کا اصل مجاہدہ یا 'کوشش' یہی ہے اس کے ساتھ 'کوشش' کی امید لگی رہے!

در کریم سے مایوس و ناپسند ہے

عاشق کہ شد یا ز بجا لش نظر نہ کرد

لے خواجہ درویش و گریز عیب است

یہاں اس کا کام ادا کرنے فرانس و سنن ہو گدہ کے بعد ذکر و مراقبہ کے سوا کچھ نہیں یہاں تک کہ حضور کا بلکہ حاصل ہو جائے اور اس کے نتیجے کے طور پر "فنائے نفس" اور تہذیب اخلاق سے وہ مشرف ہو جاتا ہے اور 'اخلاق اللہ سے تخلق'!

"فنائے نفس" اصطلاح سو کہ ہے جس کا مفہوم 'حالتِ اطمینان' ہے ورنہ نفسی ناطقہ ہرگز فنا نہیں ہو سکتا، شریعت کی اصطلاح میں یہی حالت "اطمینانِ نفس" کہلاتی ہے اور "نفس مطمئنہ" اپنے رب سے یانہی و مرضی ہوتا ہے، وہی عیدِ کامل ہے اور دخولِ جنت کی اسی کو بشارت دی گئی۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ الْحَسْبَىٰ إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مُّرْضِيَةً فَإِنَّ مَرِيضِي
فِي عِبَادِي وَإِذَا خَلِي جَنَّتِي. (عم، ۱۳۶)

اپنے نفسِ مطمئنہ اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

خوب سمجھ لو، کہ تمام سیر و سلوک، کا حاصل، زندگی کا مقصود تھا سو فالہ اللہ کی گرفتاری سے دل کا آزاد ہو جانا ہے، دوامِ حضور و شہود کا میسر ہونا ہے، تاکہ اس کے نتیجے کے طور پر صبرِ بربلا، رضا بقضا، تحملِ کردہات کی قوت قلب کو حاصل ہو جائے اور مشہیاتِ نفسیہ سے وہ رُک جائے جب یہ دولت حاصل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے، کہ تمام مقامات و مراتب

حاصل ہو گئے۔ اب ہم اپنی زندگی طمانیت و سکینت سے بسر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

جَدائی مَمبَادَا مَرَا اَز خِیْدَا

دگر ہر چہ پیش آید مَشَانْدَم

(پہلو ان محمود)

قانون تجاذب

اور تعمیری سیرت

بدی کنی و نیک طمع می داری ہم ید باشد سترکے بد کرداری
 یا آنکہ خداوند کریم است و رحیم گندم ندید بار چو جو می کاری (ردمی)

قانون تجاذب (LAW OF ATTRACTION) ذہنی یا روحانی زندگی کا ایک ضروری کلی اور عالمگیر قانون ہے، نہ اس کی ضد قابل تصور ہے اور نہ اس کا کوئی استثناء ہے۔ کون شہمہ کر سکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلت پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیر اثر ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر مائل ہوتی ہیں اسی لیے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہوتو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے، قانون کی صداقت کا توہر کوئی قائل ہے لیکن یہاں اس کے بعض تضمنات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے۔

ہمیشہ ار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مماثل خیالات کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور ان کے درمیان اتیلاف یا وابستگی ہوتی ہے، اسی طرح بد، سلبی اور شرانگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں، تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے، اب اس کو بخوڑی دیر روکے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیری قوتوں کو مرکوز کرو، مماثل خیالات کا خطور شروع ہو جائیگا، رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہو جائیگی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگیگا اور تمہارے ذہن کی فضا

ان سے مملو ہو جائیگی، جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار و خیالات پر قابو پیدا کر لیا ہے وہ اس قانون کو تعمیری طریقہ سے استعمال کرتے ہیں اور دنیائے اپنی قوتِ فکری کا لوہا منواتے ہیں!

دیکھو مصنف کسی خاص موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے، ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے، وہ رات دن اسی میں غرق ہوتا ہے، سوتے جگتے، گٹھے بیٹھے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں افکار و تصورات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے، اور نامعلوم و ناقابلِ علم منبع سے خیالات کا چشمہ اُبنے لگتا ہے اور جب تک حالت نہ ہو مصنف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا!

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لیے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے، انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے، قانونِ تجاذب کا غیر مرنی عمل حاصل تصور کرنا کا ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے، ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے اور نظام بھی، یہ سب مبدع نامعلوم سے پیدا ہوتے ہیں، اور مقرر کا ذہن ان کی قیام گاہ ہوتا ہے! یاد رکھو کہ مفکر تصورات کا خالق نہیں حامل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا، وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر اس کو خیالات و افکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، یہ عطا ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

قانون کے نغمین و تعبیر سے واقف ہونے کے بعد حصولِ مسرت اور تزکیہٴ نفس یا سیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو، اس کی ترویج میں ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کریں گے۔ فرض کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا، اب بجائے اس کے کہ تم اس کو قبول کر لو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو، اور ذہن کو مماثل و سوسوں اور وہموں کا آئینہ بنا لو تمہیں چاہیے کہ اس وہم کی نفی کرو اور وہ اس طرح کہ مبدعِ علم کی طرف فوراً متوجہ ہو جاؤ، یعنی حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے لیکن

یوں اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو،

حَصَّنْتُ نَفْسِي بِالْحَيِّ الْقَيُّومِ الَّذِي لَا يَمُوتُ ابَدًا وَدَفَعْتُ عَنْهَا السُّوءَ عِبَادًا
الْعَبْرَ لِأَحْوَالٍ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ

یوں کہو "میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور آفتوں سے محفوظ و مامون" ان الفاظ کو پکار کر کہنے کی ضرورت نہیں محض ذہنی طور پر یہ کہے جاسکتے ہیں جو شخص اس طرح سلبی خیالات کو ذہن میں اترنے اور اپنی جگہ بنانے سے روکتا ہے، اور قانون تجاذب کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے عمل سے ان سلبی، فاسد اور تباہ کن تصورات کی تعداد میں اضافہ کرے اور قلب کو خوف و ہراس سے بھر دے، بلکہ اس کے برخلاف اپنی حقیقت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصورات کو اخذ کرتا ہے جو قانون تجاذب کے عمل سے ہر آن زیادہ ہوتے جاتے ہیں، ہر دم نئی طاقت حاصل کرتے جاتے ہیں، قلب کو قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے ہیں، اور و فور قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں، صحت کو درست کرتے ہیں، ماحول کو خوش گوار طریقہ سے بدل دیتے ہیں، موافق مرام نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں، یاد رکھو بیماری کی اصلی علت ذہنی ہوتی ہے، کیونکہ اگر ہم جراثیم کے نظریے کو بھی مان لیں تو بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر اس قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (POSITIVE) ہوتا ہے یعنی جو خود کو سلبی خیالات کا بازی گاہ نہیں بناتا، جو ہر دم و ساوس اور ہوا جس کی نفی کرتا ہے، اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدع یعنی اپنی حقیقت کو کسی آن فراموش نہیں کرتا، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ شکار کیسے ہو سکتا ہے؟ بیماری طبیعت کی

لے میں اپنے نفس کو محفوظ کیا اس ذات پاک کی مدد سے جو حقی اور قیوم ہے اور جو کبھی نہیں مرنے اور اپنے نفس سے بڑائی کو دور کیا، اسی کی حول و قوت سے۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں ضروری نہیں کہ ان ہی کا استعمال کیا جائے، ان کے بجائے کوئی اور موزوں الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

مذہبی سے پیدا ہوتی ہے، طبیعت اگر قوی ہو تو سب سے بیماری کا وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا نہ ہونا ہی عجز ہے، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے، سلبی خیالات منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضا کو مضہل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں، اور اسی لیے ان کو ایجابی و ثبوتی تصورات سے بدل دینا چاہیے ایجابی افکار کا سبب حق تعالیٰ ہیں، جوں ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رخ کیا، گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آئے، اب روشنی کی کرنیں آنہتہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، مضہل اعضا میں توانائی آتی ہے، قلب و جگر تازہ دم ہو جاتے ہیں، کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے صحت کے حصوں کے لیے اور اس کے قیام و بقا کے لیے اس قطعی و حتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو۔

قانون تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو، تم پر کسی نے زیادتی کی ہے، تمہارا ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے، تمہیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے، اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں کو مرکوز کر دیتے ہو، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے حائل خیالات کا هجوم قلب پر ہونے لگتا ہے، یہ تار یکا اندوہ خیز، زہریلے خیالات جو قانون تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں، تمہاری سیرت فنا ہو جاتی ہے، تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے، اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے، آتش انتقام کا سوختہ فائر دماغ اگر انتقام پر اترے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً مسرت و طمانیت قلب کے لیے مفید نہیں ثابت ہوتے۔

مرغ پزنا رستم چون پراں شود لقمہ ہر گریہ دریاں شود (معنی)

اب اگر تم دُعا اذہر و توکل علی اللہ (پہے ۳۷) پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کیے دیتے

ہو اور اپنے خیالات کی رو کو بدل دیتے ہو، سلبی خیالات کی بجائے ایجابی افکار کے قبول کرنے کے

لے چھوڑے ان کا ستانا اور پھر وہ کراہیں۔

لیے تیار ہو جاتے جو تو تمہیں ان تمام شرانگیز و فتنہ خیز نتائج سے نجات مل جاتی ہے، اور اب تجاذب کا قانون تمام اچھی چیزوں کے رخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے، اب تم کو حقیقی معنی میں حریت نصیب ہوتی ہے، طمانیت حاصل ہوتی ہے، ہسرت میسر ہوتی ہے، کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غضب سے پاک کیا، ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا اور تمہاری ہستی کا ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا، اسی لیے تو کسی عارف نے کہا ہے :-

عالم تمام یک گل بے خاری شود! دل را اگر ز کینہ مصفا کند کے
 ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا ردِ عمل، ہر علت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلی اور ضروری ہے، اب کینہ و غضب کے جذبات کا لازمی و جبری نتیجہ غم و حزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اسی طرح عفو و احسان و رحمت، کرم، صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت و طمانیت، تواضع و الفت، فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؛ علیت کے اس کلی عالمگیر، وجودی و لزومی قانون پر یقین ہو جائے تو اَحْسِنِ اِلٰی مَنْ اَسَاؤَ لَکَ عَمَلٍ پُرِئَ لَکَ مِنْهُ کُلُّ شَيْءٍ کہیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر تمام المعروفت کے سریلے نعروں میں یوں کرتے ہیں :

ہر کسی در راہ من خاکے نہ من گل نیم! او منراے خار یا بدن جزاے گل برم
 یہ سن کر اور ماں کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو، کیا یہ میرے بس کی بات ہے، میں بہر حال بشر ہوں اور فطرۃً مائل بہ شر ہوں، فطرۃً ظلوم ہوں، جہول ہوں، قلت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں، ان صفاتِ عذیبہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جاسکتا ہے، ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے کہ
 پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے! (غالب)

لہ جس نے تمہارے ساتھ بڑائی کی ہے اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو اور ہم تمہیں ایک نفسیاتی طریقہ بتلاؤں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہوگی۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہنچا ہے، اور جس کے خیال سے تمہارے بدن میں سوزش ہوتی ہے اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لیے تمہیں چاہیے کہ پھر دن اس صداقت پر غور کرو۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ
فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو
عَنْ كَثِيرٍ رَبِّكَ يَعْلَمُ
اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی
ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے
تواضع و رگزاری کر دیتا ہے۔

نیز انہا ہی اعمال کو تو د علیکم (اللہ) یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹنے جلتے ہیں
ذرا سوچو اصل میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا
کمایا ہوا ہے، اور اسی کے عین کا تقاضا یہاں کسبتا و فوٹو نفخہ۔ دوسرے کو اپنے افعال
کا ذمہ دار قرار دینا تمہاری عقل کی کجی اور جذبات کی قافی کی دلیل ہے، جوں جوں تم اس
صداقت پر غور کرتے جاؤ گے تم پر واقعات کھلتے جائیں گے، اور ہر آفت، ہر مصیبت کی علت تم
اپنی ہی حماقت کو پاؤ گے! اگر سلسلہ تفکر کو چند روز جاری رکھو گے تو حقیقت اس قدر
مبہین ہو جائیگی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری تھی کسی دوسرے کی نہیں اور حق تعالیٰ کی
طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ لِّلْعٰبِدِيْنَ
ہرچہ بہت از قامتِ ناسازی اندامِ ماست ورنہ تشریف تو ہر بالائے کس کوتاہ نیست
اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے
کے قابل ہو جاؤ گے۔

۱۷ تیرے ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے۔

۱۸ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اگر تم جذباتی انسان ہو عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے اور مذکورہ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے :-
 جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی نظروں کے سامنے لے آؤ اور اب اس کو مخاطب کر کے کہو :- میں تمہیں (نام شخص) حسبہ بشر پوری طرح معاف کرتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نورانی کر دیں، آمین“

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل و خلوص دل کے ساتھ کرتے رہو تو کچھ دن تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ تمہارے لیے اس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو ہیں، اپنے اس مجاہد سے اگر تم نے حسن خلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفلکے باو دان سے وفا کی، رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنایا، اور ان کے لیے بخشش و عفو کی دعا کی، تو اب حقیقی مسرت، طمانیت، سکون، برد قلبی، محبت، وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطا کیے جائیں گے، اور وہ تمہیں بطریق اجتناب اپنی جانب کھینچ لینگے۔

راہ بسیار است مردم را بسوئے حق ولے

راہ نزدیکش دل مردم بدست آوردن است

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ، بِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ

(پارا ۶۴)

لے بیشک یہی بڑی مراد منی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں محنت کرنے والے۔

قرآن اور سیرت سازی

مشہ نیست کسے کہ تختِ علیہ صدارت تا آنکہ نہ شاہانہ فریبے دارد

یعنی کہ خروس پیش از باب شعور سلطان نشود اگر چه تلبے دارد (ورد)

دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شے، سب سے زیادہ گران قدر اور عزیز شے، پاک سیرت ہی زندگی تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ مربی و معلم ہیں، واقعات و حادثات وہ آلات و ادوات ہیں جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت کی تکمیل کر رہے ہیں، دنیا کی ”روح ساز“ وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت ہی کے تختہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں زندگی کی غایت ہی یہ نظر آتی ہے کہ سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے، کیوں اس لیے کہ سیرت ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، سیرت ہی پر فوزِ آخرت کا مدار ہے، دین و دنیا کی اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے، سیرت ہی پر جسمانی اور روحانی صحت مبنی ہوتی ہے، اور بردِ قلبی اور طمانیتِ خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے، بنی آدم کا ”اکرام“ سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو انسان پاک سیرت نہیں وہ صورتہ گوار انسان ہے، لیکن حقیقتاً وہ حیوان ہے، یا دیوس ہے یا غول ہے، ”شیاطین الانس“ میں اس کا شمار ہے، وہ دنیا، دین اور آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے!

سیرت، علمائے نقیبات کی باریک بین اور دور رس نگاہ میں ان تیغقات، عادات، میلانات کا مجموعہ ہے جو فرقہ کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دونوں سے تمیز کرتا ہے، اور اس کی وحدتِ کردار کا باعث ہے، ہر فرد دوسرے فرد سے تمیز ہوتا ہے، صورت اور

اسے یہ مقالہ سعادت میں مارچ ۱۹۳۶ء میں اول مرتبہ شائع ہوا۔

سیرت میں، صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کی جاسکتی، اور نہ کوئی اس کو رفع کرنا چاہتا ہے، لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہو سکتی ہے، یہ مماثلت عینیت نہیں انفرادیت ناقابل انکار ہے، باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے، اور اس انفرادیت کا مبداء، اور اس کے وہ اقتضارات و قابلیتات ہیں، جو اپنا ظہور عادات و افعال میں کرتے ہیں اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے، اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرو کے افعال کی پیشین گوئی ممکن ہو جاتی ہے۔

سیرت کی تحلیل میں ہیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ عادات کی تنظیم کا نام ہے عادت کی تشکیل افعال کی تکرار سے ہوتی ہے، افعال کا صدور و نظام حرکات پر مبنی ہوتا ہے، لیکن حرکات کا ماخذ و منبع وہ تیغناات و اذعانات ہوتے ہیں، جو انسان زندگی کے تجربات ماحول کے اثرات، تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ علم یقین عمل و عادات یہ وہ اہم عناصر ہیں، جن میں سیرت کی تحلیل کی جاسکتی ہے، سیرت سازی کے طریقے کو جاننے کے لیے ہمیں ان ہی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی۔

(۱) علم یقین: العلم نکتہ، سیرت سازی کے لیے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجمالی علم کافی ہے، پھر عقلی طور پر اس کی تفصیل و توضیح میں دفا تر بن گے جاسکتے ہیں۔

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است تعلیم کن گرت بدین دسترس است

گفتم کہ الف، در گفتم بیج در خانہ اگر کس است بکوف بس است

(شیخ عزیزالدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی، حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے، اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشید عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے، اس اقرار کے تضمنات پر غور کرو، جب میں ایمان و اذعان کی شاہانہ قوت سے حق تعالیٰ کے الہ ہونے کا اقرار کرتا ہوں تو سب سے پہلے میں بیان

رہا ہوں کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہیں، عبادت کیا ہے، یہ غایت
 نڈلی کا نام ہے، اظہارِ ذلت کا نام ہے، میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے تو بس میرے خالق،
 میرے مولیٰ، میرے مالک و حاکم ہی کے سامنے جھک سکتا ہے، اور غیر کے سامنے ہرگز
 نہیں جھک سکتا! اظہارِ ذلت کی وجہ کیا ہے؟ میں فقیر ہوں محتاج ہوں، میرا معبود غنی ہے
 قوت و اقتدار سے متصف ہے، علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، مستعان
 ہی، مدد کرنے والا ہے، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہارِ ذلت کرتا ہوں اور
 جانتا ہوں کہ سارا عالم فقیر ہے، اور میرا معبود ہی صرف غنی و حمید ہے، میں اس کا فقیر ہو کر سارے
 عالم سے غنی ہوں، میرا یہ احساس کہ میں اس شہنشاہ کا درپودہ گر ہوں، جس کے درپوزہ گرسائے
 شاہ و گدا ہیں مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں کفی باللہ و کیلا کہہ کر عبادت
 و استعانت کے نقطہ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہوں، اور فقر و ذلت یا بندگی کی
 نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں، اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لیے نامید و
 کام کربن سکتی ہے، اور نہ خوف و ہراس کا سبب، ان سبب کا فقر، ان سبب کی ذلت و مجبوری،
 بیچارگی و بے بسی میری نظروں میں اتنی ہی آشکارا و ہویا ہو جاتی ہے جتنی کہ خود میری بکسی و مجبوری،
 ہم سب عبد ہیں، کوئی چیز اصالتاً ہماری نہیں، فقر ہماری ذاتی صفت ہے، امانت چنڈ روز
 کے لیے چند چیزیں ہم کو دی جاتی ہیں، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھتے ہیں، حقیقی مالک کو بھول جاتے
 ہیں، انہی کی محبت میں فریقہ ہو جاتے ہیں، حقیقی اقدار سے غافل ہو جاتے ہیں، ناگہاں یہ
 طلسم ٹوٹ جاتا ہے، اور یہ ساری محبوب و مرغوب چیزیں موت ہم سے چھین لیتی ہے، اور پھر اپنے
 اصلی فقر و ذلت کے ساتھ ہم نادم و پشیمان اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے
 اعمال کے اثرات کو، اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثار و عواقب کو جو اس دنیا میں
 بھی اپنی موجودگی کا مختلف رنگوں میں ہیں احساس بخش رہے تھے، زیادہ نمایاں زیادہ واضح
 اور آجا کر طریقے سے دیکھیں، اور حسرت و ندامت کی آگ میں جلیں۔

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، جن کے آگے یہ میرا سر جو سارے جہان کے مقابلہ میں معزز و مغتر، بلند و بالا ہے، فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے اور حیات و علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی استدعا کر رہا ہے، اور غیبر منزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے کہ جو اس کی آنکھ چاہے جو تماشاد کھلائے، اور وہم چاہے جو مانے اور منوائے، یہ ساری نعمتیں حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں، ان کے سوا نہ کسی میں حول و قوت ہے اور نہ فعل و اثر و مابیکہ مین نعمتہ فمن اللہ! صورتوں سے جو ہم نے امیدیں باندھ رکھی ہیں، صورتوں کو جو ہم نے خوف کی چیزیں سمجھ رکھی ہیں، صورتوں کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہیں، اور صورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، اور ان کو رب بنا رکھا ہے، کیس قدر عظیم الشان دعو کلہ ہے، اس کے ضرر و اصلال کا پہلو کس قدر قوی ہے، عزت نفس کی خونریزی کو دیکھو، اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو، اس کذب و افتراء کے نتائج پر غور کرو، فقیروں کے در پر سوال کرنے سے بھی کچھ ملتا ہے، اس غریب کے ہاں کیا رکھا ہے جو دوسروں کو دے، امیدوں کا خون ہونا لازمی ہے، حسرت و حرمان قطعی، جو بیچارہ اپنے درد دکھ کو دفع نہ کر سکتا ہو، وہ تمہارے درد و غم کا کیا علاج کر سکتا ہے، وہ تمہارا مولیٰ و رب ایسے ہو سکتا ہے، اے تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کر دیا ہے، بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کر رہے ہو، زندے کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوئے ہو، تمہارے وہم نے تمہیں کس انتباس میں مبتلا کر رکھا ہے!

بقول دشمن پیمان دوست شکستی نہیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

معبود و مستعان صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی سے ہیں جو بڑنا چاہیے، وہی ہماری امیدوں کے مرکز ہیں، ان ہی کی ناراضی سے ہمیں خوف کرنا چاہیے، اور چوب و سنگ یا گوشت و پوست کے جھوٹے خداؤں سے بندگی کی نسبت قطعاً تو رہینی چاہیے، ان سے نفع و ضرر کی توقع قطعاً چھوڑ دینی چاہیے۔

پانچدگہ از چوب گہ از سنگ تراشا گذر از خدائے کہ بصد رنگ ترش

حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت پر یقین، یہ ایمان سیرت کا سنگ بنیاد ہے، اس یقین کی پرورش ہونی چاہیے، الہ باطلہ کی نفی، الہ حق کا اثبات قلب کی گہرائیوں میں ممکن ہو جائے تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہو، رگوں میں خون کی طرح دوڑ جائے، علم یقین کے مرتبہ سے گزر کر حق یقین کے درجہ تک پہنچ جائے، تحقیق ہو جائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے، جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کر سکتی، وہ لفظائے مخلوق باخلاق اللہ خلق الہی سے مزین ہوتا ہے، تمام صفاتِ رذیلہ سے پاک اور تمام اوصافِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے، کامل عبد ہوتا ہے، جس سے بہتر جس سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شے نہیں ہوتی،

توحید معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہیں اور مستحق عبادت ٹھہرتے ہیں، ہمارا سر حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے جس کے گے ساری کائنات سرنگوں ہے، طوعاً و کرہاً اور توحید ربوبیت کی رو سے حقیقی عامل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں وہی خالق ہیں، وہی نافع و ضار ہیں، وہی زندہ کر پتے ہیں اور مارتے ہیں، ہمارا باکھدان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے، اور انہی سے ہم مزد و اعانت کے لیے درخواست کرتے ہیں! غنی کی فقیر ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے!

دیکھو توحید معبودیت و ربوبیت کا سبق دے کر عرب کے اُمّی معلم (فداہ ابی وائی) نے اپنے متبعین کو صفاتِ رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفاتِ حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا، صفاتِ رذیلہ جن سے تمام علماء اخلاقِ قلوب کا تذکیہ چاہتے ہیں، اس رباعی میں یوں ادا کیے گئے ہیں۔

خواہی کہ دولت شود صاف پوائینہ وہ چیز بڑوں کن از درون سینہ
حرص و حسد و بغل و حرام و ظلمیت کذب و غضب و کبر و ریاد کینہ

دیکھوان صفاتِ فیجہ سے قلب کا تزکیہ سقراط کے "طنزیات" افلاطون کے "مکالمات" ارسطو کی "اخلاقیات" اور جدید فلسفیوں کے عالمانہ "خطبات" کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لادالہ الہ اللہ کے مختصر جملہ کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہے، خود ہی کو اس کا مالک جانتا ہے، نہ حرص کا اس کے قلب سے تسلط اٹھ سکتا ہے اور نہ نخل و حسد کا، جون ہی اس نے سچے دل سے توحید فی الاتار کا اقرار کیا، اور یہ مان لیا کہ لَمَّا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا، اللہ ہی کے لیے ہے سائے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، تو اس نے اپنی مالکیت و حاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت و حاکمیت کا اثبات کیا، حقیقی مالک و حاکم و متصرف حق تعالیٰ کو جانا، اور اپنی ذات کو محض "امین" سمجھا، اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، امین امانت کے شرائط کے تحت ہی تصرف کا اختیار رکھتا ہے، اب اگر دولت پر جو اس وقت اس کی امانت میں ہے، کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے، اگر بچ نہ سکے تو جانتا ہے کہ مالک حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے، اور خوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح نہ اس کے جانے کا اس کو سبب ہوتا ہے، اور نہ اس کے آنے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اختلال پیدا کرنے والے تاثرات سے پاک اور آزاد رہتا ہے، اور وہ ۶۰:

یک دل دلے بس است یک دوست ترا

کہہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، اور ایک دم رنج و غم، پریشانی و پشیمانی کے تمام احساسات و جذبات سے حقیقی معنی میں نجات حاصل کر لیتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

لَكَيْلًا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَاَنْتُمْ كُوْلُوْا تَفْرَحُوْا تَاْكُمُ غَمٌ نَّهَكَوْا اس پر جو ہاتھ دیا اور شیخی نہ کرو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱۹۶)

اس پر جو تم کو اس نے دیا۔

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حرص میں کیسے ہو سکتا ہے، جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے، اور ان احمقوں کو جو اپنی ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں، مخاطب کر کے کہتا ہے:-

گماں میر کہ زرو سیم دادہ اند ترا ودیعتے است کہ داری بدست روزے چند
 چه سود گر لبوی غسّره بر متاع کسے چویش بر سرد کاں روستا خرسند
 حرص کے ساتھ بخل و حسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں، جب مال و دولت و دیعت و امانت ہیں اور وہ بھی چند روزہ امانت، موت کے وقت یہ تم سے واپس لے لی جاتی ہیں، اور دوسروں کے حوالہ کی جاتی ہیں، تو پھر اس علم کے بعد ہماری ذہنیت اس چوہیا کی طرح کیسے رہ سکتی ہے جو بیلیے کی دکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک و متصرف جان کر بخل و حرص کا شکار بنتی ہے، غیر کے مال میں بخل بے معنی ہے، بخل ہوتا ہے اپنے مال میں مال اپنا نہیں، پھر بخل کیسا؟ حرص کی بنیاد ہی اس خیال پر قائم ہے کہ مالک ہم ہیں، حقدار ہم ہیں، ہم کو نہیں مل رہا ہے، دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے! جب مال میرا ہے، نہ تیرا بلکہ مالک حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد و حرص اور ان کے لازمی نتائج، غم و غم، درد و جزب و سنج و الم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا، یعنی شرک کا، جوں ہی شرک کی جڑیں قلب سے لالاکہ اِلَّا اللّٰہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں، اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہو گئی انسان ان تباہ کن جذبات کے خنجر سے نجات پا جاتا ہے، حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، سکون و بزرگی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

کبر و فخر و عجب کی اس قلب میں گنجائش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم، مالک نہیں مملوک، رب نہیں مرئوب، مولیٰ نہیں عبد سمجھتا ہو، اپنی حکومت و مملوکیت کا یقین جو موقد کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے، فخر و غرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔

اس کی عضویت اس زہر کو قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی۔
 اب توحید فی الربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو جب تم نے فاعل حقیقی حق
 تعالیٰ کو مان لیا، لا حول ولا قوۃ الا باللہ کے قائل ہو گئے، نافع و ضار فی الحقیقت
 انہی کو سمجھنے لگے، تو خوف و حزن سے تم نے دستگیری حاصل کر لی، غیر کو نافع و ضار
 قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہنچنے کی امید ہوتی ہے، اور اس اُمید
 کی شکست حزن و غم کو ضروری طور پر پیدا کرتی ہے، اس سے ضرر کا اندیشہ تمہارے سینہ کو
 خوف سے بھر دیتا ہے، جو انہی تم نے وہم کے اس بت کو توڑا، اور حق تعالیٰ کی اس تشبیہ
 کو یاد کیا، کہ

وَلَا تَدْرَأُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ
 وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا
 مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (پ ۱۶۶) جو جائیگا ظالموں میں۔

غیر اللہ کی ربوبیت تمہارے قلب سے فنا ہو گئی، نفع کی اُمید، ضرر کا خوف تمہارے سینہ
 سے جاتا رہا، اور حزن و خوف سے تم نے ہمیشہ کے لیے نجات پالی۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا
 فَلَا يَخَافُ عَلَيْهِمْ وَعَذَابُهُمْ
 ثابت قدم رہے تو نہ ڈریں ان پر اور نہ وہ
 (پ ۲) غمگین ہونگے۔

ربوبیت پر جہاں تم نے استقامت پیدا کر لی کہ دنیا اور زندگی کے متعلق تمہارا سا را نقطہ
 نظر بدل گیا، نقطہ نظر کا بدلنا تھا، کہ زمین و آسمان بدل گئے۔

جو پر خیز خیال از چشمِ احوال زمین و آسماں گرد و مہدِ
 ایک وہم تھا، خیال تھا جس نے تمہیں خوف و حزن کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، اب تم
 نے اس خیال کی تصحیح کی، ذہنی صحت تمہیں حاصل ہوئی، نور کی طرف تم نے اپنا منہ کر لیا،

اور تمہاری روح اپنے خالق و حاکم کو مخاطب کر کے چیخ اٹھی۔

اللَّهُمَّ اسَلَمْتُ نَفْسِي إِلَيْكَ وَ
وَجَّهْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ وَكَوَّضْتُ أَمْرِي
إِلَيْكَ وَالْجَنَاتِ طَهَّرْتَنِي إِلَيْكَ رَغْبَةً
وَرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنجَاةَ مِنْكَ
إِلَّا إِلَيْكَ لَهُ
کام کر تو ہی ہے۔

اس اقرارِ ربوبیت کے ساتھ ہی تم نے اپنے قلب میں طمانیت و راحت محسوس کی، اعدائے
یقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمہیں لفع و ضرر سے خالی، تمہارے ساتھ تعاون
عمل کے لیے تیار، تمہارا رفیق و خادم نظر آنے لگا! زندگی کے راستے میں تمہارے قدم ہر ایک
انداز میں اُٹھنے لگے، تمہارا سینہ کینہ سے پاک ہو گیا، کیونکہ تمہارا یہ وہم دور ہو گیا کہ سوائے حق
تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہو سکتا ہے، جو اس کی آنکھوں کو
دشمن بے رحم دیکھ رہی تھی، ایمان کی آنکھ اس کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلا رہی ہے اور سعدیؒ
کے پراثر الفاظ میں کہہ رہی ہے

چوں دشمن بے رحم فرستادہ اوست بدعدم اگر نہ دارم این دشمن دوست
اسی وقت غیظ و غضب سے بھی تمہارا نفس پاک ہو گیا، دوست پر غضب کیسا؟ اس یقین
کے بعد کہ ہر آفت ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے، معلوم حقیقی کی طرف
سے تلبیہ ہے جو ہمیں اپنے نقائص و ذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کی اصلاح کا موقع
دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمالیہ رخ پھیر دیتی ہے، حق تعالیٰ سے
جوڑتی اور نفس و شیطان سے توڑتی ہے، ہاں پھر اس یقین و اذعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ و
غضب کا محل کیسے بن سکتا ہے؟

یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جو مولانا سید محمد رفیع نے روایہ ہجاء عن البراء بن عازب رسول اللہ ﷺ سے وقت آنحضرت
پہنچا رہتے تھے۔

ریا جو خلق کے لیے اپنے اعمال کی تڑپیں ہے، اسی وقت ممکن ہے جب خلق کو نافع و
 ضار سمجھا جائے، اخلق سے توقعات وابستہ ہوں، یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور
 ہو جانے کے ساتھ ہی ریا کاری اور تصنع و نمائش کی جڑیں کٹ جاتی ہیں، عمل صرف حق
 تعالیٰ ہی کے لیے جاری ہو جاتا ہے، حور و قصور کے لیے نہیں رہتا، کیونکہ یہ بھی مخلوق ہیں
 اور مخلوق سے نہ راحت ہے اور نہ سرور و عزت اور نہ یہ مقصود بالذات۔

کذب یا دروغ بانی کا محرک یا تو لفع کا حصول ہوتا ہے یا ضرر کے دفع کا خیال یا
 پھر خود بینی و خود ستائی، کبر و فخر، عجب و ریا، ہم نے اوپر دیکھا کہ ربوبیت حق ان صفات
 ذمیرہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لیے موجد کا قلب صداقت کا خزینہ ہوتا
 ہے، وہ وعدوں کا پکا، قول کا سچا ہوتا ہے وَالْمُؤْمِنُونَ بَعَثْنَا فِيهِمْ أَخِيًا عَاهِدُوا لِمَعصِدِ
 اِذِی طَرَحَ غَيْبَتِ مُشْرِكِ فِي الرُّبُوبِيَّةِ كَانِتَجِبَةُ، غیبت کی وجہ یا تو عداوت ہوتی ہے

جس کا محرک نقصان و ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی
 شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اس پر یقین ان تمام ذمائم کی بے خطا دوا ہے، جیسا
 کہ ہم نے اوپر ثابت کیا، غیر اللہ کو حقیقی نافع و ضار قرار دے کر عداوت و بغض و حسد میں
 مبتلا ہوں، اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ التباس کو صحت علمی نے
 دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی۔

غرض تڑکی نفس و تصفیہ قلب یعنی سیرت سازی کے لیے سب سے پہلے شرک فی
 المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے، لا کی شمشیر سے مالکیت حاکمیت
 اور ربوبیت ذواتِ خلق سے کاٹ دی جاتی ہے، اور الہ سے اس کا اثبات ذات حق میں
 کیا جاتا ہے، اور اس طرح اخلاق الہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا
 کی جاتی ہے، اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لیے ضروری ہیں اس کی توضیح

لے پورا کرنے والے اپنے اقوال کو جب عمدا کریں۔

میں چند مقامات کا پیش نظر رہنا لازمی ہے۔

ابتداء میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے، لیکن علم سے مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہیے، جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے، لیکن قلب میں جا کر سن نہیں ہوتا، اس لیے عمل کی صورت میں نمایاں ہونے کی قوت نہیں رکھتا اور اس لیے منفعت بخش نہیں ہوتا۔ علم سے مراد ہماری مراد وہ یقین و اذعان ہے جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے، خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے، دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے، اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، ایسا یقین تفکر و تردد و پامراقبہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے تفکر کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے، تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے۔ مضبوط ہوتا ہے، تلویں جاتی ہے، تکمیل رونما ہوتی ہے اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا خارج میں ظہور کرتا ہے۔ جب عمل کی تکرار ہوتی ہے، تو عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو فطرتِ ثانیہ کہلاتی ہے، اب عمل کے لیے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے، مضائقہ رفع ہو جاتی ہے، سہولت پیدا ہو جاتی ہے سیرت قائم ہو جاتی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے۔

چند روز جہد کن باقی بخند

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجہ

کرنی چاہیے۔

(۲) **مجاہدہ**: پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدہ کے ممکن نہیں اسی طرح بغیر عمل صالح اور مجاہدہ کے اس کی تمام خوبیوں کا نمایاں ہونا بھی ممکن نہیں

لہ لیے علم سے استغاذہ کیا گیا ہے۔ اعوذ بک من علم لا ینفع و من قلب لا یختم۔

لہ تفکر ساعة خیر من عبادة سبعین سنة (الدیلمی و روی ابو شیخ من حدیث ابو ہریرہ)

تہ قل انی اعظکم بواحدة ان تقوموا لله مشغی و فرادی ثم تفکر و (پارہ ۱۲) سے تفکر کا

علم صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

اسی لیے فرمایا گیا، جَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَتَّىٰ يُجَاهِدَ اللَّهُ عَنْكُمْ، اور صبح عقیدہ مجاہدہ کی چشم بصیرت مافوق
 کے سامنے نیکیوں کی تمام راہیں کھول دیجاتی ہیں۔ وَالَّذِينَ جَاهِدُوا مِنَّا نَهْدِي لَهُمُ
 سُبُلَنَا، اب ہمیں مجاہدہ کی ماہیت اور اس کے طریقوں کو سمجھ لینا چاہیے۔

ذرا اپنے ذہن کے نہان خانہ کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظہ خیالات، تصورات،
 خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے؟ علم کا ایک دریا ہے کہ اٹھا چلا آ رہا ہے،
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لامتناہی مبداء سے نکل رہا ہے، اس کی ماہیت و نوعیت
 پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا اضلالی۔ اس کی آمد
 کسی طریق سے روکی نہیں جاسکتی، کونسی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو
 محض ارادہ کی قوت سے پیدا نہ ہونے دینا بشری طاقت سے باہر ہے، خیالات آزادی
 کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ
 ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور نہ ان کے فنا کرنے پر! لیکن انسان کو اتنی طاقت دی
 گئی ہے کہ اپنی توجہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدایتی علم کی طرف مبذول کرے، یا
 نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے، یہی مجاہدہ
 کی ماہیت ہے، ذہن میں سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری و اضطراری طور پر پیدا ہو رہا
 ہے، اب یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس خیال کو گلے سے لگاؤں، پیار کروں، قلب کے
 میدان میں تخت بچھا دوں، اور اس کو مغز زہمان کی طرح عزت و وقار سے بٹھا دوں، یا یہ
 کہ اس کے ذہن کے دروازہ سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو
 اس کی سرکوبی کے لیے آؤں، اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑا دوں، ظاہر
 ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلہ میں نور ہی کامیاب ہوگا، کیونکہ ظلمت نور ہی کے غیاب کا

۱۔ مجاہدہ کروانہ کے واسطے جیسا کہ چاہیے اس کے واسطے مجاہدہ کرنا (پہلے ۱۷)

۲۔ جنہوں نے پہلے سے واسطے مجاہدہ کیا بہانہ کو اپنی راہیں بھاریں گے (پہلے ۱۷)

توام ہے، نور ہی کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے چھا سکتی ہے! مجاہد حق تعالیٰ ہی کی حول و قوت سے اضلالی علم کے بجائے ہدایتی علم پر عمل کرنے کا نام ہے، اضلالی خیالات کے ذہن میں خطور کرنے ہی مجاہد کی روح "خیر کے مبدئ" کی طرف استعانت کے لیے متوجہ ہو جاتی ہے، استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہیں کرتی اپنی بچاؤگی سے واقف ہوتی ہے، لامتناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہنچ جاتی ہے، اور حج اٹھتی ہے:-

”سبحان ذی الملک و الملکوت سبحان ذی العزّة و الجبروت سبحان الحق
الذی لا یبوت اعوذ بعفوک من عقابک و اعوذ بوضاک من سخطک و
اعوذ بک منک جل و جھک لہ“

اور یہ لامتناہی عزت و جبروت، یہ لامحدود ملک و ملکوت والا آقا ہم سے دور نہیں، وہ جو بالذات ہے جہاں میں موجود ہر جگہ پہلے سے پاس ہی تو ہے، رگ جان سے زیادہ قریب ہے، بااثر نزدیک تر، وہ الغیث کی اس پکار پر شانِ رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اور اس کی تجلی کے ساتھ ہی قلب کے ضرر و اضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے، اور شرکاً صدور ہی نہیں مٹنے پاتا۔ نفسیات کے اس مسلہ قانون کو یاد کرو، جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے، کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے، اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے، اور عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے، مجاہد پہلی یا بد یا اضلالی خیالات کا گویا دروازہ ہی پر مقابلہ ہے جو ہی ان خیالات نے کتم عدم سے سز نکالا، ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے ان سے ٹکر لی، اپنی محدود کمزور قوت سے ان کا مقابلہ نہیں کیا، بلکہ نامتناہی قوت و جبروت کے مبدئ سے اقد فیض کیا۔ اور اس طرح ہے پناہ

لہ یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جس کو حاکم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے:-

طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگادی اور ان کا قلع قمع کر دیا جب عمل ہی کا صدور اس طرح روک دیا گیا، اور ابتدا ہی میں روک دیا گیا، تو تکرار کی نوبت ہی کہاں، عادت کا قیام کس طرح ممکن اور سیرتِ بد کی تشکیل کا کیا ذکر، یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے جب وہ تخیل کے دروازے سے خانہ قلب میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب دربانِ قلب غفلت کی نیند سو رہا ہو، چوکس نہ ہو، ہوشیار اور خبردار نہ ہو، یا پھر اپنی حول و قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے! اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور مردانگن ہے، ان سے مقابلہ بچوں کا کھیل نہیں، یہ بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے بچھاڑ سکتے ہیں، ان کے داؤں پنج سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں، ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے، ان کے دروہ کے وقت ہی انہیں بچھاڑا جائے، سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور حق تعالیٰ کے حول و قوت سے ان کا سامنا کیا جائے **اللَّهُمَّ اعْذِنِي مِنَ شَرِّ نَفْسِي** کی فریاد فوراً بلند ہو، **اعوذ بك منك** کی چیخ فوراً نکلے، پھر شکست ناممکن ہے، کامیابی قطعی ہے، حق تعالیٰ کی پناہ میں اگر مغلوبیت کیا معنی رکھتی ہے، ناکامی کیا چیز ہے، ان کی معیت کے ساتھ ہی بندی نصیب ہوتی ہے **مَا أَنْتُمْ إِلَّا عُلُونَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ** کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے۔

یہ نفسیاتی الہیاتی طریقہ بد عادات کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے، بد عادات سے مراد کوئی عادت ہے، جو بہانے اختیار و تصرف میں نہیں، بد عادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے، بد عادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ بر در قلبی اس کو نصیب ہو سکتی ہے، چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہے، اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصور ہوتا ہے، لہذا بد عادت کی شکست خیال کی تبدیلی پر

لے لے اللہ میرے نفس کے شر سے مجھ کو پناہ دے۔

لے تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہیں (پہٹ ۸۷)

منحصر ہے، عادت کے قائم ہو جانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو، لیکن خیال ہماری تصرف میں آسکتا ہے، اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر لیا جائے تو خواہش بھی مغلوب ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو۔ اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے، اور یہ خواہش یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ چل کر مینا چاہیے، خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسرے دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بناتا ہے اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔“

بہر طور بڑی عادتوں کے آہنی پنجہ سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا، اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑے، تو ہمیں مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے، مجاہد کے نزدیک یا اس کفر ہے گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادت بد کا پھر ایک مرتبہ (باوجود عزم و نیت کے کہ ایسا نہ ہوگا) شکار بننے کے بعد جو ذمہ امت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو حزن و ملال کہ وہ محسوس کرتا ہے، وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر مفید ہوتے ہیں اور وہ وقت بہت جلد آہنچتا ہے جب وہ محض اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو کر فاتحانہ شان سے اپنی خود ساختہ پیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتا ہے، عادت رومی نے مجاہد کے اس اعتبار کو اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے؟

اندریں رہی تراش رومی تراش	تا دم آخر دمے فارغ مباحث
تا دم آخر دمے آحسن بود	کہ عنایت با تو صاحب سر بود
دوست دارد دوست این آشتنگی	کوشش بیہودہ بہ از خفتگی!
کار کے کن تو لڑکا اہل مباحث	اندک اندک خاک چہ را می تراش

چوں زچہ ہے مئی ہر روز خاک عاقبت اندر سی در آب پاک
چوں نشینی بر سر کوئے کسے! عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

بہر حال مجاہدہ ہمت سے کام لیتا ہے، حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار رکھا ہے، اس کو استعمال کرتا ہے، اور عزم راسخ رکھتا ہے کہ جب تک گوہر مقصود ہاتھ نہ آئے قلب کا تزکیہ روح کا تجلیہ نہ ہو جائے، وہ دم نہ نیگا، اور حق مجاہدہ ادا کرے گا، و لولہ انگیز طریقہ سے ہر قدم پر وہ گنگنا تا جاتا ہے۔

دست از طلب ندارم تا کار من بر آید

یا تن رسد بجانا یا جان ز تن بر آید

کامیابی و فتحندی اس مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے گان حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ
کا وعدہ اس سے متعلق ہے! ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں لَنْهَدِيَهُمْ سُبُلَنَا كَقَوْلِ
پورا ہوتا ہے۔

مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا، راتوں میں کم سونا، فاقہ پر فاقہ کرنا، حقوق نفس کو تلف کرنے کا نام نہیں، مجاہدہ "حقوق نفس" کا ادا اور غیر شرعی "خطوطِ نفس" کا ترک کرنا ہی، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے، روح کا تجلیہ ہے، اس کا بہترین طریقہ خیالاتِ فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہے، جو شخص اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو سلی افکار کے بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے، وہ اعمالِ سیمہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے، اس کے لیے اعتدال مأمور، اجتنابِ مخطور، اور رضا بہ مقدر آسان ہو جاتے ہیں جو عارفِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے الفاظ میں دین کا خلاصہ ہیں!

ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جو حشر نہیں ہیں تمام محامد و محاسن کا، تمام خوبیوں اور نیکیوں کا، جو مبدئ ہیں ظمانیت و سرور کا، علو و

لہ فتوح الغیب مقالہ اول۔

بلندی کا، قوت و عزت کا، اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالیٰ کے خیال کو اس میں جملنے کی کوشش کرو گے تو چند روز میں پاؤ گے کہ یہ تمام صفات مقید پیمانہ میں تم میں خود ظاہر ہو رہی ہیں، انفیات کا یہ عام قانون ہے کہ آدمی جس چیز کے خیال لور دهن میں رہتا ہے، رفتہ رفتہ اسی کی خوب اس میں پیدا ہونے لگتی ہے، یا انفیاتی زبان میں یوں کہو کہ اس کا جو معروض فکر ہوتا ہے وہی وہ بھی بن جاتا ہے! اس قانون کو جان کر اور مان کر تم ہرگز سلبی خیالات پر فکر و توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کرو گے، ایجابی خیالات ہی کو جملنے اور بسنے کی کوشش کرو گے، اب ہم عارف روم کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے، جس سے تم ایک لحظہ کے لیے حقیقی معنی میں خوش رہ سکتے ہو۔

کیست زو بہتر گوئے هیچ کس تابداں دلشاد باشی یک نفس؟
 اگر تمہیں حشیم بصیرت ملی ہے، اور تم عارف روم کے ساتھ اتفاق کرتے ہو تو پھر کیا حق تعالیٰ کی دهن سے بہتر اور کسی کی دهن ہو سکتی ہے؟ اب دن کا زیادہ حصہ اسی دهن میں گزارو، گفتار کو چھوڑ کر اسی کار بزرگ میں لگ جاؤ، رفتہ رفتہ جامی سامی نے جو کہا تھا، اس کا تم کو تحقق ہونے لگیگا۔

گردِ دل تو گلِ گزرد گلِ باشی در بلبیل بے قرار بلبیلِ باشی
 تو جزوی دهن کل است اگر روز و چند اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی
 جو چیز تم کو خود تجربہ سے معلوم ہو جائیگی اس کا ذکر ہم کیا کریں، لیکن تحریریں کے لیے اتنا کہنا کافی ہے، کہ تم پرسرور اور فرح کے دروازے کھل جائیں گے، اطمینانِ قلب، جو دنیا کی کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے وہ نقدہم ہوگا اور اس آئیہ کریمہ کا اپنی ذات کو مصداق پاؤ گے۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي لِي وہ جی جس نے چین پکڑ لیا پھر چل اپنے

إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَُّرْضِيَةً فَأَدْخِلْنِي
فِي عِبَادِي وَأَدْخِلْنِي جَنَّاتٍ
رَبِّكَ طَرَفٌ تُوَاسٍ سَ رَاضِيَةً وَهَ تَجْهَ سَ رَاضِيَةً
پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری
دشتیں (۱۳۷)

نفسِ مطمئنہ کا حصول، رضائے الہی کا تحقق، جنت ذات میں دخول، یہ نتائج ہیں اس
مجاہدہ کی تکمیل کے؛ جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے، جو مستی اس کی یافت و شہود سے
حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں "لذاتِ جہاں" ہیج ہیں، جاتی اس ذوقِ مستی کو اس و الہا
لذاز سے ادا فرماتے ہیں :-

کلمے بلبلِ جاں مست بیاد تو مرا وے پایہٴ غم پست بیاد تو مرا
لذاتِ جہاں را ہمہ دریا فگند ذوقیکہ دہد دست بیاد تو مرا
حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری رہے، فاذکروا
اللہ ذکرا کثیرا۔ پر عمل ہو، اٹھتے بیٹھتے ہی مشغلہ ہو، اس سے مقصود رخصنا، و قرب الہی ہو
جب تمہاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافاتِ دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکوز ہوگی، تو
خود بخود فاسد، سلی پریشان کن خیالات و وساوس کا دروازہ بند ہو جائیگا، اور جو نہی
خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی ایک روحانی کیفیت و طمانیت سے تمہارا قلب
مملو ہو جائیگا اَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ کے یہی معنی ہیں، ذکر کا قیام مشق اور مجاہدہ سے
آہستہ آہستہ موتا جاتا ہے، اور ذہول و غفلت کا ارتفاع ہو جاتا ہے۔ اس دولت کے حامل
ہو جانے کے بعد تم تمام چیزوں سے غنی ہو جاتے ہو، نہ کسی چیز کے حصول سے تمہیں لذت
ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج؛ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا
تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو رکھ کر تمہیں کسی چیز کی خواہش
نہیں رہتی، تم عارفِ روم کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو :-

روزگار رفت گور و باک نیست تو باں لے آنکہ جز تو پاک نیست

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گہم ہمیں بتلاتے ہیں، یہ تو تم مانتے ہو کہ ہر شے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شے ان کی مخلوق ہے، ہمارا رات دن سابقہ ان ہی اشیاء سے ہوتا ہے، یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ہیں، انہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھیجے ہوئے ہیں، چونکہ یہ فانی اور گریزا ہیں، ان کا زوال اور ان کی فنا پذیری ہمارے غم و حزن کا باعث ہوتی ہے، اب قانون ایٹم ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تم ہی کوشش کرتے رہو کہ شے، کو دیکھ کر تمہارا خیال شے کے خالق کی طرف جائے، اس طرح تمہیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آئیگا، اور ایسا تو لوافتہ وجہ اللہ کے معنی کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گا۔ شے کی سلبی جہت سے توجہ ہٹ کر جہت حق کی طرف مرکوز ہو جائیگی۔ اور اس طرح یاد قائم ہونے لگیگی، تمہارا معروض فکر اب شے نہیں حق ہوگا، اور ان تمام انوار سے تمہارا قلب معمور ہونے لگیگا جو وہاں شری طرف رُوح کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے ہمیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ سعادت و مسرت کا سرچشمہ خود ہمارا قلب ہے، حق تعالیٰ کی جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے، آفاق میں حق تعالیٰ ظاہر ہیں ہر شے کے ساتھ جہت حق موجود ہے، صحیح علم کے استعمال سے دہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی، نقطہ نظر بدلا، معلوم ہوا کہ نفس و آفاق میں حق تعالیٰ نہاں وعیاں ہیں، انہی سے تعلق قائم کرنا، انہی کی یاد کا جانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور ذہول اور خلق میں استعراق اور فانییت تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے **مَنْ يَعْزِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْ عَذَابًا صَعَدًا** جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے، چڑھتے عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے (روپ ۱۱)

اسی مفہوم کو رومی کے دل نشین الفاظ میں یاد رکھو:-
گر گریزی بہ آمیدِ رحمتی ہم از انجا پیشت آید آفتی

بچ کنبے دو بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست
 حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق میں محویت، خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دلکش نظر
 کیوں نہ آئے نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے، اور ظلمت سے ضیق، غم و حزن و
 خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے، ظلمت میں چیزیں اپنے صحیح ضد و خال میں کہاں
 نظر آتی ہیں، کسی شے کا حسن و جمال تاریکی میں کیا دکھائی دینگا! پھر تمہاری نظر میں اشیا
 کی یہ دلفریبی تمہارے نفس کا دھوکہ ہے، التباس ہے، تمہارا واسطہ بھی تو خلاق ہے کیسی
 کیسی دلربا صورتیں یہ تمہاری خوشی کے لیے پیدا کرتا ہے، ان سے تمہیں بھی لذت حاصل
 ہوتی ہے، کھوڑی ہی دیر بعد غم کا سا یہ تمہارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی اعتماد ہوتا ہے
 ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے، اور تم کانپ اٹھتے ہو، تمہاری طبیعت میں استقلال
 نہیں، استحکام نہیں، تمہاری کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اٹھو، اگر تمہاری
 چشم بصیرت کھل جائے، اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے، تو تمہیں اشیا ویسی ہی
 دکھائی دینے لگیں گی جیسی کہ وہ ہیں، اب تم کو حیاتِ طیبہ نصیب ہوگی۔ طمانیت و بردت سبھی
 حاصل ہوگی، خوف و حزن زائل ہو جائیگا، استقلال و استحکام عطا ہوگا، اور حق تعالیٰ
 کے اس وعدہ کا ایفاء ہوگا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ وَأُنْشِيَ وَ
 هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۗ
 يٰۤاُوْحٰى كُوْقٰمِ كَرْنِ، تمہارا رخ ظلمت سے نور کی طرف پھرنے، مجاہدہ کے راستہ کو آگے
 کرنے، خلق سے ٹوڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکوں کی صحبت عجیب و غریب اثر رکھتی ہے، صحبت
 کا اثر نفسیات کا ایک مسلمہ اصول ہے، ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے تضایا کو قبول کرنے

۱۔ و مثل جلس الصالح كمثل صاحب المسك ان لم يصعبك منه شيء اصابك من ريح
 و مثل جلس السوء كمثل صاحب الكبر ان لم يصعبك من سواده اصابك من دخانہ
 (ابوداؤد و سنن ابی یوسف)

۲۔ ایک شخص کی مثال مشک والے کی سی ہے اگر تم سے کچھ نہ لے تو خوشبو تو ضرور پہنچے گی اور جسے ہنشین کی مثال لوہار کی
 بھٹی کی سی ہے، اگر اس کی سیاہی تم کو نہ لگے تو دھواں تو ضرور پہنچے گا۔

کی استعداد یا صلاحیت پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں، تو اس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایجازی" (AUTO SUGGESTION) کہا جاتا ہے۔ اور جب کسی خارجی ذریعہ سے حاصل ہوں تو "غیر ایجازی" (HETERO-SUGGESTION) کہا جاتا ہے، رات دن ہم خود ایجازی اور غیر ایجازی کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں، اور ان کو جزو ذہن بنا رہے ہیں، اگر سبلی یا اضلاہی افکار غیر ایجازی قوت کی وجہ سے ہمارے قلب میں جگہ پارہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بُری صحبت میں ہیں، اور ان کے تیقنات و اشغال کی نقل کر رہے ہیں، اور اضطرابی طور پر ان سے متاثر ہو رہے ہیں، ان کے سببی اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صحبتِ ناجنس سے قطعی احتراز کریں۔

زاجمقاں بگریز چوں عیسیٰ گریخت

صحبتِ احمق بسے خونہا بریخت

سبلی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لیے نیکوں کی صحبت کی تلاش کرنی چاہئے، اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم اپنے اندر خاص اثر و قوت رکھتا ہے، وہ قلب کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے، یقین و اذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے، علم حق کو شیخ اکبر محی الدین عربیؒ نے "علم اذواق" قرار دیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ علم الحق علم الاذواق لاعتن الاوراق وهو العلم الصحیح وما عداہ فخذوک و تخمین لیس العلم اصلاً یعنی علم حق ذوق و وجدان سے حاصل شدہ علم ہے، محض کتابوں سے حاصل کردہ نہیں، اور یہی علم صحیح ہے، باقی ایک بچہ مطلق علم نہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں، مبدع و نوٹ سے اخذ کردہ ہے، قطعی و یقینی ہے، حقیقی واقعہ ہے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلم ہو گئے ہیں، اور اب وہ براہ راست اسی مبدع سے علم حاصل کرنے لگے ہیں، انفقوا اللہ و یعلمکم اللہ، اس پر دلیل ہے، اسی لیے ایک

لہ اللہ سے ڈرو وہ تمہیں علم دیتے ہیں۔

دوسرے رازداں کی نصیحت ہو کہ خذ العلم یا فواہ رجال اللہ، لا من الصنائف الدفاتر
 مردان حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دفتروں سے نہیں، کیونکہ ان کتابوں
 میں قیاس و تخمین اور ظن و رائے کے سوا کیا رکھا ہے، اہل اللہ کی صحبت خاک کو کہینا کرتی
 ہے، ان کے افعال و اعمال ان کے افکار و خیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے
 جاتے ہیں، اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہو، اور بدی سے محتسب
 اور محترز اور بالآخر ظلمت سے نکل کر نور کی طرف تمہارا منہ ہو جاتا ہے، عارف روم نے
 صحبتِ مردانِ حق کے اثرات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

خواہی کہ دریں زمانہ فرسے گردی یا در رہ دیں صاحبِ دردے گردی

اسی را بجز از صحبتِ مردانِ مطلب مرے گردی چو گردِ مردے گردی

یہ کو تو امع الصبا دقین کے حکم کے پہاں فائدوں کی اجمالی توضیح ہے۔

سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کی گئی، اس کو اجمالاً ایک دفعہ
 پھر دہر لیجیے اذ انکر و تقرب، تکرار سے چیزیں زیادہ دلنشین ہوتی ہیں، سیرت کی عمارت کا
 سنگ زاویہ لا الہ الا اللہ پر نچتہ یقین و اذعان ہے، تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا
 کہ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الہ غیرہ، اے قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا
 تمہارا کوئی معبود و رب نہیں، اللہ ہی نالوق عبادت ہیں استعانت انہی سے کی جانی چاہیے
 میرا امر انہی کے سامنے جھک سکتا ہے، غیر کے سامنے نہیں اس بنیادی عقیدہ کا زبان
 سے اظہار اور قلب سے اقرار ضروری ہے، زبان سے بار بار کی تکرار یقین کو نچتہ کرتی ہے
 جس قدر یقین میں سختی ہوگی اسی قدر عمل میں سہولت ہوگی، یقین میں شدت پیدا کرنے کے لیے
 غور و فکر، تدبر و مراقبہ ضروری ہیں، یقین اس شدت کا پیدا ہو جائے کہ شک و شبہ کی
 مطلقاً گنجائش نہ رہے، تم جانتے ہو کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے تمہارا ہاتھ جل جائیگا اسی
 طرح تمہیں توحید فی المعبودیت و توحید فی الربوبیت کا یقین ہو جانا چاہیے، ذلت (جو عبادت

کی اصل ہے حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جو ہمارے مالک ہیں حاکم ہیں، مولیٰ ہیں، خالق ہیں، رب ہیں، وکیل و نصیر ہیں، حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہیں، معزز و منزل ہیں، حاجت و مراد سوا ان کے کوئی پوری نہیں کر سکتا! اسی لیے انہی کے سامنے دستِ سوال دراز ہو سکتا ہے، کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں، زبان پر یہ دعا جاری رہے اور قلب میں اس کا مفہوم متکمن۔

اللَّهُمَّ كَمَا صَنَعْتَ وَجُوهَنَا تَسْبِيحًا لِي حِينَ طَرَعَتْ لِي بِهَيْكَلِي حَمْرًا كَوَيْفِكَ كَمَا سَبَّحْتَ
لِغَيْرِكَ فَصْنِ أَيْدِيَنَا أَنْ تَمْتَدَّ كَرْنِي سَعِيًّا لِي، اِسْمِي طَرَحْتُ بِهَيْكَلِي بِأَيْتُوكَ كَوَيْفِكَ
بِالسُّوَالِ لِغَيْرِكَ -
غیر کے آگے سوال کرنے سے بچائے رکھو۔

اس عقیدہ اور یقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کر سکتا ہے، اس کی سیرت
فلاموں کی سی کیسے ہو سکتی ہے، وہ نفع و ضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے، اور اپنی عزت
اس وہی نفع و نقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے، مجاہد اسی یقین اساسی کو پختہ کرتا ہے، اس
کا طریقہ یہ ہے کہ خواطر کی نگہبانی کی جائے، سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی و ہدایتی علم سے بدل جائے
قانون قطب افکار (Law of the Polarisation of thought) نقیات کا
ایک مسلمہ قانون ہے، اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں تبدیل کیا جاتا
ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی افکار کو ذہن میں ہمیشہ جہانے کی کوشش کرنی چاہیے،
اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جب یہ قلب پر چھا جاتا ہے، تو قلب
تمام ظلمتوں سے پاک ہو جاتا ہے، نورانی ہو جاتا ہے، نور ہو جاتا ہے، اللہم اجعل فی نفسی نورًا
للہم اجعلنی نورًا کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سرور و طمانیت ہے، مسرت و سعادت
ہے جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے، نیک سیرت شخص سرور و مطمئن ہوتا ہے، اس کی
جان اس کا تن راحت میں ہوتا ہے، وہ قطرہ نور ہوتا ہے، یہ روحانی مسرت ہے، جو طبعی غم و حزن
میں باقی رہ سکتی ہے۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَانُوْا

يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ - (پ ۱۱ ع ۱۱)

قوة ایمانیہ و ظہور غیب

چشم بگذشتہ ازین محوسما یافتہ از غیب بینی بوسما
خود نمی یابم یکے گوشے کہ من نکتہ گویم از ان چشم حسن

مذہبوں ہم اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہمیں "صداقت" کا علم ہے، لیکن یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیوں صداقت کے وہ آثار ہماری زندگی میں نمایاں نہیں ہوتے جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفوز فی انقضاً امور تکوینی میں کامیابی و کامرانی نزل الشہداء، ایسی اعلیٰ قسم کی میزبانی بنیسی کہ شہیدوں کی جنت میں ہوگی، عیش السعداء، سعیدوں کا ساعیش، النصر علی الاعلاء، دشمنوں پر فتح کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے؟ کیوں رحمت کے وہ آثار ظاہر نہیں آتے، جن سے ہمارے دل کو ہدایت ہو (تھدی بھا قلبی) ہمارے کاموں میں جمعیت ہو (جمع بھا امری) ہماری اہتری دور ہو، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں (تلم بھا شعتی) ہمارا دین سنور جائے (تصل بھا دینی) ہمارا فرض ادا ہو جائے (تقضی بھا دینی) ہماری نظر سے غائب چیزوں کی نگہبانی ہو (تخبط بھا غائبی) ہمارے پیش نظر چیزوں کو بلندی عطا ہو (توقع بھا شأھدی) ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے (تبیض بھا وجھی) ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے (تزکی بھا عملی) رشد و ہدایت کا ہمارے قلب میں الھام ہو (تلمھنی بھا رشدی) حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے فطری جذبات الفتن از سر نو پیدا ہو جائیں (تورد بھا الفتی) اور ہر برائی سے بچے رہیں (تصمنی بھا من کل شیء)

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم یقین صادق کے درجہ کا نہیں، یا پختہ یقین نہیں، اور وہ ایمان ہمیں حاصل نہیں ہو سکا، دل میں بوسست ہو گیا ہو، جس کے مانگنے کی ہدایت ان الفاظ میں

کی گئی ہے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي اسْتَدَاثُ إِيمَانًا يَا شَرِ قَلْبِي لِي أَتَشِيخُ فِي نَجْمٍ سَعَى وَهَ إِيمَانٌ مَا نَكْتُ هُونٌ جُومِرِي دَل

وَيَقِينًا صَادِقًا نَجْمٍ
میں پوست ہو جائے اور پختہ یقین آئے

ہمیں علم یقین کی وہ کیفیت حاصل نہیں جس کے پیدا ہو جانے کے بعد حضرت مسیح کے الفاظ

میں حیرتِ تامہ حاصل ہو جاتی ہے!

ہم میں سے اکثر ایک ایسے سادہ طریقہ کی تلاش میں اپنی مختصر زندگی کے دن گزار دیتے ہیں،

جس کا حصول اور جس پر مداومت ہمیں ایمان کے ان آثار و برکات سے مالا مال کرے، جن کا ادھر

ذکر ہوا، ہمیں ایک ایسی چیز کی تمنا ہے، جو ایمان کو ہمارے قلوب میں پوست کرے، وہ پختہ یقین عطا

کے جس سے ایک بڑی تعداد محروم ہے، اور جس کے حاصل ہو جانے کے بعد ہماری ساری پریشانیوں

سبچھ جائیں، ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے اور ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے، اور تمام امور میں کامرانی و

کامیابی نصیب ہو!

یقیناً ایک ایسا سادہ طریقہ موجود ہے، اور وہ اتنا سادہ اور سیدھا طریقہ ہے کہ اکثر تو اس کو

جان کر بھی اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے! بعض کا تو یہ عقیدہ ہے کہ زندگی میں پریشانیوں سے نجات

اور جمعیتِ خاطر کا حصول ناممکن ہے! ان کا خیال ہے کہ۔

’آدم‘ از کثرتِ پریشانی می کند جستجوئے جمعیت

آدم آمد سر حزن و ہر سہ جدا نشود جمع تا دم میت

بعض کا خیال ہے کہ یہ طریقہ پایا تو جاتا ہے، لیکن وہ ایک رازِ نہفتہ ہے، اس تک ان کی

رسالی ممکن نہیں، وہ رازِ سینہ ہے، سفینہ پر نہیں ملتا، اور اس راز کے جاننے والے کا معدوم ہیں!

بعض سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ سخت مشکل ہے، اس پر عمل ناممکن ہے! یہ شخص کے بس کی چیز نہیں، الفاظ

یا تعبیرات کی کثرت نے اس کو چھپا رکھا ہے اور دلائل کی کثرت نے اس کا ادراک مشکل کر دیا ہے۔

از دلائل می شود مشکل ہما ادراکِ حق!!
ایں رہ از بسیاری سنگ نشان ہما از نیست!

حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ موجود ہے اور وہ اتنا سادہ ہے کہ بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں، بوڑھی خواتین بھی سمجھ سکتی ہیں! الہامی صدائقوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں بچوں کی طرح سلیم فطرت بن جانا چاہیے، اسی وقت ہم میں وہ شعور پیدا ہوتا ہے، جس کی بیداری کے بعد ہمیں کامل حریت نصیب ہوتی ہے! یہ طریقہ مختصر الفاظ میں یہ ہے۔

۱۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ان ظاہری و باطنی نعمتوں اور عنایتوں کو یاد کرنا چاہیے، جو ہماری پچھلی زندگی میں ہم پر کی گئیں اور ان پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے

۲۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ان آئندہ نعمتوں اور عنایتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے!

اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے:-

۱۔ ایمان ان اشیاء کا جو ہرے جن کی ہم حق تعالیٰ سے اُمید رکھتے ہیں، اور ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہو جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، حق تعالیٰ پر ایمان، ان سے حُسن ظن، ان سے اُلْسِ مَحَبَّتِ مومن کا طرہ امتیاز ہے: **لَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ** اس ایمان حُسن ظن، اُلْسِ مَحَبَّتِ ہی سے وہ تمام نعمتیں جو ابھی پردہ غیب میں ہیں، خارج میں ظاہر ہوتی ہیں، یہ وہ پل ہیں جن سے گزر کر حق تعالیٰ کی نعمتیں مومن تک پہنچتی ہیں، اس راز کو عارفِ روحی نے یوں فاش کیا ہے:-

اَنْ كَرِشْدَانَسْتَش بَشَاہِ فَرْدِ خَوِش يَافَت دَر مَانَاكے جملہ درویش

ایمان اور اُلْسِ مسلسل شکر و حمد سے قوی ہوتا ہے، جب ہمارے قلب میں ان نعمتوں اور احقوں عنایتوں اور احسانوں کا احساس موجود ہوتا ہے، جو حق تعالیٰ نے ہم پر ہماری پچھلی زندگی میں کی ہیں، ہم اس احساس کو تازہ کر کے ان نعمتوں کی جزئیات و تفصیلات پر نظر کر کے چیخ مسمکتے ہیں:

بے لطف تو من قرار تو اتم کرد احسان ترا شمار تو اتم کرد

گر برتن من زباں شود ہر جئے یک شکر تو از ہزار شمار تو اتم کرد

(ابوسعید ہمدانی)

جائے پھلی زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں پر شعور کو مرکوز کرنے کے نہیں یاد کرنا چاہیے کہ کس طرح حق تعالیٰ نے پچھلے زمانہ میں ہمیں خوف و حزن سے نجات بخشی، غم و مصیبت سے آزادی مرحمت فرمائی، مرض و الم سے شفا عطا کی! ہمیں ان موقعوں کو یاد کرنا چاہیے، جن میں حق تعالیٰ کی کارسازی و بندہ نوازی نے ہماری جان کو آرام بخشا اور ضیق و پریشانی سے نجات دی، غم و مصیبت کی پہلے پناہ قوتوں نے ہمارے ضعیف جسم کو تباہ کرنا چاہا تھا، اور شرکی تباہ کن طاقتوں نے ہماری روح کے شیرازہ کو منتشر کرنا چاہا تھا لیکن حق تعالیٰ کے کرم نے ہماری حفاظت کی، ان کے احسان نے ہمیں تباہی سے بچالیا!

کجا لب صدق و شکر ابرنیان ست! کراز شمار بروں قطره ہائے باران ست! (نظ)
 ہاں ہم اپنے احسان مند قلب کی گہرائیوں سے حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ ہی کے تھے، ہماری حول و قوت کو اس میں کچھ دخل نہ تھا، (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ) جب ہم شکست خوردہ دل سوختے تھے ان کی ربوبیت نے ہماری دستگیری فرمائی جب ہم برگشتہ پریشان تھے ان کی رحمت نے ہمیں راہ دکھائی! جب ہم غلط راہ پر پڑے تھے، ان کی حکمت نے ہدایت کی طرف ہماری رہبری کی، جب ہم غم و مصیبت، خوف و حزن میں مبتلا تھے، ان کے فضل عمیم نے ہمیں سنبھالا!

اے خدا قربان احسانت شوم! ایں چہ احسان است قربانت شوم!

اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَذْبُحُ لَجَلالٍ وَجْهَكَ وَعَظِيمِ سُلْطَانِكَ!

ہر روز کچھ دیکھ لیں اپنی گزشتہ زندگی کے ان تجربوں کو تازہ کرنا چاہیے، جب کہ حق تعالیٰ نے ہماری خاص طور پر مدد فرمائی، اور ہمارے لیے نجات کا سامان فراہم کیا ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں ایسے تجربات و واقعات ضرور گزرے ہیں جن کی یاد ہم تازہ کر سکتے ہیں، ہمیں انہیں یاد کرنا چاہیے ان پر حق تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کرنا چاہیے! عارف حق شناس ہوتا ہے، غیر عارف ناسپاس!
 عارف اں باشد کہ باشد حق شناس ہر کہ عارف نیست گرد ناسپاس (عطار)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کے احسانات کا یوں شکر ادا کیا ہے :-

اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ بِمَا هَدَيْتَنَا
وَلَكَ الْحَمْدُ بِمَا أَكْرَمْتَنَا وَوَلَكَ
الْحَمْدُ بِمَا سَتَرْتَنَا وَوَلَكَ الْحَمْدُ
بِالْقُرْآنِ وَوَلَكَ الْحَمْدُ بِالْأَهْلِ
وَالْمَالِ وَوَلَكَ الْحَمْدُ بِإِتْعَافِنَا
وَلَكَ الْحَمْدُ حَتَّى تَرْضَى وَ
لَكَ الْحَمْدُ إِذَا رَضَيْتَ
بِأَهْلِ التَّقْوَى وَ أَهْلِ
الْمَغْضَرَةِ !

تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور
تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں عزت دی اور تیرے
ہی لیے حمد ہے کہ تو نے ہماری ستر پوشی کی، اور تیرے ہی لیے
حمد ہے قرآن پر اور تیرے ہی لیے حمد اہل و مال پر اور تیرے ہی
لیے حمد ہے درگزر کرنے پر، اور تیرے ہی لیے حمد ہے یہاں
تک کہ تو خوش ہو جائے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے جب
کہ تو خوش ہو جائے اے وہ جس کی ذات سے ڈرنا چاہیے
(ڈرنے کے قابل بس تیری ہی ایک ذات ہے اے وہ کہ تو
ہی مغفرت کر سکتا ہے۔

ان ہی نعمات پر جو ہماری پھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیے ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کا شکر ادا
کرنا چاہیے۔

شُكْرُ اللَّهِ خَالِقِ الْأَشْيَاءِ نَشْكُرُ اللَّهَ رَازِقِ الْأَحْيَاءِ (منظر الحق)

یاد رکھو ایسا کرنے سے ہمارا ایمان مضبوط ہوتا ہے، ہمارا قلب یقین کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے
اور ہم حق الیقین کے طور پر جاننے لگتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر حال میں ہمارے لیے کافی ہیں، ہمارے
قلب کی گہرائیوں سے یہ صبح نکلتی ہے۔

اللَّهُ الْكَافِي، كَافِي! قَصْدَاتُ الْكَافِي وَجَدَاتُ الْكَافِي

لِكُلِّ كَافٍ كَافِي كَفَانِي الْكَافِي وَنَعْمَ الْكَافِي وَوَلِلَّهِ الْحَمْدُ!

ہمارا خوف دور ہو گیا، امیدیں جاگ اٹھتی ہیں، نور یقین ہمارے قلب کی تاریکی کو دور کرتا
ہے اور ہم حق تعالیٰ کے قرب و معیت کی روشنی میں داخل ہو جاتے ہیں، اور ہمیں وہ شاندار آزادی
حاصل ہوتی ہے جو مقربین بارگاہ الہی کا حصہ ہے، وہ فرحت و سرور نصیب ہوتا ہے جس کو عیش السعداء

سے تعبیر کیا گیا ہے! اور اسی سرور کی حالت میں ہم بیدل کی زبان میں انگڑائے لگتے ہیں:

تا مزرع ہبز آسماں خواہد بود تا خرمی بارغ جہاں خواہد بود
ہر تخم کہ ریشہ بروں خواہد بود شکرِ کریم ترا زباں خواہد بود

حق تعالیٰ کے ان گذشتہ احسانات کا حمد و شکر کے ساتھ یاد کرنا وہ طریقہ ہے جس کو ہر زمانہ کے صلحاء و صدیقین نے اپنے ایمان کی قوت کے از دیار کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے، اور اس حد تک کیا ہے کہ ان سے عجیب و غریب کرامات و خوارق عادات کا ظہور ہوا ہے، ان کی کامیابی کا یہی ایک راز تھا، اسی طریقہ نے قوتِ الہیہ کے دروازوں کو ان پر کھول دیا تھا، ان کو حق تعالیٰ کے قریب کر دیا تھا، اور حق تعالیٰ کو ان سے قریب، اس کی وجہ سے ان کے لیے ایسی چیزیں ممکن ہو گئی تھیں جو عام طور پر انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔

دیکھو جب حضرت دانیال علیہ السلام کو بخت نصر نے ایک اندھے کنویں میں ڈو شیروں کے ساتھ قید کر دیا تھا تو انہوں نے کہا جاتا ہے کہ یہ دعا کی تھی:-

الحمد لله الذي لا يخيب من دعاه حمد اس خدا کی ہر جو اپنے مانگنے والے کو محروم نہیں

والحمد لله الذي لا يكل من توكله کرتا، حمد اس خدا کی ہر جو اس شخص سے نہیں ٹھکتا

عليه الحمد لله الذي هو ثقتنا حين جو اس پر بھروسہ کرے، حمد اس خدا کی ہر جو ہمارا کسرا

تنقطع عنا الخيل الحمد لله الذي ہر جب ہماری تدبیریں منقطع ہو جاتی ہیں، حمد اس خدا

هو بجاننا حين يسود قلوبنا باعمالنا کی ہر جو ہماری تکلیف کے وقت ہماری مصیبت کو دو

الحمد لله الذي يكشف ضرابنا عند کرتا، حمد اس خدا کی ہر جو احسان کا بدلہ احسان سے

كربتنا، الحمد لله الذي يجزي دیا، حمد اس خدا کی ہر جو صبر کا بدلہ نجات و

بالاحسان احساننا، الحمد لله الذي رستگاری سے دیتا ہے!

يجزي بالصبر نجاتنا، (رواه ابن ابی الدیناؤ سندہ حسن)

یہ ساری دعا حق تعالیٰ کی حمد و ثناء سے بھری ہوئی ہے، اس کا ہر جملہ ان بتجربوں کو حافظہ میں تازہ کرتا،

جب کہ حق تعالیٰ کی خاص تائید ہیں ہوئی تھی اور طوفانِ حوادث سے ہماری کشتی نکل آئی تھی اور ہماری زبان سے بے اختیار یہ جملے نکلے تھے۔

اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ شُكْرًا وَلَكَ
الْمَنُّ فَضْلًا أَنْتَ رَبُّنَا حَقًّا
وَمَنْ عَبِيدُكَ رَجَاءً۔
ہر اور ہم تیرے بندے ہیں، نا تو ان و محتاج۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مقابلہ کو چلے اور جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خین کی لڑائی کے لیے نکلے، تو ان کی زبان پر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ہی جاری تھی۔

كُنْتُ وَتَكُونُ وَأَنْتَ حَقٌّ لَا يَمُوتُ
تَنَامُ الْعَيُونُ وَتَكَرَّرُ الْجُحُومُ وَأَنْتَ
حَقٌّ قِيَوْمٌ لَا تَأْخُذُكَ سَنَةٌ وَلَا
نَوْمٌ يَا حَقُّ يَا قِيَوْمُ!
تو ہے اور رہیگا، تو ایسا زندہ ہے جس کو موت نہیں!
آنکھیں سوتی ہیں اور سائے بدلتے ہیں، تو زندہ اور
زندہ رکھنے والا ہے، تجھ کو اونگھ اور نیند نہیں چھو سکتی!
یا حقی یا قیوم!

یاد رکھو کہ حق تعالیٰ کی رحمت و رافت جو ہماری پچھلی زندگی میں ہمارے ساتھ رہی، وہ اب بھی ہم پر محیط ہے اور ہی ثبوت جو گزشتہ زمانہ میں ہماری دستگیری کرتی رہی ہے، اب بھی ہماری مدد کر رہی ہے، وہی فضلِ عمیم جس نے اب تک ہمیں سنبھالا ہے، اب بھی ہمیں سنبھال رہا ہے۔

حق تعالیٰ اب بھی وہی ہیں، ان میں تغیر نہیں، وہ تغیر سے منزہ و ماوراء ہیں، یہ امر واقعی کہ انھوں نے ہمیں گزشتہ زندگی میں بلا و غم سے نجات دی ہے، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہی عدم تغیر و عدم بفر کی وجہ سے، ہمیں ہرگز فراموش نہ کریں گے!

سعدیؒ اسی طریقہ کو جو ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، اصولاً استعمال کرتے ہوئے حق تعالیٰ کے گزشتہ احسانات کو یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں :-

فَرَامُوشْتِ نَهْ كَرْدِ اِيَزْ دَرْدَرِ اَنْ هَالِ
رَدَانْتِ دَادُو عَقْلِ وَ طَبِيعِ وَ اَدْرَاكِ
کہ بودی لطفہ بد فون و بد موش
جمال و حسن و دلئے و فکر و موش

وہ انگشت مرتب کر دے کہن دو باز دیت مرتب ساخت بردوش!

کنوں پنداری سے ناچیز تمہت کہ خواہد کردنت رونے فراموش!

خوب سمجھ لو کہ صداقت جس وقت تک کہ وہ محض ایک ذہنی نقل بنی رہتی ہے ہماری مدد

کرنے سے قاصر ہوتی ہے، لیکن جب ہمیں اس کا تحقق ہوتا ہے وہ ایک ہمہ توان قوت بن جاتی ہے،

اب اہم بات جاننے کی یہ رہ جاتی ہے کہ صداقت کا تحقق کس طرح ہوتا ہے؟ یاد رکھو کہ جب ہم

یہ یاد کرتے ہیں کہ ہماری پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا احسانات کیے ہیں، تو ہم

اس صداقت کے تحقق کے قابل ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس کے پہلے کیا ہے وہ اب

بھی کر سکتے ہیں، معاذ اللہ حق تعالیٰ کو اہم کمزور نہیں ہو گئے ہیں کہ وہ ہماری حفاظت نہ کر سکیں

اور ہمیں پہچانہ سکیں، اور نہ معاذ اللہ وہ بہرے ہی نہیں کہ سن نہ سکیں، وہ سمیع و بصیر، وہ علیم و

قدیر ہیں، وہ ہر طرح کافی ہیں: اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا ۚ كَفَىٰ بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۚ كَفَىٰ بِاللّٰهِ لَصِيْرًا

اگر ہم حق تعالیٰ کے ان احسانات کو یاد کرتے رہیں، جو پچھلی زندگی میں ہم پر بارش کی طرح

نازل ہوتے رہے ہیں تو ہمیں شدت سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا

کریں ان کے جملہ احسانوں کا، جملہ عنایتوں اور کموں کا، نعمتوں اور راحوں کا، اب ہمیں ایسا کرنا چاہیے،

اور خوب خوب کرنا چاہیے! وحی غیر منلو کے الفاظ میں ہمیں کہنا چاہیے:

اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَالَّذِي تَقُولُ، وَ

خَيْرًا مِّمَّا تَقُولُ، اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ

كُلُّهُ، وَلَكَ الشُّكْرُ كُلُّهُ، وَلَكَ لِلَّهِ

كُلُّهُ، وَلَكَ الْخَلْقُ كُلُّهُ، يَبْدُكَ

الْخَيْرُ كُلُّهُ، إِلَيْكَ يَرْجِعُ الْأَمْرُ

كُلُّهُ!

اللّٰهُمَّ الَّذِي كَفَانِي وَأَوَانِي وَ

سَبَّ تَعْرِيفِ اس اللّٰهُمَّ، جو پھر کو کافی ہوا اور جس نے

اطعمتی وسقانی والذی من علیؑ مجھ کو ٹھکانا دیا، اور کھلایا اور پلایا اور مجھ پر احسان اور
 وافضل والذی اعطانی فاجزل فضل کیا، اور مجھ کو مال و دولت دی اور بہت دی،
 الحمد لله علی کل حال ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔

اللهم لك الحمد كما ينبغي لجلال لے اللہ تیرے لیے ایسی تعریف ہے جو تیری ذات کی
 وجهك وعظيمة سلطانك - بزرگی اور تیری بڑی بادشاہت کے سزاوار ہو!

اس طرح حمد و شکر ادا کرنے سے، تسبیح و تقدیس سے ہم میں ایک اعلیٰ شعور پیدا ہوتا ہے، ایک
 پختہ یقین، باطنی وقوف، براہ راست وجدان پیدا ہوتا ہے، جو عقلی علم یا تعقل سے ماورا ہوتا ہے،
 اس کی کیفیت کالفاظ میں ادا کرنا ممکن نہیں، ہمیں اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ
 نے اب تک کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں۔

”إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَبِالْحَبَابَةِ حَكِيمٌ، نِعْمَ الْوَلِيُّ وَنِعْمَ النَّصِيرُ!“

۲۔ اب ہمیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا جو زمین و آسمان کے خالق ہیں، جن کے
 ہاتھ میں سب کی بھلائی ہے، اور جن کی طرف سب امور رجوع ہوتے ہیں، ان نعمتوں کے لیے
 شکر ادا کریں، جن کی ہمیں اب حاجت یا ضرورت ہے، ہمیں اس پر ایمان ہے، ہمیں اس امر کا تحقق
 حاصل ہے کہ حق تعالیٰ ہر دشوار کو آسان کر سکتے ہیں، ان کے لیے ہر دشواری کو آسان کر دینا آسان
 ہے، ان تیسیر کل عسیر علیک یسیر پھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ایسا کیا ہے اور اب بھی وہ کر سکتے
 ہیں، قطعاً کر سکتے ہیں، اس لیے ہم ان کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ انہوں نے ہماری دعائیں لی، اس
 حاجت کا ظہور جس کی ہمیں حاجت ہے پردہ غیب سے قطعاً ہو رہا ہے اور غیب میں تو وہ ظاہر ہو چکی، ہماری
 رازدہاں میں مل چکی، ہمارا ایمان اس لائق تباری قوت پر ہے جس کے لیے ہر دشوار آسان ہے، جس کے لیے
 ہر ممکن ممکن ہے اور ہم ان چیزوں کا جو ظاہر نہیں ہوئیں اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کہ وہ ظاہر ہو چکیں،
 یہ تاکید ہے ہمارے محبوب و مطہر صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی

أدعوا لله وانتم موفون بالجابۃ تم دعا مانگو، اور تم کو اس کے قبول ہونے کا یقین ہو۔

حق تعالیٰ کا ایک نام مجیب بھی تو ہے، یعنی دعا اور سوال قبول کرنے والے، ان کا ارشاد ہے:

أَدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ
مجھ کو پکارو میں تمہاری دعا قبول کر لوں گا۔

أَجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا
جب کوئی مجھے پکارتا ہے، تو میں پکارنے والے کی بات

دَعَانِ
کا جواب دیتا ہوں۔

من يدعوني فاستجب له
کوئی مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں

ما من مسلم يدعوا بدعاء
جو مسلمان کوئی دعا کرتا ہے، تو اس کی دعا قبول

إلا استجب له
ہوتی ہے۔

یہ اور اس طرح کی اور یقین آفرینیوں کے بعد اور خود اپنے ذاتی تجربہ کے بعد ہم دعا کے ساتھ ہی اجابت کی قبولیت کے یقین کے ساتھ حق تعالیٰ کا اس نعمت پر شکر ادا کرتے ہیں جس کی ہمیں حاجت ہو اور یقین رکھتے ہیں کہ نعمت ہمیں حاصل ہو چکی ہے، گو کہ ابھی پردہ غیب سے اس کا ظہور نہیں ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ عام آدمی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے پہلے نعمت کا ظہور ہو چکا ہو وہ ظہور نعمت کے بعد شکر ادا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کی دعا اکثر موثر نہیں ہوتی، جو شخص نعمت الہی کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے اور حق تعالیٰ کا محض اس وجہ سے شکر ادا نہیں کرنا چاہتا کہ ابھی اس کی دعا کی قبولیت کے آثار و نتائج نہیں پیدا ہوئے ہیں، وہ ایمان کامل کی دولت سے محروم ہے، شکر گزار (شکرا) ذاکر (ذکار) و مطیع و فرمانبردار، روح حق تعالیٰ کی نعمتوں اور عذبتوں کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، تحمید و تسبیح ہم میں وہی شعور پیدا کرتی ہے جو ہم میں اس وقت خود بخود پیدا ہوتا، جب ہماری دعا قبول ہو چکی ہوتی!

ہم اپنا رخ اس ذات کی طرف کیے ہوئے ہیں، جو فاطر سماوات و ارض ہے، اس کے ثنا خواں ہیں، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کر رہے ہیں، عرض کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ آپ خیر محض ہیں، رحمت مطلق ہیں، فکر تام ہیں، کماں مطلق ہیں، محسن ہیں، مکرم و منعم ہیں، مفضل ہیں، وہاب ہیں، نافع، رحمن و رحیم ہیں، مجیب ہیں، آپ ہمارے حالات ہیں کامل الہی تطابق پیدا کر رہے ہیں، یہ تطابق ہمارے

تخیل، ہمارے منصوبوں سے کہیں زیادہ کامل ہے، ہم نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کر دی ہیں اور اپنا منہ آپ کی طرف کیا ہے، اور اپنا کام آپ کو سونپ دیا ہے۔ ﴿لَا مَلْجَاءَ وَلَا مُنْجَاءَ إِلَّا إِلَيْكَ﴾ اس دعا و ثنا کے نتیجے کے طور پر ہمارے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے، تاریکی دور ہو جاتی ہے اور قلب کی فضا نورانی ہو جاتی ہے، قلب مسرت سے بھر جاتا ہے، اطمینان، سکینہ، وقار، سرور کا مبداءِ نیا ص کی جانب سے مسلسل فیضان ہونے لگتا ہے، باطن انوار و کیفیتِ محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، ہم جان لیتے ہیں کہ اب ہم حصارِ سلامتی میں ہیں، اور ہماری عاقلیٰ عالمِ قدس میں پہنچ چکی ہیں، اب جو کچھ ہوگا، وہ خیر ہوگا! گواہی خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا، معاملات ویسے ہی نازک ہیں لیکن ہمارا باطن یقین و مسرت سے پُر ہو جاتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایمان ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے، جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، ایمان ان اشیاء کی حقیقت یا جوہر ہے، جن کی ہم حق تعالیٰ سے توقع کرتے ہیں۔

اس یقین و مسرت و سکینت کی وجہ سے ہم پھر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی حمد و ثنا کرتے ہیں، تسبیح و تقدیس میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس نعمت کے لیے اس بخشش و فضل کے لیے جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے اور جس کا وقوع ابھی قریب نظر نہیں آتا، ممکن ہے کہ اس کا کچھ عرصہ کے لیے ظہور نہ ہو، وقوع نہ ہو، لیکن یہی عدم ظہور و عدم وقوع ہمیں اپنی قوتِ ایمانیہ سے کام لینے کا موقع عطا کرتا ہے کہ ہم اس یا رِ پسندیدہ کے حمد و ثنا میں مشغول و مصروف رہیں، جس کے ہاتھوں میں سب کی بھلائی ہے، اور ہر چیز کا پورا اختیار ہے، ﴿فَسُبْحَانَ الَّذِي يُبْدِيهِ مَلَائِكَةٌ كُلٌّ لِّشَيْءٍ وَاللَّيْلُ تَرْجَعُونَ﴾

جامی از یارِ پسندیدہ مبریدہ حاشا

کان پسندیدہ جز کارِ پسندی نکند

ہم شکر ادا کرتے ہیں، حمد و ثنا کرتے ہیں، اس نعمت پر بھی جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے لیکن جس کے متعلق ہمارا ایمان ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے ہمیں عطا کر دی ہے، اور وہ

ظاہر ہونے والی ہے، کہا جاتا ہے کہ جب بارش کی دعا کے لیے لوگ جمع ہونے لگے، تو ایک بچی اپنی چھتری ساتھ لیے دعا میں شریک ہونے پہنچی، اس کو یقین تھا کہ بارش اب قطعاً ہوگی، ہمارا ایمان بھی اس معصوم جان کی طرح ہونا چاہیے کہ مہدار فیاض کی جانب سے وہ نعمت ہمیں قطعاً عطا ہوگی جس کا سوال ہم نے کیا ہے! جس قدر ہماری قوتِ ایمانی قوی ہوگی اسی قدر ہمارے تمام امور میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوگی، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں گی، مومن اپنی قوتِ ایمانی ہی سے ہمیشہ کام لیتا ہے، اور کامراں ہوتا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس نعمت کا خارجی طور نہیں ہوتا، جب ایسا ہو تو یقین رکھو کہ یہ ہمیں ایک بہتر حالت کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہو رہا ہے اور ہمیں حق تعالیٰ کی حکمت و رحمت کا عمیق علم عطا کرنا مقصود ہے، اس لیے بچائے حزن و یاس کے ہمیں حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف رہنا چاہیے، یہ ہمارے ایمان کی بڑی آزمائش ہے، اس خاص وقت کی دعا یہ ہے :-

اللہم لك الحمد حمدًا دائماً مع
دوامك ولك الحمد خالداً مع
خلودك ولك الحمد حمدًا لا فتنه
لہ دون مشیتك ولك الحمد
لا یرید قائلہ الا رضاک ولك
الحمد حمدًا عند كل طريقة عين
تنفس، اللهم اقبل بقلبي الى
دينك واحفظ من ورائك
اول واهدي، ان اضل

اے اللہ حمد تیرے ہی لیے ہے۔ ایسی حمد کہ تیری ہیشگی کے
ساتھ وہ بھی ہمیشہ ہے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی
حمد کہ تیرے دوام کے ساتھ وہ بھی دائم ہے، اور
تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ اس کی انتہا تیری مشیت
کے ادھر نہیں اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ اس
کے قائل کا مقصود تیری ہی خوشنودی ہے، اور تیرے
ہی لیے حمد ہے ایسی حمد جو ہر لپک بھپکانے اور سانس
لینے کے ساتھ ہوا کے اللہ تیرے دل کو اپنے دین کی
طرف متوجہ کرے اور ہماری حفاظت ہمارے اوپر سے رکھ
اپنی رحمت کے ساتھ اے اللہ بے ثبات قدم رکھ کہ میں

ہم اس عین مصروف بہتے ہیں حق تعالیٰ کی ثنا و حمد میں مشغول بہتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ مصیبت سے نجات کا سامان پروردہ غیب سے ظاہر ہوا ہے کہ نہیں اور بالآخر شعور کا وہ نکتہ نمایاں ہوتا ہے، جب اس نجات کا خیال ہی قلب میں حضور نہیں کرتا، اور ہم حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں صرف حق تعالیٰ ہی کی خاطر مشغول و مصروف ہو جاتے ہیں، رضاد و موافقت مولیٰ کے مقام کی طرف ہمارا عروج ہوتا ہے، اب نہ ہم میں کوئی ارادہ باقی رہتا ہے، نہ کوئی خواہش، نہ فعل نہ اختیار، یہ سب ارادہ و فعل حق میں غائب و فانی ہو جاتے ہیں۔

آمد خبر سے زامداد من بعد خبر نامد مارا

یہی شیخ جلی کے الفاظ ہیں الرَّاحَةُ الْكُبْرَى وَالْجَنَّةُ الْمَعْجَلَةُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، اسی کا نام اطمینانِ قلب ہے جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ
بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ
الْقُلُوبُ! (پ ۱۴ سر ۱۰)

جو لوگ ایمان لائے، اور ان کے قلب اللہ تعالیٰ کے
ذکر سے مطمئن ہو گئے، ان اللہ ہی کے ذکر سے دل
کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اطمینانِ قلب یا نفسِ مطمئنہ کے حصول کے بعد بندہ مومن حق تعالیٰ سے راضی ہو کر حُبِّ ذات میں داخل ہو جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنِّتُ اجْعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي
عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي. (پ ۱۳ سر ۱۰)

یہی تحریر ہوتی ہے، یعنی حق تعالیٰ کا پانا اور ان سے راضی و مسرور رہنا :-

یا ربنا است چه حاجت کہ زیادہ طلبم

دولتِ محبتِ آن مونس جانِ ما را بس (حافظ)

فَسَلِّ اللَّهُ تَعَالَىٰ عَلَيْهِمْ

ضمیمہ

شکر کے ذریعہ سلوک کے طے کرنے میں مندرجہ ذیل دعائیں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں، سحر کے وقت ان کا ورد وقت قلبی کے ساتھ جاری رہنا چاہیے :-

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ الْهَيِّ اِنَا الصَّغِيرُ الَّذِي رَبَّيْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الضَّعِيفُ الَّذِي قَوَّيْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْعَارِي الَّذِي كَسَوْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْبَايِعُ الَّذِي اَسْبَعْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الضَّمَانُ الَّذِي سَقَيْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْبَرِيضُ الَّذِي عَافَيْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الدَّاعِي الَّذِي اَجَبْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْفَقِيرُ الَّذِي اَغْنَيْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْبَاهِلُ الَّذِي عَلَّمْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْمُهَانَ الَّذِي كَرَّمْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا السَّائِلُ الَّذِي اَعْطَيْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الرَّاسِخُ الَّذِي اَرْضَيْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْحَائِفُ الَّذِي اَمْنْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْغَائِبُ الْعَسِيرُ الَّذِي اَوْيْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْخَائِطُ الَّذِي غَفَرْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الدَّابِلُ الَّذِي عَزَّزْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاِنَا الْمَجْرُوهُ الَّذِي عَرَّفْتَهُ مَخْرَاةَ الْحَمْدِ وَاِنَا الْعَوْدُ الَّذِي سَتَرْتَهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ اَنْتَ بِيَا فِي كُلِّ كَوْمَةٍ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ رَجَائِي فِي كُلِّ شِدَّةٍ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ خَيْرُ الْاَوْلَادِ عِنْدِي فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ قَدِيمُ الْعَهْدِ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ اَسْمَى لِسُوءِ عَمَلِي قَطُّ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُوَاخِذْ بِي بِمَعْصِيَتِي فَلَاكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُثِمِّتْ بِي عُدُوِي فَلَاكَ الْحَمْدُ وَمَا يَثِبُ فِضِيحِي بِعَمَلٍ فَلَمْ تُعَذِّبْ بِي وَلَمْ تُفْضِحْ بِي فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاَسْرَبُوا الْخَيْرَ قَتِيْرَةً وَاَخَفَاتِ الشَّرَّ مُصْرَبَةً فَلَاكَ الْحَمْدُ وَتَلَطَّفْتَ بِي فِي الصَّغْرِ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَهَدَيْتَنِي لِاِسْلَامٍ فِي الْكِبَرِ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاَرَبَّيْتَنِي التَّنْيَاتِ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَعَلَّمْتَنِي مَا لَمْ اَكُنْ اَعْلَمُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَاَرَزَقْتَنِي مَا لَمْ اَكُنْ اَحْسِبُهُ فَلَاكَ الْحَمْدُ وَسَخَّرْتَ لِي مَا لَمْ اَكُنْ مُقَرَّرًا فَلَاكَ الْحَمْدُ عَظُمْتَ وَكَبُرْتَ فَلَاكَ الْحَمْدُ بِكَ اَصْبَحُ وَاَمْسَى فَلَاكَ الْحَمْدُ بِيَدِكَ مَوْتِي وَحَيَاتِي فَلَاكَ الْحَمْدُ رَبِّ اَلْحَمْدُ

وَأَنَا أَسْأَلُكَ وَلَا تُعَذِّبْنِي وَأَنَا أَسْتَغْفِرُكَ رَبِّ لَا تُحَرِّمْنِي لِقَاءَ سُكْرِي وَ
 لَا تُعَذِّبْنِي لِكثْرَةِ ذُنُوبِي وَأَرْحَمْنِي مِنْ أَجْلِ ضَعْفِي وَأَعْطِنِي مِنْ أَجْلِ
 فَقْرِي وَأَرْحَمْنِي وَأَعْفُ عَنَّا تَعْلَمُ مِنْ ذُنُوبِي فَإِنْ تُعَذِّبْ
 فَإِنَّا الظَّالِمُونَ وَإِنْ تَعْفُ فَإِنَّكَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ
 وَإِنْ تَعْفُ فَطَوَّلْ مَعَنَا وَإِنْ تُعَذِّبْ
 فَغَيْرِ ظَالِمٍ وَلَا مُسْتَوِلٍ

ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

گرچہ دیوار اقلند سایہ دراز باز گرد سوئے او آن سایہ باز

ایں جہاں کوہ است فعلی ماندا سوئے ما آید ہمارا صدا

قرآن عظیم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں ایک لامتناہی حکمت، رحمت و کرم کے ساتھ مصروف عمل ہے اور زندگی کے ہر قدم پر ہماری رہبری کرنے پر آمادہ ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں اور اعصاب کے طریقوں سے واقف ہو کر اس کے دامن میں خشک ماریں، ہمیں کائنات میں بے یار و مددگار بے ولی و نصیر نہیں چھوڑا گیا ہے، ساری زندگی لطف حق شامل حال رہتا ہے، زندگی حق تعالیٰ کی نعمت و فضل سے مملو ہو جاتی ہے، اطمینان قلب و جمعیت خاطر نصیب ہوتی ہے، اگر ہم رضا کے حق کے تابع ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو کافی سمجھ کر سارے کام ان کے سپرد کر دیں!

حق تعالیٰ ہمیں سلامتی و نجات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَاوْرٍ سَآخِرٍ
ان تجربات میں کامیاب کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور جن سے ہم خوفزدہ ہیں: اِنَّ
اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلٰى النَّاسِ (بقرہ ۳۲۶) وہ ہلکے ضعف و کمزوری سے واقف ہیں، وہ ہمارا
بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخَلَقَ الْاِنْسَانَ ضَعِيْفًا ذَلِيْلًا
۵۲ حق تعالیٰ ہمیں برترین سرت عطا کرنا چاہتے ہیں اور اس سرور سے ہلکے قلب کو مملو کرنا چاہتے
ہیں جس کا خود ہمیں اندازہ نہیں فَلَا تَعْلَمُوْا نَفْسًا مَّا تُخْفِيْ لَكُمْ مِنْ قُرْءَانٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ . آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان خزانہ غیب میں موجود ہے اس کی کسی کو خبر نہیں (الاسراء)

۱۵ یہ مقالہ پہلی مرتبہ برہان ہفت جنوری ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا

دنیا میں ہر جگہ ایک کامل الہی نظم موجود ہے جس میں توافق و ہم آہنگی بھی ہے اور سرور و سکینہ بھی! حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی اس نظم الہی کے دائرہ میں بسر ہو اور زمین پر رہ کر ہم جنت کی خوشبو سونگھتے رہیں: **هُوَ الَّذِي يُصَلِّحُ عَلَيْكُمْ وَمَا لَكُمْ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا** (الاحزاب ۶۶) حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے مومن پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں، حق تعالیٰ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ مومن پر بہت مہربان ہیں۔

اسی زندگی میں ہیں نعمت مل سکتی ہے اور حق تعالیٰ ہی ہیں اس کو عطا کر سکتے ہیں، **وَمَا يَكُمُ مِنَ نِعْمَةِ رَبِّكُمْ فَحِينِ اللَّهِ**! اگر ہم حق تعالیٰ پر کامل بھروسہ کریں تو ہماری مثال اس درخت کی سی ہوتی ہے جو پانی کے چشمے کے بازو اگھاری، ہر وقت روحانی قوت و حیات کے سردی چشموں سے ہمیں تازگی پہنچتی رہتی ہے!

صد جو عالم در نظر پیدا کند چونکہ چشمت را بخود بینا کند (رومی)
 اگر ہماری آنکھیں حق تعالیٰ کے مشاہدے کے لیے کھل جائیں اور ہم ہدایت و نظم الہی کے دائرہ میں اپنی زندگی بسر کریں تو ہماری ساری خارجی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں یا غائب ہو جاتی ہیں:
 گر جہاں پُر برفت گردِ سر بسر تاب خور بگدازوش از یک نظر (رومی)
 اس عقیدہ یا ایمان کی مضبوط چٹان پر کھڑے ہو کر زندگی کے کچھ قدیم دستور اصول ہم سے سنو اور زندگی کے تجربات، حالات یا ماحول میں ان سے کام لو، زندگی "گرہیم" نہ رہے گی، "خندہ یکدم" ہو جائے گی!

یاد رکھو کہ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ ہماری باطنی زندگی یا نفس، جیسا ہوگا ویسا ہی عکس ہمارے خارجی حالات ہونگے، ویسا ہی ہمارا آفاق ہوگا۔ آفاق تابع نفس ہے۔ آفاق میں تغیر نفس کے تغیر کا تابع ہے۔ اس صداقت کو قرآن حکیم نے ایک سے زیادہ جگہ واضح کیا ہے، شک و شبہ سے نکلنے کے لیے ہم اس کا ذکر کر رہے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا ۗ وَأَقْبَلِ الْحَقُّ تَعَالَىٰ كَيْسِي قَوْمٍ كِي حَالَتِمْ فِي تَغْيِيرِمْ كَرْتَا

مَا يَأْتِيهِمْ (الرعد ۲۶) جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے
 ذَلِكَ يَأْتِي اللَّهَ لَمْ يَكُ مَغْتَرًا یہ بات اسی سبب سے ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمت
 نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُفْتَرُوا کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ
 مَا يَأْتِيهِمْ (الانفال ۷۶) وہی لوگ اپنے نفس کو نہیں بدل دالتے۔

خارج کا تغیر، ماحول کا بدلنا، حالات پر قابو پانا ہو تو باطن کا تغیر، نفس کا بدلنا ضروری ہے
 اگر باطن میں کجی ہو، نفس خام و ناشائستہ ہو، تو خارج میں کجی، ناہمواری، عدم توافق یا دوسرے الفاظ
 میں درد و غم، قلت و اقلال، ضیق و پریشانی کا ہونا ضروری ہے۔

باطن یا نفس سے مراد ظاہر ہے کہ نفس اور اس کے صفات ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے
 افعال و اعمال ہیں۔ اب ماحول کی ناسازگاری، ضیق و پریشانی، رنج و غم، غم و الم راست نتیجہ ہیں
 باطنی زندگی کا، یعنی رذائل اخلاق کا، اتباع ہوا کا، جرم و معصیت کا، بدکرداری و گناہ کا، قرآن
 میں نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہو وہ تمہارے ہی
 كَسَبَتْ آيْدِيكُمْ وَتَعْفُوا عَنْكُمْ ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہو اور بہت
 كَثِيرٌ (شوریٰ ۵۶) تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی اصول کو کسی اور جگہ اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔
 أَوَلَمْ نَأْتِكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ قَدْ أَصَبْتُمْ اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی کہ تم اس سے
 مِثْلَهَا قَالْتُمْ إِنَّا لَنَاقِلُونَ هَذَا، قُلْ هُوَ مِنّ اور چند پہنچا ہے کہ تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے
 عِنْدِ الْفُسَيْكُمُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ آنی؟ آپ فرما دیجیے کہ یہ تکلیف تم کو تمہارے
 شئیں قَدِيرٌ (پ ۸۶۴) ہی طرف سے پہنچی۔

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا:
 إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ تَرُدُّ عَلَيْكُمْ یہ تمہارے اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں۔

دوسری جگہ یوں سرمایا :

إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أَحْصِيهَا يَوْمَئِذٍ يَوْمَئِذٍ أَعْمَالُكُمْ كَمَا بَدَلْتُمْ بِهَا نَفْسَكُمْ يَوْمَئِذٍ تَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ
 تَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ وَجَد خَيْرًا فَيُعْتَدُ اللَّهُ مَنْ جَدَّ غَيْرَهَا فَلَا يُؤْتِيهِمْ لِحْمِهِمْ وَلَا يُؤْتِيهِمْ لِحْمِهِمْ وَلَا يُؤْتِيهِمْ لِحْمِهِمْ
 يَلُومُنَ الْآلَةَ نَفْسَهُ . اس کے خلاف پائے تو سوائے اپنے نفس کے کسی پر ملامت نہ کرے

اس اصول کی وضاحت میں صوفیہ کرام نے جو مثال استعمال کی ہے وہ نہایت صحیح اور صاف ہے، وہ شخص اور اس کے سایہ سے اس اصول کو سمجھاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے اگر کوئی شے ٹیرھی ہو تو اس کا سایہ بھی ٹیرھا ہوگا اور اگر سیدی ہو تو سایہ بھی سیدھا ہوگا۔ نفس شخص کی مانند ہے اور راجل اس کا سایہ ہے یا صفات و اعمال شخص کی مثال ہے، حالات و واقعات ان کا عکس و سایہ ہیں۔ شیخ ابوالنجاء اپنے احباب سے کہا کرتے تھے۔

اعلموا ان جميع الوجود يقابلكم بحسب يعني "جان لو کہ جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں وہ مابرزمنکون من الاعمال، فانظروا ہی تمہارے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، اسی لیے ذرا کیفیت تکون، فان الظل تابع اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے الشاخص في العوج والاستقامة تابع ہوتا ہے کبھی و راستی ہر دو میں۔

اس صداقت پر امام شعرانی کو اتنا یقین تھا کہ اگر اپنے دوستوں یا بیوی یا نوکروں سے کجروی یا شہزادگری اپنے معاملہ میں پاتے تو ذمہ دار اپنی ذات کو کھٹراتے اور اپنے ہی پر ملامت کرتے۔ ان کا یہ قول مشہور ہے۔

إن الوجود يعاقلني على صورة عاقلتي یعنی "لوگ میرے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں
 یہ، فاللوم على لاعلمهم في الاصل جیسا کہ میں ان کے ساتھ کرتا ہوں، پس ملامت
 لانهم كظل الشاخص على حد سواء میری ہی ذات پر ہونہ کہ ان کی ذات پر کچھ نہ
 فان كان الشاخص مستقيما فالظل ان کی مثال کسی شے کے سایہ کی مانند ہے۔ اگر

مستقیماً او اعوج فالظل اعوج شے سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہے اور اگر شے
ومن طلب لاستقامة الظل طیرھی ہو تو سایہ بھی ٹیڑھا۔ جس شخص نے اس بات
مع عوج الشاخص فقد رام کی توقع کی کہ طیرھی شے کا سایہ سیدھا ہوگا تو
المحال۔ اس نے محال کی تمنا کی

قرآن عظیم نے کل نفس بما کسبت رھینہ اور کل امری بما کسب رھینہ اور لھا
ما کسبت وعلیہا ما اکتبت اور من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فطیہا کہہ کر
اس صداقت کی توضیح کی ہے، اس اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو! یہ وہی اصول ہے
جس کو امیر مینائی نے عاشقوں کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

یہ رونا بیوفائی کا یہ شکوہ کج ادائیگی کا سزا بردل لگانے کی امزہ پر آخانی کا
فلسفہ اخلاق کی زبان میں اس کو یوں بیان کرتے ہیں، الناس مجزیون باعمالہم
ان خیرا فخیروا ان شرکافشر۔ لوگوں کو اعمال کی جزالتی ہو اگر اعمالی اچھے ہوں تو ان کی جزا
بھی اچھی ہوتی ہے اور اگر اعمال بد ہوں تو ویسی ہی ان کی جزا ہوتی ہے!

بنیادی اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب ماحول یا واقعات زندگی کے سلسلہ میں تمہیں چند
باتیں سمجھنی ضروری ہیں۔

اوپر بیان کیے ہوئے اصول پر غور کرنے سے تمہیں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ
زمین و آسمان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے لیے کا بدلہ دیا جائے اور قرآن
کرم نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کر دی ہے:-

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ
يَجْزِي كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ
لَا يُظْلَمُونَ۔ (الباقیہ ۱۶) اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جائے۔

یاد رکھو کہ زندگی کا مقصد طفل شیرخوار کی طرح ہماری دایہ گری کرنا نہیں! یہ فراموشی واجب بات کا

بارہاے کڑھوں پر رکھتی ہے تاکہ ان کی ادائیگی میں ہم زیادہ سے زیادہ قوی ہوتے جائیں،
ہمارے اخلاقی اعصاب و عضلات طاقتور ہوں اور ہم انسانِ کامل بن جائیں اور اس سرور
ستی سے بہرہ یاب ہوں جو کالمین کے لیے مقدر کی گئی ہے!

یاد رکھو کہ ہماری زندگی ایک تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے معلم اور استاد ہیں اور
مرمکے واقعات اور حادثات وہ آلات ہیں جن کے ذریعہ ہماری سیرت کی تکمیل کی جارہی
ہے۔ دنیا کی مثال ایک روح ساز وادی سے دی جاتی ہے۔ یہاں کبھی غم کی مضراب سے
اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتمے بیدار کیے جاتے ہیں، راحت و غم، بلا و طرا،
لذت و الم ہمیں اپنا سلوک طے کرنے میں مدد دے رہے ہیں، دونوں پہاڑے لیے خیر ہیں،
ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی ہے۔

بس زبونِ دسو سبانشی لا گرطب را باز دانی از بلا

موت و حیات کی تخلیق قرآن حکیم کے الفاظ میں اس لیے ہوئی ہے کہ اس امر کی آگاہی
کی جائے کہ ہم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے:

جَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيُبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (المائدہ: ۱۶)

جب حقیقت یہ ہو تو عارف نہ زندگی کے تغیرات سے گھبراتا ہے نہ ان سے بھاگنے کی
کوشش کرتا ہے، یہ تو اس کی تادیب و تزکیہ کے لیے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ان تغیرات و
تحولات سے وہ اسی طرح سبق لیتا ہے جس طرح کہ ایک ذہین و محنتی طالب علم استاد کی تقریر و
تعلیم سے استفادہ کرتا ہے، اپنے جہل کو دور کرتا ہے، اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کا تصفیہ اور
اپنے دماغ کا خیالاتِ فاسدہ سے تخلیہ کرتا ہے، ان واقعات و تغیرات کی حیثیت اس کی نگاہ
میں ایک پردہ کی سی ہے اور اس پردہ کے پیچھے وہ حق تعالیٰ ہی کو مصروفِ عمل دیکھتا ہے اور
شیخ جیلجلی کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

رَبِّ اَشْهَدُنِي مُطْلَقَ قَاعِلِيَّتِكَ فِي اَنْتَ پُروردگار مجھے ہر شے میں اپنی قاعدیت کا

کُلِّ مَفْعُولٍ حَتَّى لَا أَرَى فَاعِلًا غَيْرَكَ ۖ مشاہدہ نصیب کرتا کہ تیرے ہوا کی کو فاعل نہ دیکھوں تاکہ
لَا كُونُ مُمْطَمِنًا تَحْتَ جِرْيَانِ اِقْدَارِكَ ۖ تیرے اقدار کے جاری ہونے سے مطمئن ہو جاؤں
مُنْقَادًا لِكُلِّ حَكِيمٍ! اور تیرے حکم کا مطیع و فرمانبردار بن جاؤں۔

اسی علم و عرفان کے ایک متوالے کی زبان سے یہ سریلے نغمے نکلے ہیں :-

یارست مر اور لے پردہ	خس رخ او سز لے پردہ
عالم ہمہ پردہ مصور	اشیاء ہمہ نقشہا لے پردہ
ایں پردہ مرا ز توجہ ا کرد	اینست خود اقتصا لے پردہ
نے نے میان ماجدائی	ہرگز نکند غطا لے پردہ (لا علم)

جاہل تغیرات کو پسند نہیں کرتا، ان سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے، ان کا مقابلہ کرتا ہے، مزاحم ہوتا ہے؛
لیکن زندگی دائمی تغیر کا نام ہے، سکون محال ہے قدرت کے کارخانہ میں، اس لیے جاہل کا مقابلہ خود
زندگی کے قانون اور اس کی قوتوں سے ہے، یہ قانون اور اس کی قوتیں مقصد غایت کے لحاظ
سے منصفانہ اور مہربان اور عمل کے لحاظ سے غیر جانبدارانہ اور ناقابل شکست ہوتی ہیں۔

ہیں زندگی کے واقعات و تغیرات کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے ساتھ برضا و رغبت
اشتراک عمل کرنا چاہیے یعنی ہمیں اس سبق پر نگاہ رکھنی چاہیے جو ہمیں ان واقعات و تجربات کے
ذریعہ دیا جا رہا ہے کیونکہ جب ہم اس سبق کو یاد کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و عمل میں
تغیر پیدا کر لیتے ہیں تو پھر یہ تکلیف دہ، ناخوشگوار اور المناک واقعات و تجربات رفع ہو جاتے ہیں
اور طمانیت و ہر قلبی ہمیں نصیب ہوتی ہے حقیقی معنی میں کامیاب زندگی کا راز حق تعالیٰ کے
ارادے اور مقصد کے ساتھ توافق و اتحاف ہے۔ اور اس مقصد و ارادہ کا اظہار ان ہی واقعات و
تجربات و تغیرات میں ہونا ہے جس کے ساتھ توافق ضروری ہے جس کا شرع کی زبان میں "توافق بالقضاء"
نام ہے، جس کو "رضا بالعطا" و "حفظ حال" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، اسی لیے واقعانہ راز لے کہا ہے کہ
بدیں سپاس کہ مجلس منورست بناز گرت چو شمع جفکے رسد بسوز و بساز

ہیں دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تجربات کے ذریعہ سیرت کی تکمیل کریں، اپنی پوشیدہ و
 شفقہ روحانی قوتوں کو ظاہر و نمایاں کریں جو الہی قوتیں ہم میں بالقویٰ ہیں انہیں بالفعل کریں
 اور ہم اسی صورت میں ارادۃ اللہ کے ساتھ توافق قائم کر سکتے ہیں جب ہم اپنی زندگی کے واقعات و تجربات
 کے ساتھ برضا و رغبت اشتراکِ عمل کریں، اور جو سبق وہ ہمیں سکھانے کے لیے رونما ہو رہے ہیں انہیں
 سیکھیں نہ کہ ان سے تجاہل برتنے کی کوشش کریں:

در ریاض بندگی رعنا از شلخ گلست گرنے کز بار تسلیم و رضا خم می شود!

تمام تجربات کا مقصد ہیں اس گراہ پر لے چلنے ہے جو خدا کی طرف لے جاتا ہے، ہم اپنے جہل
 کی وجہ سے اس راہ سے بھٹک جاتے ہیں، دور جا پڑتے ہیں! جذبات و شہوات ہیں صراطِ
 مستقیم سے ہٹ لے جاتے ہیں، صراطِ مستقیم کی طرف ہلکے قدم اسی وقت اٹھ سکتے ہیں جب
 ہماری سیرت کی تکمیل ہو اور ہمارا روحانی ارتقا عمل میں آئے، اب زندگی میں رونما ہونے والے سارے
 تجربات و واقعات ہماری سیرت کی تکمیل کرتے ہیں اور ہلکے روحانی ارتقا میں مدد دیتے ہیں تاکہ ہم
 اس صراطِ مستقیم پر چلیں جو حق تعالیٰ کی طرف ہمیں لے جاتی ہے۔ لہذا تجربات و حالات خوشگوار ہوں
 یا ناخوشگوار، مسرت بخش ہوں یا غمناک، بہر طور یہ ہلکے خیر برتے کے حصول کے لیے ضروری و لا بدی
 ہیں، ان میں ہلکے لیے ہدایت کا ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے اور جس پر عمل پیرا
 ہونے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے اور جو ہی ہم نے اس ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے
 شقاوت و گمراہی سے نجات مل جاتی، اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج ضیق، خوف و حزن
 سے بھی!

مَنْ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ توجو شخص میری اتباع کرے گا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور
 وَمَنْ أَعْرَضَ عَنِّي ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ شقوی اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض
 مَعِينَهُ ضَلَّكَ وَتَحْسُرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا عینا ہوگا اور قیامت
 آئنی (طرہ ۱۴) کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

ہر تجربہ، ہر واقعہ زندگی کا خیر امتنا ہی کی طرف لے جاتا ہے، تصادم کی بجائے اس سے توافق ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے، رضا بالقضار اسی کو کہا جاتا ہے، ہماری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں نازل ہوتا مگر وہی جو حق تعالیٰ نے پہلے سے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ پہلے سے مولیٰ ہیں، آقا ہیں ہمیں اپنے سب کام انہی کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

شاد و خنداں میں پیش سربند، بچو آئیل پیش سربند (رومی)

تمام تجربات و حادثات دوا و معالجہ کی غرض سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں، پھر ان دردناک حادثات کی تکرار عموماً نہیں ہوتی، پھر راحت و طمانیت ہی میں زندگی گزرتی ہے۔

بسرود گرم جہاں خاطر چوراضی شد تمام عمر تر آب سرد و نان گرم است۔ (دیلم)

جب تک ہم حادثاتِ زمانہ سے سبق نہیں لیتے بکجروی و گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں،

اتباعِ شہوات میں گرفتار رہتے ہیں اور ان مصائب و آفات کو خود پیدا کرتے رہتے ہیں

جن سے ہم نجات پانا چاہتے ہیں، جب ہم نے سبقِ ہدایت حاصل کیا، ہماری سیرت بدلتی

ہے ہم میں تقویٰ کے صفات پیدا ہوتے ہیں، ہمارا نقطہ نگاہ بدلتا ہے، قانونِ الٰہی کے مطابق

ہم فکر کرنے لگتے ہیں، حق تعالیٰ سے ربط قائم کرنے لگتے ہیں، ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے

لگتے ہیں۔ آفات و مصائب کا درود جس غرض کی تکمیل کے لیے ہو رہا تھا اب وہ غرض چونکہ

پوری ہو چکی ہوتی ہے، وہ بھی بتدریج غائب ہونے لگتے ہیں۔

دردناک تجربات و حادثات ہی سے ہمیں سبقِ ہدایت حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ ان تجربات و

حالات سے بھی جو خوشگوار اور راحت بخش ہوتے ہیں سبق سیکھنا ضروری ہے۔ آسائش و نعمت

کی حالت میں بھی ہمیں شکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کی یاد میں رہنا چاہیے چنانچہ تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے

فَلْيَكْتُمُوا لِلَّهِ آءِ عِيْدًا رِخَاءً عِينِ وَأَسْأَلُكَ فِي وَقْتِ زِيَادَةِ دَعَاكَ تَهْنِئَةً رُحْمًا

چین کی حالت میں دعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر نعمت کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھا جائے وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ کیونکہ درحقیقت منعم وقاسم نعمت حق تعالیٰ ہی ہیں، لہذا ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے جب ہمیں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں، جب ہم عافیت کی حالت میں ہوتے ہیں، جب ہمیں صحت و تندرستی ملتی ہے، امراض و آلام سے محفوظ ہوتے ہیں، فراخی و آسائش سے متمتع ہوتے ہیں تو یہ سب بہاری آزمائش و ابتلا کے لیے ہوتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اس عافیت کے نتیجے کے طور پر ہم میں کبر و عجب تو نہیں پیدا ہوتا، ہم شہوتوں اور لذتوں کے درپے تو نہیں ہو گئے، موجودہ نعمتوں کو حقیر و خوار تو نہیں سمجھتے لگے اور ان نعمتوں میں عیب و نقصان تو نہیں نکالنے لگے؛ دیکھا جاتا ہے کہ کیا نعمتوں اور راحتوں کی وجہ سے ہم حق تعالیٰ کی اطاعت سے روگرداں ہو کر گناہوں اور معصیتوں میں منہک تو نہیں ہو گئے؛ اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ نعمت کی آزمائش مصیبت کی آزمائش سے زیادہ سخت ہوتی ہے، خوشی کا فتنہ تکلیف کے فتنے سے بہت بڑا ہوتا ہے؛ صاف بات ہے کہ گناہوں پر قدرت ہونے کے باوجود ان سے رک جانا یا صبر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے؛ عیش و آرام سے انسان کا جسم فریب ہونے لگتا ہے عیش و آرام بغیر اس کو صبر نہیں آتا اور دوام عیش اسی وقت ممکن ہے جب اس کے حصول میں وہ لوگوں سے مدد چاہے اور ظالموں سے لبتجا کرے اور یہ امور نفاق، کذب، ریا، بغض، دشمنی کا سبب ہو جاتے ہیں اور ان سے تمام روحانی مملکت پیدا ہوتے ہیں، قلب کے سارے امراض جنم لیتے ہیں، اسی لیے صادق مصلح صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ”دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے!“

جب انسان نعمت و عافیت کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ عموماً حق تعالیٰ کی یاد سے غافل رہتا ہے، ازویا دولت کی تدبیریں، اپنے بچاؤ کا خیال، مال کی حفاظت کا بندوبست، اس کے خرچ کرنے کا انتظام، یہ تمام امور اس کے قلب پر هجوم کرتے ہیں، اور یہ سب اس کے

المصباح الدینی (اس کی خطبہ درواہ البیعتی فی الشعب وابن ابی الدنیا)

دل کو سیاہ کرتے اور حق تعالیٰ کی یاد سے غافل کرتے ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ مَحْتَىٰ نَزْدَتْهُ
الْمَقَابِرَ
تک کہ تم قبرستانوں میں بہنچ جاتے ہو

اسی لیے عیش سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ حضور انور صلعم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ ”تم تنعم سے بچو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش کرنے والے نہیں ہوتے (إِنَّ عِبَادَ اللَّهِ لَتَتَّبِعُوا بِالْمَتَّعِينَ)

یعنی کہ نعمت کا فتنہ مصیبت کے فتنہ سے بہت زیادہ سخت ہوتا ہے اور نعمت و مصیبت ہر دو ہمارے لیے ابتلا یا آزمائش ہیں! اسی حقیقت کو قرآن حکیم میں حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں:

وَقَطَعْنَا فِي الْأَرْضِ أُمَّمًا لَهُمْ
الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ وَ
بَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُونَ (پ ۱۱۶)

ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں۔
ان میں سے بعض نیک تھے اور بعض اور طرح
کے اور ہم ان کو طویش عالیوں اور بد حالیوں
سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں۔

اسی طرح فرمایا:۔

وَتَبْلُوَكُمْ فِي الشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (پ ۱۱۶) اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے بھی طرح آزماتے ہیں۔
نعمت و عافیت کی حالت میں مرد مومن مشکور ہوتا ہے، یہی اس حالت کا ادب ہے۔
المؤمن مشكور عند الرِّخَاءِ مومن چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے،
دل و زبان و اعضا کے شکر سے نعمتیں سلب نقصان سے محفوظ ہوتی ہیں اور ان میں اضافہ

ہوتا ہے،

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ
اَلرِّقْمَ شَكَرُوا وَتَوْقِيئًا هُمْ نِعْمَتٍ فِيهِمْ اَمَّا قَدْحًا
خُوبٌ سَجَّ لَوْ كَرِهَ اِلَهَابِ دَعَا رِزْقٍ وَعَقَا، تَوْبَهُ وَمَغْفِرَتِ كَا اِنْخِصَارِ اِسْمِي مَرْضَىٰ بِرُكْحَا بِرُكْحَا
تو دیا، چاہا تو نہ دیا، لیکن شکر کے معاوضہ میں زیادتی نعمت بلا تکلف ہے، اسی لیے حضور انور صلعم

نے فرمایا:

مَنْ تَزَلَّتْ إِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا جِس كُو نِعْمَتِ لِي وَه اس كاشكرا ادا كرے!

نیز فلیکنثر الدعاء عند الرخاء چین و آسائش کی حالت میں زیادہ دعا کرتے رہو زندگی کے تجربے، حادثے، تغیر و تحول ہماری آزمائش، ہماری سیرت کی تعمیر و تکمیل ہماری صلاحیتوں کو بیدار کرنے، بالقویٰ کو بالفعل کرنے ہی کی غرض سے رونما ہو رہے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں ملامت و نالامت اور انسان کے نفس کی بھی دو حالتیں ہیں تیسری حالت نہیں۔ ایک عافیت دوسری بلا، نالامت یا دردناک حادثات کا درد اس لیے ہوتا ہے کہ ہم کج روی سے باز آجائیں، شہوتوں کے اتباع سے رک جائیں، سیرت کی اصلاح کر لیں، سوہانِ قضا ہمارے پیکر خالی کو پختہ و ہموار بناتا ہے، اس کی کمی و غامی کو غم و الم کے انگارے سے دور کرتا ہے بقول آقا:

جہانِ ما کہ جزا نگارہ نیست اسیر القلابِ صبح و شام است
ز سوہانِ قضا ہموار گردد ہنوز این پیکر گل ناتمام است

نفس کی اس حالت کو بلا و مصیبت کی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لامت یا نعمت و عافیت کے حالات سے بھی ہماری آزمائش ہوتی ہے، اگر ہم ان حالات میں یاد حق سے غافل نہ ہو جائیں، اپنا رخ حق تعالیٰ ہی کی جانب رکھیں، ان کی نعمتوں کو ان کی مرضی کے مطابق استعمال کریں تو ہم اپنے باطن میں یہ ندا سنتے ہیں:-

أَرْكُضْ بِرِجْلِكَ هَذَا مَغْتَسِلًا اپنا پاؤں مارو یہ نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے
بِأَسْرَدٍ وَسُرَابٍ (پہا ۶۱۳)

اور پینے کا۔

یعنی ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت، لطف و منت کے دریا سے سیراب ہوتے ہیں، ہم پلان کی نعمت و ناز و محبت کے دروازے کھل جاتے ہیں، ظاہر و باطن کی نعمتیں ہم پر تمام کر دیتی ہیں اور حق تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ہماری پرورش و پرورش کرتے ہیں اور یہ حالت موت کے وقت تک باقی رہتی ہے اور موت کے بعد وہ اپنے فضل و کرم سے ایسی نعمت عطا

کرتے ہیں جس کو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا اور نہ کسی کے دل پر اس کا خطرہ گزرا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجده ۲۶)

نا ملائم یا دردناک واقعات و حادثات پر غالب آنے کا طریقہ تعطل، عجز، کسل، صبر، ہزول، ماتم و سینہ کو بی نہیں، نہ مزاحمت و مقابلہ، سرکشی و سب و شتم ہی ہے بلکہ جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی ان حادثات کے سبق ہدایت سے مستفید ہونا، صبر و استقامت، حکمت و عقلمندی سے اپنی سیرت و اخلاق میں تغیر پیدا کرنا ہے! ہم میں سے اکثر کے لیے اس امر کا اعتراض سخت مشکل ہے کہ ہماری زندگی میں جو کچھ بھی درد و غم، اندوہ و الم کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس کی اصلی علت خود پہلے نفس میں پوشیدہ سرگرم عمل ہوتی ہے، شیخ محمدی الدین اکبرؒ کی یہ تہذیب کہ "يُذَلِّكُ كَسْبَتًا وَفَوْكُ فَهْمٍ" یہ تیرے دونوں ہاتھوں کی کمائی ہے اور تیرے منہ کی مانگ ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور ہم الزام زندگی پر رکھتے ہیں، حق تعالیٰ پر تہمت لگاتے ہیں یا اپنے ہم جنسوں کو متہم ٹھہراتے ہیں، اور اس سبق کو سیکھنے سے انکار کرتے ہیں جو حادثات و المناک واقعات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی لائقناہی حکمت میں سکھانا چاہتی ہے۔ ہم ٹوٹے ہوئے دل لے کر چیخ اٹھتے ہیں کہ "لوگو! دیکھو، میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہے! ایک مصیبت ختم نہیں ہونے پاتی کہ دوسری اس سے زیادہ آفت مجھ پر نازل ہوتی ہے!

بتلاؤ میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب میری تقدیر کا نوشتہ ہے! ہلکے تقدیر!

گر روم سوئے بھر بر گردد	طلحے دارم آنکہ از پے آب
آتش بازنخ فسردہ تر گردد	ور بدوزخ روم پے آتش
سنگ نایاب چون گہر گردد	ور زکوة التماس سنگ کم
ہر دو گوئیم بچکم کر گردد	گر سلائے برم بہ نزدیکے
خاک عالی بہ نریغ زر گردد	در بصرار روم بچستن خاک
ہر کار روزگار بر گردد	این چنین حالہا پیش آید

ترجمہ: ہر ایک کی تقدیر لکھی ہے

ترجمہ: دیکھو فتنوں کی عین عین

لیکن سب بات تو یہ ہے کہ ہمارے روحانی ارتقاء کے لیے جن حالات کی ضرورت ہے ہم خود انہیں اپنی طرف جذب کرتے ہیں، ان تمام بلاؤں اور آفتوں کا باعث خود ہم ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع و مانع الفاظ میں ہماری تھوری متبوعہ و شیعہ مطامع و خواہشات نفسانی جن کا اتباع کیا گیا اور وہ مرض جس کی پیروی کی گئی ہے، جب ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ "ازما خیر و بر ما یرید" اور زندگی میں کامل انصاف ہے تو پھر ہم حج اٹھتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ
النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (یونس ۴۱) لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

بہم اپنا رخ حق تعالیٰ کی طرف کر لیتے ہیں "انصار اللہ" بن جاتے ہیں، حق تعالیٰ کی مخالفت ترک کر دیتے ہیں، ان کے قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتے، ان کے قوانین کی پابندی کرنے لگتے ہیں، اسی میں ہماری عظیم الشان کامیابی ہے!

احول پر غالب آنے کا بس یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے قلب کا جائزہ لیں اور خارجی مشکلات و آفات کے اسباب و علل کی تلاش و آفیس میں کریں۔ اگر ہم دیکھیں کہ حق تعالیٰ کی محبت سے ماوا قلب عاری یا خالی ہے، ذہنی لذتوں اور شہوتوں سے ملوے، اس کے کردار پر گرفتہ ہو، اس کے رنگ و بو پر فدا، اس کے خندہ گرہ آمیز مرقبان، تو ہمیں اپنے نفس کو مخاطب کہہ کے کہنا ہے کہ

فَلَا تَغْتَرَّ بِكُمْ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا
يَغْتَرَّ بِكُمْ بِاللَّهِ الْعَرُّ وَدُرِّيَّةٌ (۱۳۶) دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں نہ ڈالے۔

انفس کے تغیر کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیے اور اس وقت کے اخطار میں نہ رہنا چاہیے جب حالت کا نزول ہونے لگے اور میں مجبوراً ایسا کرنا پڑے۔ عموماً ایسی ہوتا ہے کہ ہماری یہی کاری کی بسے ہمارے قلب کی محبوب ترین چیز ہم سے بچین لی جاتی ہے، اور اس وقت ہم شدتِ حزن

فرط غم سے ہر چیز سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کے قدموں پر گر جاتے ہیں اور ہمارے قلب سے چیخ نکلتی ہے۔

اللَّهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِي وَتَرَى

مَكَانِي وَتَعْلَمُ سِرِّي وَعَلَانِيَتِي

وَاغْفِرْ عَلَيَّ شَيْءًا مِنْ اَقْرَبِي

وَ اَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ الْمُسْتَفِيتُ

لِلْمُسْتَجِيرِ الرَّجُلِ الْمَشْفُوقِ لِلْمَقْرَبِ

الْمُعْتَرِفِ بِذُنُوبِي اَسْأَلُكَ

مَسْأَلَةَ الْمَسْكِينِ وَابْتِهَالًا بِكَ

ابْتِهَالًا لِلذَّنْبِ الذَّلِيلِ اَدْعُوكَ

وَعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيحِ وَدَعَاءَ

مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رِقْبَتَهُ وَ

فَاضَتْ لَكَ عِبْرَتَهُ وَذَلَّ لَكَ

جَسَدَهُ وَرَعَاكَ الْفَقْرُ الْاَلِيمُ

وَلَا تَجْعَلْنِي بِدَعَايِكَ شَقِيحًا وَكُنْ

لِي سَرْمُوْقًا رَحِيْمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ

وَيَا خَيْرَ الْمُعْطِيْنَ !

رکوع اعمال میں ابن عباسؓ و عبد بن جعفرؓ

جائے والوں سے بہتر نہ سمجھنے والوں سے بہتر نہ

بلا کے نزول کے بعد ہم وہی کرتے ہیں جو نزل سے پہلے بھی رضا و رغبت کے ساتھ کر سکتے

تھے غم و الم کے انکار سے بچنے کے پہلے اگر ہماری عبدیت کی یہی کیفیت ہوتی تو ہم پر یہ عذاب

ہی نازل نہ ہوتا:

مَا فَعَلَ اللهُ بِعَلَاءِ بَكْرَةَ شَكَرْتُمْ اِنَّهٗ تَعَالَى اَمْ كَلِمَةٌ كَرِيْمًا اِنْ تَعْلَمُوْنَ

وَأَمِّنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا
 اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑی قدر کرنے والا
 عَلِيمًا. (پ ۸۶) اور خوب جاننے والا ہے!

عذاب یا دردناک تجربوں اور مصیبتوں سے بچنے کا طریقہ ایمان و شکر ہے، عقیدہ و عمل ہے
 ایمان باللہ و عمل صالح ہے، یعنی "نفس" کا تغیر ہے، نقطہ نظر کا بدلنا ہے، سیرت کی اصلاح ہے،
 تقویٰ کا پیدا کرنا ہے، حق تعالیٰ کا دامن پکڑنا ہے، ان کی ہدایتوں پر عمل کرنا ہے، ان کے
 بتائے ہوئے طریقوں پر چلنا ہے، ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی عافیت کے حوزہ میں آگ لگاتے
 ہیں، ہم خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں، ہم خود اپنی جانوں کے دشمن ہیں، ہمارے سوا ہمارا کوئی
 دشمن نہیں، شیخ ابوسعید ابوالخیر نے اس حقیقت کو خوب لکھا ہے:

آتش بد دوست خویش در حوزہ خویش چوں خود زہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش اے مائے من و دوست من دامن خویش

اسی لیے حق تعالیٰ نے جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ ہیں، ہم سبوں کو انگلوں اور
 پھپھلوں کو ایک ہی وصیت فرمائی ہے اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی بسر کریں۔

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا
 واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا جن کو تم سے پہلے

الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ
 کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ حکم خداوندی کی اطاعت کرو اور

أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ (پ ۱۶۶) اس کی مخالفت سے جو یعنی تقویٰ کی زندگی اختیار کرو

کامیاب زندگی کا قرآنی تصور

۶ تقصیر مکن دانہ خود را شجرے کن (صائب)

کامیاب زندگی! کتنا پاکیزہ، کتنا بلند نصب العین ہے، زندہ دلوں کا مقصود ہے، مطلوب ہے، محبوب ہے، اس کے چہرہ زیب سے ذرا نقاب تو اٹھا دو، دن کی پوری روشنی میں اس محبوب کے خدو خال نظر آئیں اور ہم حجب اٹھیں۔
دستے کہہ کر تو بدیں آئے، تاب نخت گرد رہت بر آئیم، آفتاب رحمت (بہ نور ہوائی) در ز بقول عرفی "خواب ناویدہ" کی تعبیر تو کچھ بے معنی چیز ہوگی۔

کامیابی کا لفظ آپ اپنا مفسر ہے، مقصود کا پانا کامیابی ہے، زندگی وہ کامیاب ہے جو اپنے مقصود سے ہم آغوش ہے، اب زندگی کا مقصود کیا ہے؟ بچوں کو سادہ زبان میں سمجھا کر اس سوال کا جواب پوچھو، تو وہ کھیل کود، تماشائے امور و لعب ہی کو مقصود زندگی قرار دینگے۔ لیکن جب بچپن کی منزل سے گزر کر جوانی کی دلفریب وادی میں قدم زن ہوتے ہیں، تو اب ان کا مقصود نئی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے، اب وہ زیب و زینت و آرائش و زیبائش اور تفاخر کو غایت حیات قرار دیتے ہیں، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو تمام "اقدار سے بالاتر! التباس کا یہ زمانہ بھی گریز پاتا ہوتا ہے، اور وہ بہت جلد زینت و تفاخر کو بچپن کی بے معنی خواہش سمجھنے لگتے ہیں، جب ان کی عقلوں میں غلطی پیدا ہونے لگتی ہے تو پلٹ کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہیں، اور کہہ اٹھتے ہیں
اے آنکہ تمام آرزو ہوئی طفلی مستی مغبلی خود چہ کسی! (ربیع و اخلا)

اب زینت و آرائش سے زیادہ ٹھوس قیمتوں کی طرف ان کی نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں، وصالِ دولت کے تناظر، جاہ و مرتبت کے ترفع کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتے ہیں، اوزن بچپن اور جوانی کی خام آرزوؤں کو خطا اورستی سے تعبیر کرتے ہیں، پختہ عقل کی پسند کی ہوئی قیمتیں اب ان کا نصب العین ہوتی ہیں، انہی کے حصول میں وہ شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں سمجھتے ہیں کہ بس ان کو پا کر وہ سارے عالم سے غنی ہو جائینگے، طمانیتِ قلب ان کو میسر ہوگی، اور راحتِ جان نصیب! اسی مغالطہ میں ان کی زندگی کے مختصر و معین دن گزرتے جاتے ہیں۔ رنج و راحت کی مقدر مقرر انہیں ملتی ضرور ہے لیکن اہل کی درازی اور عمر کی کمی بالآخر ان کی زبان سے یہ کہلاواتی ہے۔

شد عمر تمام و نامتسا میم ہنوز در دنیا حیرتیم و خایم ہنوز
 عمریت کہ در راہ طلب گام ز نیم دی طرفہ کہ در نخست گامیم ہنوز (ہومن یزدی)

پیری کی منزل میں قدم رکھ کر انسان کی بصیرت میں عموماً روشنی پیدا ہو جاتی ہے، اب وہ زندگی کے مختلف تجربات سے واقف ہو جاتا ہے، ان کے تمام التباسات کو جاننے لگتا ہے اور نظر کا دھوکا جس کا ہر قدم پر جوانی میں وہ شکار ہو رہا تھا، اب اس سراب کو آبِ خوب کو خرابِ عطر کو شراب کہنے اور سمجھنے پر مجبور نہیں کرتا، اب وہ اشیا کے حقائق کا کسی قدر عارف ہو جاتا ہے، زندگی کے گونا گوں تجربات کا ذخیرہ تصورات کی شکل میں اس کے حلقہ میں محفوظ ہوتا ہے، ان ہی سے کام لے کر وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہو جاتا ہے، اس کا تخیل زندگی کو ہری بھری کھیتی کے مشابہ پاتا ہے، جس کی چند روزہ رونق و بہار نظر فریب ہوتی ہے، دلکش ہوتی ہے ہوش رہا ہوتی ہے، فریب خوردہ عقل اس کو دائمی اور مستعمل سمجھتی ہے، اس کی پرستش کرنے لگتی ہے، اس کو اپنا مطلوب بنا لیتی ہے، اور اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے، یکایک اس کھیتی کا رنگ بدلنے لگتا ہے، یہ زرد پڑ جاتی ہے، آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں۔ گان نہ تعن یا لامسی!

احوالِ جہاں واصلِ این عمر کہ ہست خوابے و خیالے و فریبے و دے است (خیام)

قرآن کریم نے اس حقیقت کو چند پاکیزہ جملوں میں یوں ادا کیا ہے :-

إِعْمَلُوا إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو و لعب اور

كُلُّهُمَّ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال

فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمِثْلِ نَمِيثٍ واولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا

أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهَيِّجُهُمْ فِتْرَاهُ ہر جیسے بیسہر کہ اسکی پیداوار کا شتکاروں کو اچھی

مُضَعَّرًا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا رُپے ۶ معلوم ہوتی ہر پھر وہ خشک ہو جاتی ہر، تو اس کو زرد

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی) دیکھنا ہر، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہر

بہتوں کے لیے زندگی کا مقصود یا تو لہو و لعب ہے یا زینت و تفاخر، یا تکاثر اموال و اولاد، فلسفیانہ و اصطلاحی زبان میں اس کی تحلیل کرو تو معلوم ہوگا کہ اہل دنیا برترین اقدار یا تولذت کو قرار دیتے ہیں یا دولت کو یا شہرت کو، اور دولت و شہرت سے بھی ایک قسم کی لذت و راحت ہی مطلوب ہوتی ہے، اور ان کے نزدیک کامیاب زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جان امتداد کی تحقیق میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہیں ذرا سنجیدگی سے یہاں زندگی کے ان اقدار یا غایات کا امتحان کرنا ہے یہ

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ گنی

کیا لذت مقصود زندگی ہو سکتی ہے؟ کیا ہم لذت اندوزی اور دل خوشی کے لیے پیدا ہوئے ہیں؟ کچھ مفکرین کا یہ خیال ضرور رہا ہر، مشرور دوس کا خیال تھا کہ ہر اچھی چیز کا تعلق شکم سے ہوتا ہے اور فراموشی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا محور و مرکز آلہ تناسل ہے، سائبرینی مذہب کا بانی اس بتوس لذت ہی کو مقصود حیات قرار دیتا ہے۔ اپنے پیروں کو اس

لہ اور انسان کی حالت کئی سے بہتر نہیں جو ہمیشہ علو سے ہی کی کیفیت ہوتی ہر۔

ہر جا کہ مگس پر ہر بلا ہر پست جڑ شیفہ و رہوہ علوانیست سوال استرا دی

اس کی تلقین تھی ۛ

ہجومت اعتقاد باید کردن
مخوردن اندوہ جہاں ناخوردن

اپیکورس خوش باشوں کا بادشاہ اپنی اخلاقیات کا اولین محرک جلب لذت اور
دفع الم قرار دیتا ہے، لیکن اتنی بات مسلم ہے کہ لذت کو خیر برقرار دینے سے اپیکورس کی مراد
کسی عیاش کی لذتوں سے تھی نہ شہوانی تعیشات سے بلکہ بدن کا درد و الم سے اور روح
کا پریشانی و غم سے نجات دلانا اس کے پیش نظر تھا، فرصت کی زندگی ہو، آلام و افکار سے
نجات ہو، دوستی و محبت کا لطف ہو، فلسفے کا مطالعہ ہو، یہ تھے لذت کے تصنیفات

اپیکورس کے خیال میں، خیام کی زبان میں ان کو اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے ۛ

تنگے محل خواہم و دیوانے سدرے باید و نصف تانے

وانگہ من و تو نشستہ بہ ویرانے خوشتر بود از مملکت سلطانی

خود خیام نے جہاں بی وفا کا حاصل لذت کے سوا کچھ نہ پایا، صاحب نظر جب عالم پر خود

کرتا ہے، ہر شے کا جائزہ لیتا ہے، تو اس کو خیام کی رائے میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ۛ

در عالم خاک از کراں تا بکراں چندانکہ نظر کنند صاحب نظران

حاصل ز جہاں بی وفا چیزے نیست آئے محل و عارضین خوش پسراں

ایک روز مرزا ضرور ہے بے مونس و بے حریف و بے ہدم و جنت قبر کے گوشے میں سونا

ضرور ہے، اور یہ بھی صحیح ہے گو ایک راز نہفتہ کہ ۛ

ہر لالہ پڑ مردہ خواہد بشگفت!

تو پھر جلب لذت و دفع الم کے سوا زندگی کا مقصود ہو کیا سکتا ہے؟ لذتیت کے اسی

بنیادی اصول کو خیام قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے ۛ

کم خور غم روزگار نا ساز شدہ
مے خور زلفت ساقی د ساز شدہ

کان کز کس مادر آمد امروز برون
فردا بینی بکون زن باز شدہ

کسی راستہ چلنے والے عامی کو روک کر پوچھو کہ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ انسان کوئی استعمال کرے اس کا مدلول و مفہوم ہوگا وہی جو جلب لذت و دفع الم سے تم سمجھتے ہو! وہ درد و غم سے نجات چاہتا ہے، اور لذت و خوشی کا طلبگار ہے، اشیاء کا اچھا یا بُرا ہونا اس کے نزدیک لذت بخش یا الم رسان ہونا ہے، وہ الم رساں و تکلیف دہ شے کو بُری سمجھتا ہے، اور لذت بخش اور فائدہ رساں چیز کو اچھی! اس کی خواہش کا انتہائی مطلوب کسی نہ کسی صورت میں لذت ہی ہوتی ہے! یہ ہے "نفسیاتی لذتیت" کے حامیوں کی تحقیق اور ادعا، اس نفسیاتی تحقیق سے قطع نظر کہ انسان ہمیشہ لذت ہی ڈھونڈتا ہے، لذت ہی پر جان دیتا ہے، لذت ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، یہ دعویٰ کہ انسان کو لذت ہی ڈھونڈنی چاہیے لذت ہی کو اپنا مقصود و حیات قرار دینا چاہیے، "اخلاقیاتی لذتیت" کے قائل پیش کرتے ہیں۔

ذرا غور تو کرو کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے، لذت ہی کی تلاش میں اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں؟ یا اس کو صرف لذت ہی کی تلاش کرنی چاہیے؟ لذت ہی کو اپنی غایتِ قصویٰ قرار دینی چاہیے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ

جہاں اپنے شادی و دل خوشی ہاں
نہ از ہر بیداد و محنت کشی است؟
یا سچی بات دراصل یہ ہے کہ

نہ ایم آمدہ از پے دل خوشی مگر ز پے رخ و محنت کشی؟

متفکرا ولا تکونظامن لستنجلین!

لذتیت کی نفسیاتی شکل کا بطلان تو تم پر تھوڑے سے نفسیاتی غور و فکر سے خود ظاہر ہو جائیگا دیکھو بات یہ ہے کہ ہماری خواہشات کا مبدأ دراصل ہماری احتیاجات ہیں، اشتہات ہیں، ہماری خالص انسانی اغراض ہیں جب ان احتیاجات وغیرہ کی تشفی ہوتی ہے، تو لذت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، لہذا کم از کم بعض مثالوں میں تم کو یہ ماننا ہی پڑیگا کہ ہماری خواہشات کا مطلوب اصل میں وہ اشیاء ہیں جن سے ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے، نہ کہ محض لذت، دیکھو، میں پہلے

بھوک لگتی ہے، اور پھر کھانے کی لذت حاصل ہوتی ہے، یعنی باقل احتیاج، پھر اس کی تشفی اور نتیجہ کے طور پر لذت، یہی بات تمام لذتوں کے متعلق صحیح ہے، لذت ہماری احتیاجات کی تشفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور احتیاجات کا وجود تشفی سے مقدم ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جب اس طرح ہم لذت کی چاشنی سے واقف ہو جاتے ہیں تو بعض دفعہ لذت کی لذت ہی کی خاطر خواہش کرنے لگتے ہیں، مثلاً بھوک کی تشفی سے جلدت حاصل ہوتی ہے، اس کو جان لینے کے بعد ممکن ہے کہ بغیر بھوک کے لذت ہی کی خاطر بنگلے لگیں، اور اس طرح دانوں کے اپنی قبیلے ہی پیٹ کے اندر رکھ دے لگیں، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں ہماری خواہشات کا مطلوب لذت نہیں ہوتا، احتیاج کی تشفی، درد کی دوا، اشتہا کی تسکین ہر فرد چاہتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کو لذت و فرحت محسوس ہوتی ہے، تو لذت بریلے کے الفاظ میں نام ہے تحقق ذات یا تکمیل نفس کے احساس کا، کیونکہ فطری احتیاجات و اشتہات کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے، ان احتیاجات میں بدن و ذہن باوجود دونوں کی ضروریات شامل ہیں۔ انہی ضروریات کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے، لہذا خواہش براہ راست لذت سے متعلق نہیں ہوتی لذت براہ راست معروض خواہش نہیں اور نہ بذات خود ہمارے لیے قیمت رکھتی ہے ان اس کو مقیاس قیمت قرار دیا جاسکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ تھرمامیٹر کا درجہ حرارت خود حرارت نہیں ہوتا، بلکہ مقیاس انحرارت ہوتا ہے، لذت ہر جسمانی و روحانی اقتصان کی تکمیل کے بعد لاحقہ کے طور پر نمودار ہوتی ہے لیکن خود کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، اس لیے لذت یہ کہنا کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے، نفسیات کی رو سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر ہماری یہ سیدی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے، تو خود تجربہ کر کے دیکھو، لذت کو مقصود بالذات قرار دو، اور اس کے حصول کی کوشش کرو بہت جلد تم کو معلوم ہونے لگے گا کہ اس طرح لذت کا پانا اپنے سایہ کے پکڑنے سے زیادہ دشوار ہے، یہ عجیب بات ہے، اور تجربہ کار لذت پرست کو شاید اس کا اقرار ہے، فلاسفہ اس کو "استیجاد لذتیت" کے نام سے موسوم

کرتے ہیں، کہ لذت کی جتنی تلاش کرو اتنی ہی وہ نیک نکلتی ہے، جتنی زیادہ اس کی خواہش کرو اتنی ہی وہ کم ملتی ہے، اور جس قدر بے پروا اس کی طرف سے ہو جاؤ، اسی قدر وہ بے پیچھے دوڑتی ہے، پروفیسر ڈیوسے کے یہ الفاظ حکیمانہ صداقت کے حامل ہیں:-

جب جذبہ بکار بھان باطن کی طرف ہوتا ہے، تو وہ اپنی فنا کا آپ باعث ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے کے طور پر انسان یا تو کلہبیت اختیار کر لیتا ہے اور سرد و دوقی میں مبتلا ہو جاتا ہے یا پھر ہر لحظہ نئی چیز کی تلاش میں رہتا ہے، جدید ترین احساس کا خواہشمند ہوتا ہے، جو اس کی نسبت اور درمائدہ جذباتی فطرت کو اکسائے، اور اس میں نئے نئے سہ سے جان ڈالنے لگا کر کوئی مختصر محض حتی زندگی بسر کر کے اپنے وجود کے قوانین کو توڑتا ہے، اور ان باشیار سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے جن کے ساتھ یہ احساسات طبعاً پائے جاتے ہیں تو اس کی قوت احساس رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے مقصد کی شکست کا آپ باعث ہوتا ہے، وہ جذباتی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسی صداقت کا علم ہونے کے بعد سیرینیا اور اتبارع اسپیکورس نے یہ مان لیا کہ ایجابی لذت کا حصول انسان کے لیے ناممکن ہے، ان کی لذتیت میں قنوطیت کی جھلک پیدا ہو گئی اب وہ بجائے حصول لذت کے دفع الم کو مقصد حیات قرار دینے لگے، اسپیکورس کا یہ قول مشہور ہے جو پیرس زندگی کو مسرور بناتی ہیں، وہ نہ پیہم شرب مدام ہو اور نہ صنعت نازک کی صحبت اور نہ مرغ واپہی اور قہمتی ماکولات سے آراستہ کیے ہوئے دسترخوان بلکہ سنجیدہ و متین غور و فکر جو ہر عمل انتخاب و اجتناب کے اسباب و وجوہ کا امتحان کرتا ہے، اور ان بہبودہ خیالات و اوام کو دور کرتا ہے، جو روح کی پریشانی اور اختلال کا باعث ہوتے ہیں۔

ہے:-

۲۹۹ ص ۲۹۹ لے دیکھو بیک دل کی کتاب The Source Book of Ancient
Philosophy ص ۲۰۰ مقابلہ کرو راقم کی کتاب فلسفہ یاس ص ۸۹۔

اصلاح مزاج از ضروریات است یک تنقیہ داغ می باید کرد! (واقف)

اسی تی بوس کا مشہور پیروہنگے سی لیس (Hedonism) لذت کو مقصود حیات قرار دیتا ہے، اور اس کی طلب میں کوشاں ہوتا ہے، بہت جلد تجربہ اس کو سکھاتا ہے کہ بارغ جہاں میں غم ہی کا تو میوہ ہر شخص کو نصیب ہوتا ہے، اور اگر کوئی بے غم ہے تو وہ بنی آدم نہیں، طرفہ جانور ہے!

عالم ہمہ دردست دعا میخوابد از خوان کرم برگ و نوا میخوابد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویش غذا، شہا شہتا میخوابد

جب لذت مقصود حیات اور وہ ناقابل حصول تو پھر زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، دنیا استخوان بے مغز ہے، عاقل اس استخوان کو کتوں کے آگے پھینک دیتا ہے، موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے، موت ہی میں راحت جان پاتا ہے، موت ہی سے سائے درد و الم رفع ہو جاتے ہیں، اور غم و ہم دور! ایجابی لذت ناقابل حصول، لیکن سلبی لذت ممکن اور وہ موت کے ذریعہ، لہذا

با چرخ ستیزہ کار مستیز و برو با گردش دہر در میا میتر و برو
یک کاسہ زہر است کہ مرگش خواند خوش در کیش و جرعہ در جہاں نموبرو

یہ تھا استدلال گے سی لیس کا، اور اس قوت و اثر کے ساتھ یہ پیش کیا گیا، کہ لوگوں نے خود کشی شروع کر دی اور اس کو "داعی الی الموت" کا خطاب دیا، جو لوگ زندگی کا مقصد و حید لذت اندوزی اور ذواقیت کو قرار دیتے ہیں، انہیں اسی طرح استدلال کرنا پڑے گا۔
لذتیت سے قنوطیت ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے، جب لذت پرستوں کا تجربہ یہ ہو

تو بتاؤ کہ ۴

باقیہ مستورہ لذت پہ کند کس!

اخلاقیاتی لذتیت کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ لذت ہی کو زندگی کی غایت تصور

قرار دینا چاہیے، دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ نہیں لذت زندگی کی غایت نہیں، عقلمند لذت کی ماہیت و مقام سے واقف ہوتا ہے، طبیبات حیات کو طہارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا لیکن وہ زندگی کا مقصود لذت اندوزی نہیں قرار دیتا، مجرد لذت کا کبھی تعاقب نہیں کرتا اس کو موجِ سراب اور جوشِ جناب سمجھتا ہے، اور اس کے دھوکے میں نہیں آتا۔ ۶

إِنَّ اللَّيْبِ بِمَثَلِهَا لَا يَخْدَعُ ۶

وہ اپنے مقصود کے حصول میں سرگرم عمل ہوتا ہے اور مسرت خود سایہ کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے، مقصود کے حصول میں اس کا ہر عمل لطف انگیز، ہر حرکت فرحت بخش ہوتی ہی جانتی ہو کہ یہ مقصود کیا ہے؟ رضائے حق! حق تعالیٰ ہی سے اس کو آرامِ جاں اور بردِ قلبی نصیب ہوتی ہے اور عارفِ روم کے ساتھ مل کر وہ لذت سے کہتا ہے ۷

گر گریزی بہ امیدِ راستے ہم از آنجا پیشت آید آفتے

ہم کھنچے بے درد بے دام نیت جز بخلوت گاہِ حق آرام نیت

جب لذت مقصود زندگی نہیں تو کیا شہرت یا اشتہارِ خلق، جاہ و مرتبت نام و نمود وہ اعلیٰ اقتدار میں جن کا حصول زندگی کی غایت قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہم میں سے بہت سارے ایسے ہیں جنہیں زبان کی لذت سے کان کی لذت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے، وہ اس لطیف لذت کے لیے اپنی تمام کثیف لذتوں کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، مصائب میں گرفتار ہونے سے نہیں گھبراتے، درد و غم برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، آفتوں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شہرت کی قیمت بلا و مصیبت ہے تو بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوتی، ان کے لیے شہرت غایت الغایات ہے، خیر برتر ہے، مطلق قیمت سے، اضافی قیمت نہیں!

شہرت کی خواہش ہر انسان میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے، اس کا راز یہ ہے کہ انسان کا نفس تقیص کو فطرتاً ناپسند کرتا ہے، اور علو و بلندی کو طبعاً پسند! بندہ ہونا اس کے

نفس پر شاق ہوتا ہے، ربوبیت طبعاً محبوب ہے، ہر شخص کے باطن میں وہ جذبہ موجود ہے جس کی تصریح فرعون نے اپنے اس قول سے کی تھی "انار کما الاغلی" اس کی رفعت کا جب لوگ اقرار کرتے ہیں، تو وہ خوش ہوتا ہے، بقول عارفِ روم، فریب ہوتا ہے:-

جانور فریب شود از راہِ نوش آدمی فریب شود از راہِ گوش

شہرت کا طالب دراصل لذت ہی کا پجاری ہے، اس کا معبود بھی ایک قسم کی لذت ہی ہے، وہ اپنے نفس کی کبریاہی کا اعلان چاہتا ہے، تشہیر چاہتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت کو ادا کرنے پر تیار ہوتا ہے۔

اب غور کرو وہ اپنی مسرت، اپنی بردِ قلبی کی عمارت کس بنیاد پر قائم کر رہا ہے، ہوا پر تعریف جو خلق کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ آخر ہوا ہی تو ہے، جس کا حقیقت سا جھونکا بھی ہمارے پیار شہرت کے دل کے غنچہ کو شگفتہ کر دیتا ہے، مگر کیا کوئی عقلمند اپنی مسرت کے قلعہ کو اس قدر کمزور بنیادوں پر قائم کریگا؟ کیا ہوا پر اس کا اقتدار ہے؟ کون جانتا ہے کہ آج ہوا کا رخ کس طرف ہوگا؟ عوام کا لانگام آج اپنے ہیرو کو اور ج آسمان پر جگہ دیتے ہیں اور کل بغیر کسی وجہ کے خاکِ مذلت پر ٹپک دیتے ہیں، آج تخمین و تصفیق ہوا اور کل زبرد توفیق، اور کچھ دن بعد مطلق ذہول اور فراموشی، یہ المناک تجربہ تقریباً ان تمام پرستارانِ شہرت کا نہیں عوام نے کچھ دن کے لیے بت بنا کر پوچھا تھا، ولنکٹن واٹر لو کا فلاح اعظم نیولین کو کھت دیتا ہے، اپنے زمانہ کی تہذیب و تمدن کو غارت و برباد ہونے سے بچا لیتا ہے، عوام اس کو سڑانکھوں پر بٹھاتے ہیں، بطل اعظم کا خطاب دیتے ہیں، اور کچھ ہی دن بعد لندن کی گلیوں میں یہی مشتعل و غضب آلود مجمع پھروں سے اس کے خود کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، بس کو ولنکٹن اپنی موت کے دن تک محفوظ رکھتا ہے۔ جو لیس سیز ایک دن دنیا پر حکومت کرتا ہے اور دوسرے دن احسان فراموش دوستوں کے ہاتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ سکندر اعظم کی لاش تیس دن تک بے گور و کفن پڑی رہتی ہے، اس کو عزت کے ساتھ خاک کے سپرد کرنے کو

بھی کوئی نہیں ملتا، یہ ہے انجام ہر شہرت و رفعت کا!

گرم پیرا کہ رستم و شام شدی یا خروئے نیمروز یا شام شدی

نہ زور بگورنی توں برد نہ زر افسوس کہ کیمیا کے اوہام شدی

شہرت کا اثر سیرت پر کیا ہوتا ہے؟ شہرت سے عجب و پندار پیدا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے

کہ انسان اپنی ہی ذات کو کبیر اور سائے عالم کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتا ہے! مقید ہو کر مطلق ہونے

کا دعویٰ کرتا ہے، بندہ ہو کر خدا بنتا ہے، جب اس کو خدا سے ڈرایا جاتا ہے تو اپنے تکبر اور عزت

کے گھمنڈ میں حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے۔ **وَإِذَا قِيلَ لَهُمَاتَّقِ اللَّهَ أَحَدًا تَهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ**

(پ ۹۶۲) جس شخص کا دماغ اس قدر الٹ جکے اس کو مسرت و طمانیت قلبی کہاں نصیب

ہو سکتی ہے؟ اس کو ہر قدم پر خلاف طبیعت عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کوئی اس پر طعن کرتا،

اور کوئی حسد، کوئی اس کو قطرہ آب گندہ کہتا ہے، اور کوئی طرفہ جانور اس کا ہر عیب دنیا کے

سامنے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کی کوئی غلطی لوگوں کی نگاہوں سے چھین سکتی

شہرت کی وجہ سے گویا وہ آفتاب کے نیچے گھڑا ہوتا ہے اور اس کا ہر نقص اب نمایاں ہے، اور

بقول عارف روم اس کی حالت یہ ہوتی ہے۔

خستہ ما و چشمہ او اشکھا! برسرت بریزد چو آب از مشکھا!

ایک آرزوئے شہرت، تمنائے رفعت، خواہشِ علو اس کو ہزاروں غموں اور آفتوں میں مبتلا

کرتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حق سے کٹ کر خلق سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، اور

خلق سے سوائے غم و اندوہ کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے، وہ خلق کے قلوب کو ہمیشہ مسخروں کا

چاہتا ہے، اور اعتماد کرتا ہے، سمندر کی موجوں پر گھر بنا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس

پائدار اور مستقل ہے، فی الواقع! خلق کے وہ رستے وہ خوش ہوتا ہے، لیکن اس کی خوشی

کی مدت ایک رات سے زیادہ نہیں۔

وعدہ ارباب دنیا پھو خوابِ احتلام شب ہر شب عیش و عشرت باشد فرادغ

یہ حق پر ترس آتا ہے، مگر اس کے مقصود حیات کو کوئی عاقل اپنی زندگی کا مقصود بنانا پسند نہیں کرتا۔

نہیں، ہم محض حصولِ جاہ کو زندگی کی غایت نہیں قرار دے سکتے، اس میں گو کسی قدر لذت ضرور ہے، لیکن یہ غیر مخلوط لذت نہیں، درد و آفت، رنج و مصیبت کا عنصر اس مرکب میں بہت زیادہ ہے، یہ انسان میں کبر و غرور پیدا کرتا ہے، اور متکبر نہ دنیا میں راحت و طمانیت پاسکتا ہے، اور نہ آخرت میں فوز و کامیابی، وہ دل کا اندھا ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی نشانیوں کی پہچان سے محروم رہتا ہے، حق بات اس کو نظر نہیں آتی، حق کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جب دید حق نہ رہے تو پھر اس میں پوست کے سوارہ کیا جاتا ہے؟

آدمی دیدت و باقی پوست مست دید آن باشد کہ دید دست است (ردی)
 سا صرف عن ایاتی الدین میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانوں سے برگشتہ ہی
 یتکبرون فی الامراض بغير رکھونگا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کا ان کو کوئی
 الحق (پ ۶۶۹) حق حاصل نہیں۔

اسی کی طرف اشارہ ہے، اور اسی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کا مبعوض ہو جاتا ہے۔ اِنَّهُ لَا يُحِبُّ
 للستکبرین! جب دید حق کھو چکا، حق تعالیٰ کا مبعوض قرار پا چکا، تو پھر اس کے ہلاک ہونے
 میں باقی کیا رہا، امانیت، اپنی ذات سے محبت اپنے ہی ذکر کے انتشار کی خواہش، اپنی ہی
 تعریف کی محبت اور اس سے پیدا ہونے والی لذت، یہی تو ہیں اجزاء اس کی ہلاکت اور
 بربادی کے! اسی لیے نفس انسانی کے امراض سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے حکیم
 نے فرمایا تھا کہ

انما هلاك الناس باسباع ہوئی دھوس کی پیروی اور اپنی تعریف و توصیف
 الهوى و حب الثناء کی محبت لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

ایک اور طریقے سے اسی صداقت کا اظہار شدت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

ذئبان ضاربان ارسلانی ذریۃ
وہ بھیڑیے حملہ کرنے والے جو بھیڑوں کے گلے
غنم لیسابا اکثر فساد امن حب
میں چھوڑ دیے جائیں اتنا نقصان نہیں کھنکے
الشرف والمال فی دین الرجل
جتنا کہ شرف اور مال کی محبت مسلمان آدمی کے
(المسلم) دین میں کرتی ہے۔

اسی حب الشرف سے ارادہ و رغبت یا ارادہ و غلو پیدا ہوتا ہے، اور جب تک انسان اس سے غالی نہیں ہوتا، اپنی آخرت درست نہیں کر سکتا۔

• تِلْكَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ جَعَلَهَا لِلَّذِينَ
یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لیے خاص کرتے
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا
ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا
فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (پیشہ ۱۲) اور نیک نوجو متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اس آیت کو مرنے وقت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے جان دی!

خوب سمجھ لو کہ ہم حصول کمال سے نہیں منع کر رہے ہیں، ہم علم میں منفرد یا کمال ہونے کی آرزو کو جائز سمجھتے ہیں، ہم کمال حریت یعنی شہوات و جذبات سے آزادی، دنیوی ترددات سے نجات کو حقیقی کمال قرار دیتے ہیں، ہم حق تعالیٰ اور ان کے صفات و افعال، مالکیت و حاکمیت کے علم کو سب سے زیادہ اعلیٰ و حقیقی کمال سمجھتے ہیں، اور ہمارے عقیدے کی رو سے یہ علم یہ معرفت عارفین کے لیے مرنے کے بعد نور بنیگی۔

نُورُهُمْ دُیُّسَعْنٰی بَیِّنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِأَمْرٍ اَحْمَدٍ
ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوٹا
یَقُولُوْنَ رَبَّنَا اٰمِنَّا لَنَا نُورًا
ہوگا، ایوں دعا کرتے ہوئے کہ اے ہمارے پروردگار

ہمارے لیے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھ۔ (پ ۲۸ ع ۲۰)

۱۰ دیکھو مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد سوم ص ۲۷۹۔

اور جو اس نور معرفت سے بے بہرہ ہونگے ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا، جو اندھیریوں میں پڑا ہے۔
 کمین مثله فی الظلمات لیس اس شخص کی طرح جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں
 بخارج منها دے ۱۶ میں ہے، ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا۔

ہم اس جذبہ کی خدمت کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے کمال کے پیدا ہونے کے بعد ایک شخص اپنی
 ذات کو کبیر اور سارے جہان کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے، یا پھر کمال اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے
 کہ لوگوں کے دلوں اور جسموں پر حکومت کرے، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت و خوشی
 کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے، اس خصوص میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا کی
 صورت میں سیدھے راستے کی تعلیم فرمادی تھی۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي صَبُورًا وَشُكْرًا وَ
 اجْعَلْنِي فِي عَيْبِي صَغِيرًا وَفِي آيِنِ
 النَّاسِ كَبِيرًا

حق تعالیٰ مجھے صابرہ شاکر بنا، مجھے اپنی آنکھوں میں
 صغیر رکھ اور لوگوں کی آنکھوں میں کبیر بنا۔

جب میں خود اپنی آنکھوں میں حقیر رہوں، اپنی بندگی و بیچارگی کو بھول نہ جاؤں، اپنی ظلمت و
 جہل سے باخبر رہوں، تو پھر مجھ میں نہ اپنی تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نہ کبر کا مذموم
 جذبہ، اب حق تعالیٰ اپنے اس متواضع بندہ کو رفعت عطا فرماتے ہیں، اور حقیقی کمال سے حصہ
 وافر یہ بزرگی اور کمال کا عطیہ ہے اور اس کا استعمال معطی کے احکام کے مطابق ہی کیا
 جاسکتا ہے۔

مقصود حیات اگر شہرت یا اشتهارِ خلق نہیں تو کیا مال و دولت کو زندگی کی انتہائی غایت
 قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس امر میں شاید کسی کو ہم سے اختلاف نہیں ہوگا کمال ہمیشہ ایک ذریعہ ہے کسی غایت کے
 حصول کا، خود غایت نہیں، ہم نے ان ظلمات میں سے بعض پرادپرکھٹ کی ہے، اور ان کو

یہ دعا حضرت بریدہؓ کی روایت سے مسند بزار میں ملتی ہے۔

زندگی کا مقصود نہیں قرار دیا، یعنی اگر مال سے جاہ طلبی یا لذت اندوزی مقصود ہو تو پھر مقصود کے باطل سے ذریعہ کا باطل ہونا بھی لازم آئے گا، اور اگر جائز مقصدِ حیات کے حصول میں یہ استعمال ہو تو پھر یہ ایک زبردست قوت ہے اور عظیم الشان نعمت ہے۔

ال راگر ہر میں باشی جمول نعم مال صراح گفتش رسولؐ

اب ہمیں زندگی کے حقیقی مقصد کے تعین کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کی ہدایت کی روشنی میں مقصودِ حیات کا تعین ضروری ہے، حق تعالیٰ کی معرفت اور ان کی عبادت جہل کی تخلیق کی غایت ہے صریح ارشاد ہے، مَا خَلَقْتُ الْبَشَرَ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِي

عبادت بغیر عرفانِ حق کے ممکن نہیں، لہذا وحدت ذاتیہ حق کی معرفت اور اس کی عبادت کے سوا جہان کا کوئی مقصود نہیں، نہ نبی اور ہر رسول کے پیغام کا خلاصہ بس یہی تھا۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ
إِلٰهِ غَيْرُهُ (پارہ ۵۴) تمہارا کوئی معبود ورب نہیں۔

جاتی نے اس مقصود کو ان دل پذیر اشعار میں ادا کیا ہے :

از زندگیم بندگی تست ہوس بر زندہ دلاں بے تو حرام ست نفس

خواہد ز تو مقصود دل خود ہر کس جاتی ز تو ہمیں ترا میخواستد بس

زندگی کا مقصود، برترین مقصود، غایت الغایات حق تعالیٰ ہیں، ان کی یافتہ ہے، ان

کی عبادت و بندگی ہے، ان کا عشق و محبت ہے، یا یوں کہو کہ ہماری ساری عبادت، ہمارا جینا اور ہمارا مزاج مناسب خالص حق تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ

وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ

لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ

(پارہ ۵۴) (ترجمہ مولانا الطوفان علی عثمانی) اور میں سب ماننے والوں سے پہلے ہوں۔

لہ حضرت ابن عباس نے لیبجدون کی تفسیر لیبعدون سے کی ہے۔ ۱۲

حق تعالیٰ ہمارے مقصود ہیں، اسی لیے ہمارے محبوب و مطلوب بھی۔
 وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ اور جو مومن ہیں ان کے ساتھ نہایت قوی محبت

۱۴۶۲ رپ ۷

وہ ہماری جان و مال، فرزندوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ درہموائے تو زیم خاک کے شوم و بزیر پائے تو زیم
 مقصود میں خستہ زکونین توی از بہر تو میرم دبرائے تو زیم
 جب زندگی کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، تو اب دیکھو کہ وہ ہماری اس زمینی زندگی کو کس طرح
 سر کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ پہلے اجمال، پھر تفصیل۔

اجلائیوں سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے معبود ہیں اور محبوب ہیں تو ہمارا کام ایسا ہونا
 چاہیے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت میں شامل ہو جائے، یعنی ان ہی کے امتثال امر میں ہو،
 ان ہی کی رضا مندی و خوشنوی کے خاطر ہو، نفس و ہوا کی پیروی میں نہ ہو، یعنی لذت اندوزی
 کے لیے نہ ہو، عیش پرستی کے لیے نہ ہو، جاہ طلبی کے لیے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت
 اللہ کی ہو، غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے فعل کا تعین امر حق سے ہو، نفس و شیطان کے حکم سے نہ
 ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کی زندگی ہے، اور یہی کامیاب زندگی ہی اقبال
 کے ہم دیدی الفاظ کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے، یہ اپنے الفاظ میں تقویٰ کی زندگی اور کامیاب
 زندگی کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

دل ز غیر اللہ بہ پردانے جوان	وائے ہائے دوائے این دیر کہن
تا کجا بے غیرت دین زیستن	تسخ لا در کف نہ تو داری و نہ من
مرد حق باز آفریند خویش را	این جهان کہنہ در بازے جوان
بر عینار مصطفیٰ خود را زند	لے مسلمان مردن بست این زیستن
	جز بہ لور حق نہ بیند خویش را
	تا چہلے دیگرے پیدا کند

اب ذرا تفصیل میں جا کر تقویٰ کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ لو قرآن میں متقیوں کی تعریف
اجالائیوں کی گئی ہے۔

وَالَّذِي جَاءَ بِالصَّدَقِ وَصَدَقَ بِهِ
أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (پاک ۱۷)

جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن و متقی، تقویٰ نبی کو سچ ماننا اور اس کی
تصدیق کرنی ہے، حق تعالیٰ انبیاء ہی کے ذریعہ علم صحیح عطا فرماتے ہیں، انبیاء اللہ ہی کے علم کو
پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی نہ زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی، جو لوگ اس
پرایمان لاتے ہیں، اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، وہی متقی کہلاتے ہیں۔

تقویٰ کی کچھ تفصیلات کو اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ
لِلْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ
وَالنَّبِيِّنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى
حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى
الزَّكَاةَ وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ
إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي
الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ
الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ
صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُونَ۔ (پاک ۱۷)

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو
کر لو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر
رکھے اور قیامت کے دن پورا فرشتوں پر اور کتب پر
اور پیغمبروں پر اور مال دینا ہوا اللہ کا محبت میں رشتہ دار
کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور
سوالی کرنے والوں کو اور گردن پھرنے والے اور نماز
کی پابندی رکھتا ہو، اور زکوٰۃ بھی ادا کرنا ہو، اور
جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب
عہد کریں، اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں
تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں
جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

اس آیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ تقویٰ کا انحصار چند عقائد، اعمال اور اخلاق پر ہے، عقائد میں اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتب منزلہ پر، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانا داخل ہے، یہ تقویٰ کے اساس میں، عمل کا صدور ایقان و ایمان سے ہوتا ہے، متقی کے ایقانات جن کا نتیجہ اعمال صالح ہیں، یہ ہونے چاہئیں جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے بعد ان اعمال کی بھی کسی قدر تفصیل پیش کر دی گئی ہے۔ ان کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ انفاق، اقامتِ صلوٰۃ و ایاتے زکوٰۃ، انفاق رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں سوال کرنے والوں کے لیے ہو، اور قیدیوں کے چھڑانے میں کیا جائے، انفاق کی شرط مقدم حق تعالیٰ کی محبت ہے، یعنی جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ان ہی کی محبت میں خرچ کیا جا رہا ہے، ان ہی کی خوشنودی و رضا کی خاطر، اس لیے نہیں کہ نام ہو، شہرت ہو، لوگوں کی نیگاہوں میں برتری حاصل ہو، اخلاق میں ایفائے عہد اور صبر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے، صبر تنگدستی میں، بیماری میں اور کفار کے ساتھ جنگ میں

تقویٰ کے متعلق دوسری تمام قرآنی تصریحات کو پیش نظر رکھ کر حضرت امام غزالیؒ اس کی جامع و مانع تعریف یوں کرتے ہیں کہ تقویٰ بچنا ہے ہر اس شے سے جس سے دین میں ضررہ خوف ہو، محاورہ عرب سے بھی اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ جو بیمار پرہیز کرتا ہے اس کو عرب "متقی" کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ ہر مضر چیز سے خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی بچتا ہے اسی طرح دین کا تقویٰ تو اسی سے اجتناب ہے حضرت غزالیؒ کی اس تعریف میں امتثالِ مامور یا عبادت پر زور نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ صرف اجتنابِ مخطور یا گناہوں سے پرہیزی کی تاکید کی جا رہی ہے۔ منہاج العابدین میں وہ کسی جگہ فرماتے ہیں، کہ عبادت کے دو بڑے حصے ہیں، ایک عبادت کرنا، دوسرا پرہیز کرنا، اور یہ آدھا حصہ یعنی گناہوں اور سہات سے پرہیز انسان کے لیے پہلے آدھا حصہ یعنی عبادت سے زیادہ بہتر ہے، بتدی عبادت کے حصہ پر زیادہ زور

۱۔ دیکھو منہاج العابدین ص ۵، (مطبوعہ ڈکنگٹور)

دیتا ہے، اور کامل اپنی بصیرت پر بہرہ کا حصہ اختیار کرتے ہیں، اور ان کو ہر وقت یہ دھیان رہتا ہے کہ دل کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے بچائیں لیکن اگر دونوں حصے حاصل ہو جائیں یعنی عبادت و پرہیز تو کمال حاصل ہوتا ہے، اور سلامتی اور غنیمت میسر ہوتی ہے۔

عبادت کے دونوں حصوں کا خیال رکھ کر تقویٰ کی جامع و مانع تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے، تقویٰ کفر و شرک و نفاق و بدعت سے احتراز ہے، اتنا ہی مامور، اجتنابِ محظور اور رضا بقدر ہے، متقی کا قلب ایمان و توحید و صدق سے آراستہ ہوتا ہے، سنت پر قائم ہوتا ہے، اور امر کا اتباع کرتا ہے، نواہی سے بچتا ہے، اسی برصائے حق رہتا ہے، اسی چیز کو حضرت عوثؓ اعظمؓ شیخ عبد القادر جیلانیؒ اس طرح ادا فرماتے ہیں: لَا يَدْ لِكُ مَوْ مَن فِى سَائِرِ اَحْوَالِ مَن ثَلَاثًا شِئَاءً - اَمْرٌ يَمْتَثَلُهُ وَ نَهْيٌ يَجْتَنِبُهُ وَ قَدْرٌ يَرْضَى بِهِ - یعنی ہر مومن کے لیے تمام احوال میں تین چیزیں ضروری ہیں، امر الہی بجالائے، نہی سے اجتناب کرے، اور تقدیر پر راضی رہے۔ اتنی بات یہاں سمجھ لینی ضروری ہے کہ امر الہی دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تشریحی یہاں وظیفہ عبودیت پر ہے کہ اس امر کو بجالا، اور امر منفی کی صورت میں ممنوعات سے بچے، دوسرا تکوینی، یہاں بندگی کا وظیفہ ہے کہ اس کو تسلیم کرے، رضا بالقضائے اشارہ اسی طرف ہے۔ بالفاظ دیگر جو حق تعالیٰ کہیں وہ کہے اور جس طرح وہ رکھیں اس طرح رہے اول عبارت ہے، اور ثانی عبودیت "ایسی ہی دندگی تقویٰ

لے دیکھو سراج السالکین ترجمہ مہناج العابدین مشاد ص ۱۱۱

۱۱۱ استراذ کا ذریعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، ذات اللہ ہی کو الہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان، ان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار سے شرک کا خروج ہو جاتا ہے اور توحید داخل ہو جاتی ہے جس ذات پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسالت کے اقرار سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے رازداد ہے۔ بدعت دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا یا جو دین کی بات نہیں، اس کو دین سمجھنا ہے۔ مجملہ شرک کے جانے سے توحید، کفر کے جانے سے ایمان، نفاق کے جانے سے صدق، بدعت کے چھوڑنے سے سنت، حاصل ہوتی ہے دیکھو باب اول عبادت و استعانت ص ۱۱۱

کی زندگی ہے، اور ہر معنی میں کامیاب زندگی!

اب دیکھو، زندگی میں کامیابی و سرخ روئی کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے، جو متقی کی سیرت کا جزو ہیں، وہ حق تعالیٰ پر شدت سے ایمان رکھنا ہے، ان سے شدت سے محبت کرنا ہے، ان کو وہ خیر مطلق اور قدوس مانتا ہے، زندگی اور کائنات کا مبدؤ وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے اور لازماً زندگی کو بھی خیر سمجھتا ہے، جب اس کے اعتقاد اور اذعان کی رو سے زندگی اچھی اور زندگی کے تجربات اچھے ہیں تو پھر وہ ان سے زندہ دلی اور جوش کے ساتھ تعاون عمل کرتا ہے، تقویٰ و یاس کا اثر اس کے قلب پر مطلق نہیں ہوتا، اس کی زندگی اور خارجی حالات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اس کو شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

عارفِ رومی نے کہا تھا، انما اللہ بغير تبديل المزاج آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ علمی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطہ نظر ہے۔ مومن کا کائنات کے متعلق نقطہ نظر تم نے اوپر دیکھا کہ کیا ہے، اس کے نزدیک کائنات ایک قدوس و قادر و عظیم مطلق ذات کی تجلیات کا منظر ہے، اسی یقین کی وجہ سے وہ زندگی میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے مزاج کی اسی خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے وہ جہان کے ناموافق عناصر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے، چار سوئے کائنات اس کو بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے اس گمان کو صحیح کر دکھانا ہر سہ تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

خالق کائنات و رب کائنات سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے کائنات بھی اس کے ارادے کے مطابق بن جاتی ہے اور انا عند ظن عبدي کی بشارت صحیح ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے، تو حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں۔ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ كَقَوْلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ، صادق مصدوق نے بھی تو اس کی خبر دی تھی۔ ان لله رجالاً

۱۔ میرا اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مزاج ہی بدل جائے۔

۲۔ یہ حق کے چہرے کا مقولہ ہے جو انگلستان کا ایک مشہور ادیب گزرا ہے۔

یرضی برضاکم و یغضب بغضبہم کما انہم یرضوا برضاہم و یغضبوا بغضبہ، بعض رجال فرما
 لیسے بھی ہیں جن کی رضا سے حق تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں، اور جن کے غصہ سے وہ بھی غضب فرماتے
 ہیں جس طرح کہ خود یہ مردان حق اپنے مولیٰ کی رضا سے راضی اور اس کی ناراضی سے خود بھی ناخوش
 ہوتے ہیں، متقی کی اس شان کو دیکھ کر کسی عارف کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

فایض بنشین و عم مخور و شاد بزی این معنی لا الہ الا اللہ است!

مومن متقی کے ضمیر میں وہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک حقیقی معنی
 میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے، ان ہی کا خیال رکھ کر امام غزالی فرماتے ہیں کہ جس نے تقویٰ
 اختیار کیا اس کے سارے ترددات رفع ہو گئے، اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے بات
 اصل معنی سو حاصل ہوگی، اپنی تائید میں وہ قنادہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ توریت میں لکھا
 ہے کہ "لے فرزند آدم تقویٰ اختیار کرو و جدھر چاہے سو رہے" مومن متقی مجاہد ہوتا ہے، سو نہیں
 رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ناکامیابی کا اندیشہ نہیں، بالفاظ عوث اعظم ساکن الجوارح،
 مطہن الجنان، مشروح الصدر، منور الوجه، عامر البطن، غنی عن الاشیاء بخالقہا ہوتا ہے۔ لو اشیاء
 کی ملکیت کی وجہ سے خود کو غنی سمجھتے ہیں، وہ غنی بلٹے ہوتے ہیں، مجاہد متقی اشیاء سے بے نیاز ہوتا ہے
 وہ خود خالق اشیاء کو رکھتا ہے، اس لیے وہ غنی عن اشیاء ہوتا ہے، اس کے دل و افتخار کی نسبت
 حق تعالیٰ سے ہے، وہ حق تعالیٰ کا فقیر ہے، اشیاء سے غنی ہے، اس کے ہاتھ میں لآلہ الا اللہ
 کی شمشیر ہے، اسی لیے وہ فرمانروائے موجودات ہے، اسی فقیری ہی کی وجہ سے اس کو امانت
 ملی، اور اس امانت کی وجہ سے خلافت عطا ہوئی اب وہ خلیفۃ اللہ ہے، اسی لیے
 ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفرین کار کشاد و کار ساز (اقبال)

یہ ساکن الجوارح (بلا حکت اعضاء) اور قلب مطہن اور فراخ و کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد اور تعلق خالق
 کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ (شرح الغیب مقالہ ۷)
 تھ ہر کہ اندر دست اور شمشیر راست، ہر جملہ موجودات را فرماں روا است (اقبال)

تم دنیوی نقطہ نظر سے کامیاب زندگی کس قسم کی زندگی کو قرار دیتے ہو؟ وہی نہ جو آسمان
 وزمین کے برکات سے مالا مال ہو؟ دیکھو اس کا حصول ایمان و تقویٰ پر منحصر ہے۔
 وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَالْقَوَاۗءِ اِذَا رَانَ بَسْتِیۡوۡنَ کَرِهۡنَ وَاٰلَیۡہِٗٔ اٰیۡمَانُ لَآتَیۡہِٗٔ اُوۡر
 لَفَتۡنَا عَلَیۡہِمْ بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ ۙ پرمہر کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتیں
 وَالۡاَرۡضِ (پ ۲۷) کھول دیتے۔

ان برکات کے ساتھ پھر نہ رنج و تعب ہوگا نہ حزن و خوف۔
 فَمِنَ النَّاسِ وَاصۡلِحَ فَلَۡمَخۡوۡفٌ ۙ پس جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے سو
 عَلَیۡہِمْ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (پ ۱۱) ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہی، اور نہ حزن۔
 کامیاب زندگی وہی ہے نا جس میں دشمنوں سے محفوظیت حاصل ہے؛ بشرط تقویٰ اس
 کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔

اِنۡ تَصۡدِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لَا یَضُرَّکُمۡ ۙ یعنی تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں
 کَیۡدُہُمۡ شَیۡئًا (پ ۳۷) کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکیگی۔

حق تعالیٰ کی معیت اور اعانت کی وجہ سے متقی غالب و منصور ہوتا ہے۔
 اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَالَّذِیۡنَ ۙ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی
 ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ (پ ۲۷) ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا جس میں سختیوں سے نجات ہو، رزقِ حلال ہو، دیکھو اسی
 کا تو وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لِّہٖ مَخۡرَجًا وَّیُرۡزُقۡہٗ مِنْ حَیۡثُ لَا
 یَحۡتَسِبُ ۙ متقی کی نجات کی شکل حق تعالیٰ نکال دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے رزق
 دیتے ہیں جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا (پ ۱۷) اس کے ہر کام کو آسان کر دیتے ہیں
 وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لِّہٖ مِنْ اٰمِرٍۭ وَّیَسِّرۡہٗ (پ ۱۷)

اخروی نقطہ نظر سے بھی متقیوں ہی کی زندگی کامیاب ہوتی ہے، کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے

محبوب ہوتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ ان ہی کی عبادت قبول ہوتی ہے۔
 اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ حق تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔
 ان ہی کو حق تعالیٰ کے نزدیک بزرگی حاصل ہے۔:-

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ اللہ کے نزدیک سب میں بڑا شریف وہ ہے جو
 (پہا ۱۲۶) سب سے زیادہ پرہیزگار یا متقی ہو۔

ان ہی کے اعمال قبول ہوتے ہیں، اور گناہ معاف ہوتے ہیں:-
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا
 قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَ
 يُغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (پہا ۱۲۷) تمہارے گناہ معاف کر دیگا۔
 دوزخ کی آگ سے ان ہی کو نجات ملتی ہے۔

وَيُحِبُّ اللّٰهُ الَّذِينَ اتَّقَوْا بِمَقَادِرِهِمْ
 لَا يَمَسُّهُمُ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
 اور جو لوگ متقی ہیں حق تعالیٰ ان کو کامیابی کے
 ساتھ نجات دینگے، ان کو نہ تکلیف پہنچے گی اور نہ
 وہ غمگین ہوں گے۔ (پہا ۱۲۸)

ان ہی کے لیے بالا آخرت ہے اور سامان عیش و عشرت :-

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ فِي جَنَّةٍ وَعْدٍ نَّعِيْمٍ (پہا ۱۲۹) متقی لوگ بلاشبہ باغوں اور سامان عیش میں ہوں گے
 بہر حال مومن متقی کے لیے دونوں جہان کی خوشخبری ہے، دنیا کی خوشخبری، آرام و آسائش
 اور برکتیں، غم و خوف و حزن سے نجات، دشمنوں سے حفاظت اور حق تعالیٰ کی معیت و نصرت
 اور آخرت کی بشارت معاملہ قبر، حساب و کتاب کا آسان ہونا، یعنی صبر و حساب قیامت
 سے رستگاری اور عیش و ناز و لذت و ستار پھر ریح وریحان و جنات نعیم یہ
 اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا يَخَافُونَ عَلَيْهِمْ يَادْرِكُوْكَ اللّٰهُ كَيْفَ يَدْرِكُوْنَ كَوْنِيْ اِنْذِيْتَهُ

لہ راحت اور غذائیں ہیں اور آرام کی جنت (سورہ واقعہ)

وَلَا هُمْ يُخْزَنُونَ، الَّذِينَ آمَنُوا
 وَكَانُوا يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي
 الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا
 تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَلِكَ الْقَوْلُ
 الْعَظِيمُ (پ ۱۶۶)

دیکھو یہی رانسہ ہے، جس کو پالینے کے بعد تمہاری بھم میں آجا یرگاکہ کیوں حق تعالیٰ جو ہارے مولیٰ
 ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ، سب اگلے پھلوں کو ایک ہی وصیت فرماتے ہیں، اور وہ یہی ہے
 کہ ہم تقویٰ کی زندگی اختیار کریں اور بس، بتاؤ تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ انتم اعلم اور اللہ؟
 وصیت ان الفاظ میں ہوئی ہے وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ آتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنْ
 اتَّقُوا اللَّهَ ۗ (پ ۱۶۶) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی
 اور تم کو بھی کہ تقویٰ اختیار کرو۔

مومن کی خصلت تقویٰ ہے اور یہ خصلت دنیا و آخرت دونوں کی جامع ہے اور سب کاموں
 کے لیے کافی؛ مومن جانتا ہے کہ ۶

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں!

اسی لیے وہ عشق و ایمان پر اعمال کی بنیاد رکھتا ہے الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَدْرَجْنَا لَهُمُ نِعْمَةَ
 اللَّهِ فَكَفَرُوا بِهَا إِنَّهُمْ كَانُوا لَمِنَ الْكٰفِرِيْنَ
 کی تقویٰ سے متعلق یہ وصیت ہمیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچی ہے ان
 کی بات کا انکار کفر، ان کی بات میں شبہ نفاق، ان کی بات میں اپنی بات کا ملانا بدعت
 ہے اور ان کی بات کا جوں کا توں مان لینا ایمان ہے، اس لیے گو

تعلیم پیر فلسفہ مغربی ہے یہ

نادان ہیں جن کو ہستی غائب کی ہر تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا؟

ہے شیخ بھی مشالِ برہمن صنم تراش
 محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
 اس دور میں ہر شیشہ عقائد کا پاش پاش
 مذہبِ ہر جس کا نام وہ ہر اک جنونِ خام
 ہے جن سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
 کتا مگر ہے فلسفہٴ زندگی کچھ اور

مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے رازِ فاش

باہر کمال اندکے اشتغالیٰ خوش است

(اقبال)

ہر چند عقلِ کل شد ملبے جنوںِ مباحش

آئیے اسی جنونِ یا عشق کی اپنے مولا سے التجا کریں :-

عطا اسلاف کا جذبِ ادوں کر شریکِ زمرةٴ لائیسز نوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں مے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

(اقبال)

قرآن اور علاجِ خوف

اس مختصر مقالہ میں نے ایک خوفناک اور جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہے، جو اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔ خوف سے میری مراد اس وقت کا اندر کا خوف ہے۔ میں خشیت اللہ کو کوئی قابلِ علاج چیز نہیں سمجھتا، معاذ اللہ، یہ یقین مقصود ہے۔ *یا تمنا یخشى الله من عباده العلماء* اصول کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، اور تفصیلات کو ترک کر دیا ہے۔

دور روزہ عمر پر ز خوف و خطر است از عصبہ غذائے خلق خون جگر است
آسودہ دلی ز بعد مردن ہم نیست زیرا کہ خطرہ دلاں طرف بسیار است

انسان کی دور روزہ زندگی خوف و خطر سے بھری نظر آتی ہے، اس کے قلب پر اس خوفناک جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے، جب وہ بستر سے اٹھتا ہے تو لرزاں و ترساں اٹھتا ہے، اور تمام دن کے غم و عصبہ کے بعد جب وہ پھر بستر کی طرف لوٹتا ہے، تو بھی خائف و ہراساں ہوتا ہے، وہ ڈرتا کس چیز سے ہے؟ کسی کو تو بیماری کا خوف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیمار ہو جائے اور دنیوی کامیابی کی بھاری توقعات مٹی میں مل جائیں، جب کسی عزیز یا دوست کی بیماری کی خبر سن لیتا ہے تو بچپن پر لیٹان ہو جاتا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں مر نہ جائے! کسی کو خوف ہے کہ وہ ساری دولت کھو کر فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے، ضعف و ذلت کا شکار نہ ہو جائے کسی کو اپنی ملازمت کی طرف سے خطرہ ہے، وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرتا ہے کہ کہیں بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صف میں شریک ہونا نہ پڑے، ملگروں کو

یہ مقالہ موتمن علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا، اور پہلی مرتبہ معارفِ نوبہرہ میں شائع ہوا۔

محتاج نہ ہو جائے، رزق کا موازہ بند نہ ہو جائے، کوئی اپنی ذمہ داریوں سے گھبرار رہے، یہ ناقابل برداشت نظر آ رہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور وہ اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے، کوئی ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرار رہا ہے، وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے، اور پسینوں میں ڈوب رہا ہے، کوئی خوف زدہ ہے، لیکن نہیں جانتا کہ کس چیز سے خوف زدہ ہے، اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، خطرہ کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہریں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں اور وہ بزدلی کی موت مر رہا ہے، غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص اس کا شکار ہے، کون ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عماد الدین فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے، وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ ہے خوف کا۔

غم رازِ من و مرا گر یز از غم نیست یارانِ قدیم را شکست از غم نیست

غم خوی بمن کرد و من خوئے بغم بچوں من و غم دو یار در عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہے؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مردانگی قوت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور اس پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیت خاطر اور بردِ قلبی کے ساتھ بسر کیے جاسکتے ہیں؟ علمائے نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ حکماء نے کائنات کی کُنہ حقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے درد بے رحم قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لیے ایک صلیب کے مانند ہے، جس پر بالآخر اس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور بہت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ، لرزاں مڑساں؟ قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

لَا تَتَّقُوا هُمًّا وَخَافُونَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (پس ۹۶) کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی مخلوق

مربوب سے حقیقت میں نافع و مضر ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر خوف کیوں؟ کیا یہ وہم کا نتیجہ

نہیں، باطل علم کی پیداوار نہیں؛ کیا اس سے نجات علم کی تصحیح سے ہو سکتی ہے، اختصار کے ساتھ بعض اہنی اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے خوف سے نجات اور زنجیروں سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنیں باندھ رکھی ہیں، دو طریقوں سے ہو سکتی ہے، ایک طریقہ ذہنی ہے اور دوسرا خارجی، پہلا طریقہ علم کی تصحیح پر مشتمل ہے اور دوسرا علم صحیح کے استعمال پر۔

(۱) علم کی تصحیح: خوف سے رستگاری حاصل کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے باہر الطبیعیاتی مسلمات کا جائزہ لینا چاہیے، مذہب کی زبان میں یہ عقائد کہلاتے ہیں ان کو عقل سے ثابت کرنے کی فلسفہ میں کوشش کی جاتی ہے، اور مذہب میں ان پر محض ایمان لایا جاتا ہے، اور ورنہ طور عقل سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ خلاف تجربہ اور خلاف وجدان نہیں ہوتے یہ مذہبی زندگی کے وہی جذباتی اور حسی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جھانکے ہوئے ہوتے ہیں، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے، عقل ان کی تردید نہیں کر سکتی۔

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعاً رہائی مل جاتی ہے، حق تعالیٰ کا رحیم اور حکیم ہونا ہے، فلسفیانہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ کائنات تمہاری دشمن نہیں دوست ہے، تم روحانی کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے، یہ قوانین کو رازہ نہیں، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے، اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ توفیق پیدا کرو گے تو تم ان کو اپنا رفیق کار پاؤ گے اور نتیجہ طمانیت اور تسکین قلبی ہوگا، اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کرو گے، تو نقصان تمہارا ہی ہوگا، خوف و غم میں مبتلا ہو گے، حزن و یاس سے نجات نہیں ملیگی، اور اس کا باعث خود تمہارا جہل ہوگا، اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین و ایمان کی شانہ قوت سے قطعی طور پر ان لوگوں کو دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مفید خیر ہے، یہ مفید حق تعالیٰ ہیں جو حکیم بھی ہیں اور رحیم بھی؛ حق تعالیٰ خالق کائنات ہیں، جان کر

کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، حق ہے، بجا ہے، سراسر حکمت سے مملو ہے، باطل کا وہاں کوئی شائبہ نہیں۔ مَا صَنَعَ اللَّهُ فَهُوَ خَيْرٌ - ۶

زنیکو ہرچہ صادر گشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائیگا تو جہتِ خیر تم پر سر بہن ہو جائیگی، خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے لگیگا، کمالات پر تمہاری نظر جائیگی، دل میں اور فطرت میں، بطن میں اور بصیرت میں حق جلوہ افروز ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائیگی، وہ عیب جو اور عیب ہیں نظر باقی نہ رہیں گی، وہ ذہنیت باقی نہیں رہے گی، جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے، اور اس پر اعتراض کرتی ہے، مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی ان پر شروع کا حکم لگاتی ہے، اور وہی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں
كَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ان کا قول ہے، وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں۔ وَاللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا رَٓٔ ۲۶ جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں اس پر رحیم ہیں تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ کو اپنا ولی جان کر وہ کس چیز سے ڈر سکتا ہے؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ نشانِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، جب یہ ادراک مومن کے قلب میں قوی ہو جاتا ہے، تو اب وہ بہ یک جہت خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے، اور لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے رحیم و حکیم ہونے پر غور کرو، مضطرب قلب کو، پریشان دماغ کو، معطل حواس کو، کچھ دیر کے لیے اس نقطہ پر مرکوز کرو، یہی وہ نقطہ ہے جو الوار کا شیخ ہے، قوتوں کا مرکز ہے، تو انانیوں کا مبدد ہے، اسی پر نظر جھا کر تم خوف سے نجات حاصل کرو گے، تمہارا ضعف دور ہوگا، جرن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طمانیت و تسکین قلبی نصیب ہوگی۔

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاں دائیں تو ظاہر ہے کہ ۶

جہاندار داند جہاں داشتن!

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہر چہ آن خسرو کند شیریں بود!

ہر واقعہ کی تخلیق اس ہمہ خیر قوت سے ہو رہی ہے، جو حکیم مطلق بھی ہے، اور رحم و کرم مطلق بھی! اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لیے مضر نہیں ہو سکتا، وہ ہمیشہ مجموعی میرے لیے مفید ہے، خیر برتر کے حصول کا ذریعہ ہے، یہ میرا جہل ہے کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، درپے آزار ہیں، جب کھوڑے سے غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں، اور میرے حال کے عظیم، تو جمعیت نام مجھے نصیب ہوتی ہے اور خوف بالکل رفع ہو جاتا ہے!

دوسرا اصل جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں ہم ہوں وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ (پا ۱۶) جب مجھے اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں، اقرب ہیں، میری حفاظت فرما رہے ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر و گزند سے محفوظ ہوں، ان کے حفظ و امان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے بالکل دور ہو جاتا ہے اور سرور و اطمینان بلکہ ایک ذوقِ مستی پیدا ہو جاتی ہے:

در بجز تو بودہ اندوہ و آزارم از وصل تو رفت ہستی و پندارم

شادی آمد و نصیب چاہم شد انوں جان و تن خویش را ہر آزارم

جب بھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعات خطرناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھانے لگیں تو میں اس امر کا احساس کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علوئے تکمیل حاصل ہوئے، اَلَا تَعْلَمُونَ

وَاللَّهُ مَعَكُمْ كَمَا نَصَدَاقُ هُوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہنچ سکتا ہے، ان کی محبت کی وجہ سے میں ہر شے سے بلند ہوں ان کو رکھ کر مجھے کسی شے کی نہ خواہش ہے، اور نہ اس کے نہ ملنے کا غم جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو، تو پھر شکستِ خواہش کا بھی احتمال نہیں، اور اس کے نتیجہ غم و خوف سے بھی آزاد ہوں!

لیکن غم و مصیبت و خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت و اطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت و شہود سے غافل نہ رہے ہوں، ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہوں، اور کسی عارف کے یہ الفاظ جلتے پیش نظر رہے ہوں۔

تشنہ او میر گر تو زندہ خاک آن در باش گر تو بندہ
ذره درد خدا در دل ترا بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، ان کی مہبودیت و ربوبیت کا اقرار ہو، ذلت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف اور پریشانی کے وقت ہیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، مونس ہیں غمخوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اسی طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت و طمانیت پیدا ہوتی ہے، اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور سخن سے خوف سے رہائی مل جاتی ہے!

اگر تم خوف سے بالکل رہائی کے خواہاں ہو، اس کی بیخ و بنیاد کو صحن دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو، جمعیتِ قائمہ کے حصول کے خواہشمند ہو تو خود شناس ہو، عرفانِ نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ اس عرفان کا آلہ محض عقل نظری نہیں، اس کے لیے اس عقل کی ضرورت ہے، جو بقول اقبال ادبِ خورہ دل ہے، عقلِ نظری (قیاساتِ عقل پرانی) ہمیں خود شناسی میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی، یہ زیادہ تراوہام باطل کا نقشہ تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کرتی اور

پھر اس کو بجاڑتی رہتی ہے، یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے، یہیں لذتِ حضور سے محروم رکھتی ہے، کیونکہ خود اس کی تقدیر میں حضور نہیں۔

انجامِ خود ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
تمہیں اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے جو پیرروم کی ہدایت کے مطابق تم سے کہہ رہی ہیں
عقلے ہم رساں کہ ادب خوردہ دل است
یہ عقل تمہیں اس وقت حاصل ہوگی جب شیخ بوعلی سینا کی تحقیقات سے صرف نظر کر کے سخن
حمدی سے دل بستگی پیدا کرو۔

دل در سخن محمدی بند لے پور علی زبو علی چند (عظیم خاتمی در تحفہ العواقب)
اب تمہیں اس عقل کے ذریعہ جو نورِ وحی کی ہدایت و رہبری میں قدم اٹھا رہی ہے، اپنی ذات کی
معرفت حاصل کرنی چاہیے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی "عبدیت" کا علم ہو جائیگا
کہ تم ذات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو خارجاً مخلوق ہو، غیر ذاتِ حق ہو، حق تعالیٰ تمہارے
ظاہر و باطن ہیں، اول و آخر ہیں، تم کو محیط ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تم سے قریب و اقرب ہیں
تم حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے
ہو، ان ہی کی قدرت و ارادے سے قوت و ارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفات و جہد یہ
تمہارے پاس امانت ہیں، یہ تمہارے لیے امانت نہیں امانت ہے تم فقیر ہو اور امین، امانت کا
استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو تو خلیفۃ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال
حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو وہی اللہ کہلاتے ہو۔ یہی جاہ اعتبارات ہیں، عبد اللہ کے فقر، امانت،
خلافت، ولایت، عبد اللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہویت و امانت ہے، صفات و افعال ہیں
ملک و حکومت میں، عبد اللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے، ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار
ہو سکتا ہے، وہ تو سرورِ محض ہے اس لیے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابلِ بیان سرور

لے تو طبع کے لیے دیکھو مصنف کی کتاب "قرآن اور تصوف"

محسوس کرتا ہے، طمانیتِ محض و ذوقِ خالص کا حزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی عارف
تام المعرفت نے ۷

چوں بدانستی کہ ظل کیستی فارغی گرمردی و گرزبستی
قنطرۂ نوری سراپا نور باش بگذرا ز غم دانا مسرور باش

انسان اپنی اس حقیقی جدت کو فراموش کر کے خوف و حزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوف
حزن اس کے قلب پر محیط اس لیے ہیں کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں اس
کے ہر درد و غم، ہر خوف و ہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے جاہل اس
سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی؟

یک سبد پرنان ترا فرق سر تو ہی جوئی لبِ ناں در بدر
تا بزانوئے میانِ فقر آب در عطش و زجوع گشت ہستی خراب

(۲) علم صحیح کا استعمال :- جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ
جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و
باطن ہیں، جب تم کو یقین ہو گیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، مولیٰ و نصیر ہیں، اس پر رحم
ہیں، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرأت کے ساتھ کہو کہ کائنات
کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہیں کر سکتی، اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کر کے کہو۔

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَ
يَخَوْفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ (پا ۶)

کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں؟ کیا تم کو یہ
ان سے ڈرتے ہیں جو خدا کے ماسوا ہیں؟ (ڈرمت)

مہیں اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیے، دیکھو بچا ذہیری رات میں
جاگ پڑتا ہے، اور ڈر کر رونے لگتا ہے، تم اس سے کہتے ہو، ڈر مت، یہاں کوئی چیز ایسی نہیں
جس سے تم کو ڈر ہو، خوف کی چیزیں صرف تمہارے خیال میں ہیں، کمرے میں نہیں، اس
طرح خوف کی نفی کرنے کے بعد تمہیں ان چیزوں کا اثبات کرنا چاہیے جو صحیح ہیں۔ مثلاً تم کہو گے

میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے بازو ہی میں تو ہوں، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے، اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، اور اس کو تمہاری قوت پر یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بے فکری کی نیند سو رہتا ہے!

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت الشعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہیے، جرأت و ہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہیے کہ ساری دنیا میں خدا کے سوا تمہیں کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی، تم جانتے ہو کہ شیخی نہیں، واقعہ ہے حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ رحیم ہیں، جس کے ساتھ وہ ہیں، جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں، حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ جس پر وہ تتر باؤں سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، ایسا مومن کا ثبات میں سوائے حق تعالیٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیاء مخلوق ہیں، مربوط ہیں، محکوم ہیں، مخلوک ہیں جب تک خالق و حاکم مالک و رب نہ چاہے، یہ ہیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہیں؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے الحکمہ اللہ متصرف فی الامور حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کے قبضہ قدرت میں تمام جانداروں کی پستانی کے بال ہیں مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلاَّ هُوَ آخِذٌ بِعَصِيَّتِهَا، ڈرنا ہمیں ان ہی کے جلال سے چاہیے، نافع وہ ہیں اور ضار وہ، معز وہ ہیں، اور نذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہے اور نہ ضرر کی، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَلَوْ جُحِدَ الْعِبَادُ اَنْ يَنْفَعُوا بَشِيئَةً لَمْ يَقْضِهِ اللهُ لَكَ لَمْ يَقْضِهِ اللهُ لَكَ لَمْ يَقْضِهِ اللهُ لَكَ لَمْ يَقْضِهِ اللهُ لَكَ

الْعِبَادُ اَنْ يَضُرُّوكَ بَشِيئَةً لَمْ يَقْضِهِ اللهُ عَلَيْكَ لَمْ يَقْضِهِ اللهُ عَلَيْكَ

اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائیں، جو اللہ نے تیرے لیے

نہ ہے۔ اس حدیث کا ایک حصہ ہے، جو حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے، اور جس کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی مفتوح الغیب مقالہ ۴۴ میں پیش فرماتے ہیں، اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہئے کہ اس حدیث کی اپنے دل سے تکرار کرتا رہے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پلے۔

مقدر نہیں کی، تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں، جو اللہ نے میرے لیے مقدر نہیں کی، تو وہ اس پر قدرت نہ پائیں گے۔ اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ تجھے قطعاً کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیو! اور زندگی کا عجیب قانون ہے کہ جوں ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتی، حضرت دانیالؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں شیروں کے غار میں ڈال دیا گیا لیکن شیروں نے انہیں چھوٹا تک نہیں، اس کی نفسیاتی توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت دانیالؑ کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف ان کے سینہ میں مطلق نہ تھا، اور اسی وجہ سے شیر انہیں چھوڑنے کے یہ توہم سمجھی جاتے ہیں کہ کتا جو خوف زدہ شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہیں آتا جو بالکل بے خوف ہوتا ہے، یہ جو سنیاسی جنگلوں میں جا بیٹھتے ہیں جہاں ہر قسم کے موذی اور درندہ جانور بھی موجود ہوتے ہیں، کیسے محفوظ رہتے ہیں؟ ان کی بے خوفی ان کے لیے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو محافظ سمجھتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے، کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمان راسخ کا۔

نفسی کے بعد اثبات، یعنی نفس کو یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی وجہ نہیں، اب ہمیں حق تعالیٰ کی معیت، اجالت، قرب و اقربیت کا ادراک کرنا چاہیے، جس طرح کہ چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور و معیت کا یقین دلانا ضروری ہے۔ جب وہ یہ محسوس کر لے لگتا ہے کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات میں ہے، وہ حق تعالیٰ کے نور میں منکشف ہے، اس کے دلہنے بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلب میں محسوس ہے، محفوظ ہے، تو پھر خوف کا سایہ اس کے قلب سے اٹھ جانا ہے، (ظلمت نور کی موجودگی میں کیسے ٹھہر سکتی ہے؟) سرور و طمانینت حقیقی کا نواز اس کی رگ و پے میں ہونے لگتا ہے، وہ قطرہ نور بن جاتا ہے سرابا نور ہو جاتا ہے، اور مسرت دائمی سے بہکنار ہو جاتا ہے۔

اس مقصود کے حصول کے لیے تمہیں بعض ازلی وابدی صداقتوں کا دہرنا پڑی ہو گا، جب خوف دہراس کی لہریں تمہارے قلب میں قیامت خیزی کر رہی ہوں، اور وہ بیٹھا جا رہا ہو، اور تمہاری نظر میں دنیا تار یک ہو رہی ہو تو تمہیں بیٹھ جانا چاہیے، اور آہستہ سے لیکن استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ معیت حق کا ادراک کرتے ہوئے، ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہیے۔

حَسْبِيَ اللَّهُ نِعْمَ الْوَكِيلُ نِعْمَ لِلَّوَالِي وَ نِعْمَ النَّصِيرُ
مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کار ساز ہے،
کیا خوب بولی ہے، اور کیا خوب مددگار ہے۔

ان کی تکرار سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے اور وہی یقین کی وجہ سے ہمیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے۔
جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلعم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلب الہی پر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے :-

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ

درد بھرے دل سے العیاذ کی یہ پکار نکلی کہ حتی القیوم کی رحمت لے قلب کو سنبھالا دیا، اور اس کی حفاظت کے سامان فریم کر دیے!

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کر نیوالے خیال کو قبول کرنے کی وجہ سے، اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر نہ کرنا ممکن ہے جس سطح پر خوف کی موجیں اٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے، اور بالاتر سطح پر قدم جمائے اور دیکھو کہ طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے، جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم کسی بلند پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلاخیز موجوں کے شر و شور سے ہمیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے نیچے سے باہر ہیں! بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ جاتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور

اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ! یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سارے دردوں کی دوا حق تعالیٰ ہیں، خوف و حزن کا علاج حق تعالیٰ کی محبت ہے، غیر اللہ سے بیزاری ہے، درد و الم خوف و ہراس کے وقت اپنے رخ کو حق تعالیٰ کی طرف اغلاص کے ساتھ پھیر دو، اور عجز کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ، اور پھر تمہارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا۔

در حضرت ما دوستی یکدلہ کن
 ہر چیز کہ غیر ماست آزا یلہ کن
 یک صبح با اغلاص بیار در من
 گر کار تو بر نیاید آنگہ گلہ کن!

(ابوسعید مہتمی)

بے خوف زندگی

جلے ریح پاک علییں بود کرم باشد کس وطن سرگین بود! (رومی)
 آئیے آپ کو بے خوف زندگی بسر کرنے کے وہ گرتلا میں جنہیں صوفیہ کرام نے اپنے ذوق و وجدان
 سے دریافت کئے ہیں، اگر آپ انہیں سمجھ لیں اور ان پر عمل کریں تو آپ اپنی زندگی کو لا خوف علیہم
 ولا ھم یحزنون کا مصداق بنا سکتے ہیں اور خوف و حزن سے نجات حاصل کر کے بے خوف و
 مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

زیں شہدیک انگشت سنا نم بلبت از لذت اگر جو نگر دی تف کن
 یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صوفیہ کرام کی زندگی حق تعالیٰ ہی کے قرب میں بسر ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ
 ہی کے لیے جیتے ہیں، اور انہی کے لیے مرتے ہیں، جیسا کہ عارف رومی نے کہا ہے:-

بہر نیرداں می زید نے بہر گنج بہر نیرداں می مرد نر خوف و رنج
 انگھاں خندد کہ او بیند رصفا ہچو حلوائے شکر اور اقضا

ظاہر ہے کہ بے خوف زندگی کے حصول کا ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے، اور وہ
 یہ کہ قرب حق میں زندگی بسر کی جائے، اور اس امر کا یقین پیدا کیا جائے کہ ہماری زندگی میں حق
 تعالیٰ ہی کی مراد اہل ان ہی کی نشا، کی تکمیل ہو رہی ہے، اور یہ نشار یا مراد خیر برتریں ہے۔
 عمر خوش در قرب جاں پروردان است عمر ذراغ از بہر سرگین خوردن است (رومی)
 اس مضمون میں ہم اسی اجمال کی تفصیل بیان کرینگے۔

صوفیہ کا یہ یقین قرآنی تصور پر مبنی ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں، اقرب ہیں، ہم پر محیط
 ہیں، ہمارے ساتھ ہیں، وہ ہم سب سے غائب نہیں، بعید نہیں، اِن دَبِّ قَرِیْبٍ مَّجِیْبٍ میرا رب

مجھ سے قریب ہے میری دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے **إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ** بیشک وہ مجھ سے قریب ہے اور میری سنت ہے۔ جب کسی نے اپنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارا رب نزدیک ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے جو ہم اس کو پکاریں تو جواب میں یہ آیت نازل ہوئی **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ** جب میرے بندے مجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو قریب۔ ان سے کہہ میں قریب ہی تو ہوں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، تو آپ نے فرمایا۔

یا ایہا الناس ارجعوا علی انفسکم
انکم لاتدعون اصما ولا غائبا انکم
تدعون سمیعا بصیرا وهو معکم
واللین تدعون اقرب الی احدکم
من عنق راحلہ۔

یعنی اے لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو یعنی آہستہ کہو
تم کسی بے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو
تم پکار رہے ہو مستننے اور دیکھنے والے کو جو تمہارے
ساتھ ہے اور تم جس کو پکار رہے ہو، وہ تمہارے
اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یہ حدیث وما کنا غائبین کی تفسیر ہے، اور فانی قریب کی تشریح، صحیح ہے و خواب جہل از حسرم قرب مراد و فکند ورنہ نزدیک تر از دست کسی پیچندید اس معرفت کے حصول کے بعد جو دراد طور عقل و نظر ہے، جس کی سذ نص قطعی و کشف صحیح ہے، اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ قرب حق بخیر اختلاط و حلول و اتحاد ہیں حاصل ہے، صوفیہ کرام نے قرب حق کے دو پہلوؤں پر فکر کرنے ان کا تحقق حاصل کرنے اور ان پر قلب کی قوتوں کو مرکوز کرنے کی ہدایت کی ہے، جس کی وجہ سے روح کو چین اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور خوف و حزن سے قطعی طور پر نجات مل جاتی ہے، اور وہ دو پہلو رحمت و حکمت کے ہیں۔

۱۱) قرب حق رحمت ہے، رحمت حق ہیں کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی نقصان پہنچانا ہرگز

۱۲) مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۲۵ شیخ علی الہامی در تفسیر القرآن اسمی تمبیر الرحمن ج ۱ ص ۲۱۹

نہیں چاہتی، اور نہ غیر کو نقصان پہنچانے دیتی ہے، حق تعالیٰ تو عظیم و رحیم ہیں، غفور و کریم ہیں اِنَّ اللّٰهَ
بِكُمْ لَوْوُفٌ رَّحِيْمٌ وہ تو ہمیں سلامتی امن و رحمت ہی کی طرف بلا تے ہیں، اللہ یدعو الی دارالسلام
ان کا فضل و کرم عظیم ہے، واللہ ذوالفضل العظیم وہ ہلکے سچے دوست ہیں باللہ ولی الذین
آمنوا! اگر ہم اس بنیادی واقعہ کو یاد رکھیں، فراموش نہ کریں، بھلا نہ دیں، ان کے سایہ رحمت میں
زندگی بسر کریں اور ان کی یاد میں رہیں تو کوئی چیز ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ رحمت حق کا مقابلہ
کوئی چیز نہیں کر سکتی، حق کے مقابلہ میں کوئی قوت آ سکتی ہے!

لیکن ہماری زندگی ذہول و غفلت میں گزرتی ہے، معصیت و نافرمانی میں بسر ہوتی ہے، حق تعالیٰ
یارسرہاں کی طرح ہمارے جو یا ہوتے ہیں، اور ہم گدھوں کی طرح ان سے بھاگتے ہیں، اور بلاؤں اور
آفتوں کا شکار ہوتے ہیں۔

تومراجوا چو یارسرہاں من گریزاں از تو مانند خزان (روحی)

جب خوف و خزن آفات و طیبات کا سامنا ہو اور ہم قرب حق کا ارادہ قائم کر سکیں، قلب کو
اس واقعہ کا یقین دلا سکیں، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، اپنی رحمت کاملہ کے ساتھ ہمارے قریب
ہیں، اموش و رفیق ہیں، یارسرہاں ہیں، ہماری قوت بازو اور ہماری پناہ گاہ ہیں، سہارا ہیں، وہی حق
تعالیٰ جن کے حضور میں رات کی سیاہی اور دن کی روشنی آفتاب کی شعاع اور چاند کا نور درخت کے
چاند اور پانی کے حیوان سجدہ ریز ہیں، جو محسن و مکرّم و منعم ہیں جو حرز صنعا، و کز فقرہ ہیں تو بہلا بتلاؤ کہ
اس ادراک کے بعد قلب میں خوف باقی بھی رہ سکتا ہے، عا شا و کلور! قرآن کریم نے بیانگ و دلہا
کیا ہے کہ اس ادراک یا ذکر کے بعد قلب کا اطمینان قطعی و یقینی ہے۔

الذین آمنوا و کلمتہم قلوبہم

جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے

دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے

ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

ذکر توجہ علی ہی کا تو نام ہے، حق تعالیٰ کی طرف، ان کی رحمت و محبت کی طرف قلب نے توجہ کی

اس امر کا ادراک کیا، کہ یہ رحمت ہم پر ہر جانب سے محیط ہے کہ خوف دور ہو اور طمانیت نصیب ہوئی اور زندگی کے میدان میں قدم اعتماد و اطمینان کے ساتھ بڑھنے لگے، کیونکہ اب ہم یقین ہو گیا، اور ہم نے محسوس کر لیا کہ رحمت حق ہمارے سامنے ہے، کان بالموئینین رحیما!

لیکن خوف و خطر کے وقت رحمت کا ادراک اور اس کا تحضر و تحقق کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکے، اگر ہم نے راحت و آسودگی کے وقت فراغت و طمانیت کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم نہ رکھا ہو تو خوف و مصیبت کے وقت ہم اس معیت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے حوالہ کر دیا گیا، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ ہر حالت میں خواہ وہ نعمت و راحت کی ہو یا بلا و مصیبت کی حق تعالیٰ کی جانب لگائے رکھیں، ان کی یاد میں زندگی بسر کریں، ان کی معیت کا ادراک کرتے رہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کو اس بنا پر نصیحت فرمائی تھی کہ

أَذْكُرُ اللَّهَ فِي الرَّخَاءِ يَذْكُرُكَ اللهُ فِي الْيُسْرِ
 اذکُ اللہ فی الرخاء یدکُک اللہ فی الیسر
 میں یاد کریگا۔ یعنی تیری مصیبت دور کریگا۔

جب انسان آسائش اور چین کی حالت میں حق تعالیٰ کی یاد نہیں بھولتا، تو حق تعالیٰ بھی اس کو خوف و مصیبت کی حالت میں نہیں بھولتے، اس لیے تاکید کے ساتھ حکم ہوا ہے۔

فَلْيَكْثُرِ اللَّذَّاءُ عِنْدَ الرَّخَاءِ
 چین اور آسائش کے وقت زیادہ دبا کرتے رہو۔

جانتے ہو کہ چین کی حالت میں دعا کا کیا مطلب ہے، صرف یہ ادراک کہ ہر نعمت دراصل حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ حَقِيقَتِ میں نعم، قاسم، قائل، مسبب موجود حق تعالیٰ ہی ہیں ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں شکر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور مومن کی شان میں فرمایا گیا ہے:

لِلْمُؤْمِنِ شُكْرٌ وَإِيتَانٌ
 مؤمن چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

اگر ہم آسائش و نعمت کی حالت میں حق تعالیٰ کو یاد نہ رکھیں، نعمتوں کو ان ہی کی جانب سے

بھیجیں، اور اس طرح اپنا رخ ان ہی کی جانب نہ رکھیں، تو مصیبت و خوف کے وقت ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، جو ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے (چین و آسائش کے وقت حق تعالیٰ کی یاد ہمیں اس قابل بناتی ہے، کہ خوف و مصیبت کے وقت ہم ان کی محبت کا ادراک کر سکیں ان کی رحمت کا ملہ کو اپنا مونس و رفیق پاسکیں، اس لیے حضور انورؐ نے ابن عباس سے فرمایا تھا، کہ اے لڑکے :-

احفظ الله يحفظك الله، احفظ خدا کی نگہداشت کرو، خدا تمہاری نگہداشت کرے گا۔
 الله تجده امامك - خدا کو حاضر جانو تو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔

اگر ہم حق تعالیٰ پر نگاہ رکھیں، یعنی ان کی محبت کے ادراک میں رہیں، تو حق تعالیٰ ہمیں اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں (اپنی رحمت و نصرت سے) اگر ہم حق تعالیٰ کی محبت کا ادراک قائم رکھیں، تو ہم انہیں اپنے سامنے ہی پاتے ہیں :-

خوف کے وقت حقیقی دعا تو یہ ہے کہ ہم کہیں حق تعالیٰ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، میں آپ کی نظروں میں ہوں، پھر کوشش اس امر کے ادراک کی کی جائے کہ ہم حق تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے ہیں، اور ان کی رحمت کا بلہ بادل کی طرح ہم پر سایہ فگن ہے، یا نور کی طرح ہر جانب سے ہم پر محیط۔

خوف اور بلا کے ورد کے وقت قرآن شریف ہے، کہ پیغمبر اسلام (فداہ روحی) کو حکم ہوا کہ
 قاصِدٌ لِحُكْمِ رَبِّكَ يَا نَبِيَّنا اپنے رب کے حکم پر مبرکرو کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو
 بعض عارفین کی جیب میں یہ آیت لکھی رہتی تھی، خوف و مصیبت کے وقت اس پر نظر
 ڈالتے، حضور و محبت حق کا ادراک کرتے، اور محض اس ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت
 کو جانتے ہیں، اس تجربہ میں شریک ہیں، دیکھ رہے ہیں، جو سے رخص کرتے، خود حضور انورؐ پر اس آیت
 سے وجد طاری ہوا تھا، اور ام المؤمنین عائشہؓ صدیقہ آپ کے پاؤں پر لگی تھیں، عجمی نے شاید اسی
 مفہوم کو یوں ادا کیا ہے،

بادرد بسا زچوں دوتے تو منم در کس شکر کہ آختے تو منم
گر بر سر کوٹے عشق اکتے شوی شکرانہ بدہ کہ خونہا کے تو منم

(۱۲) ثانیاً قرب حق یا حضور حق حکمت و نظم کا نام ہے، حضور حق عالم لاہوت ہے، عالم لاہوت میں کامل الہی نظم پایا جاتا ہے، بے نظمی یا اختلال نہیں، عالم لاہوت میں شر نہیں فساد نہیں بلکہ کامل نظم و ترتیب ہے۔

نظم کائنات پر غور کرو، یہاں پر قانون اپنا عمل کر رہا ہے، اس کی شکست یا ناکامی ناممکن ہے، مثلاً کوئی برقیہ (Electron) تک اپنے کام میں تصور نہیں کرتا، دوسرے برقیے سے نہیں ٹکراتا، ان کے درمیان تصادم ممکن نہیں، یا قرآنی الفاظ میں یوں کہو کہ صنغ الہی میں کوئی دخل نظر نہیں آتا، بار بار نگاہ ڈالنے پر بھی نگاہ در ماندہ ہو کر لوثی ہے، اور کوئی عیب یا دخل نظر نہیں پڑتا۔

کائنات فی خلق الوضوح من تقویٰ تو خلقی صنعت میں کوئی دخل نہ دیکھو، تو پھر نگاہ
فأرجع البصر هل تری من ظنور تفر ڈال کر دیکھ لے، کہیں بھوکو کوئی دخل نظر آتا ہے
أرجع البصر کونین ینقلب الیک پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ، نگاہ ذلیل اور دانا
البصر خائب ما وھو حیوید پنا ہو کر تیری طرف لوٹ آسکی۔

عالم لاہوت میں اس سے کہیں زیادہ کامل نظم و توافق کی حکمرانی ہے، یا یوں کہو کہ نظم الہی میں کامل توافق یا ہم آہنگی پائی جاتی ہے، نغمہ موسیقی جن تاروں سے پیدا ہوتا ہے، ان میں سے ہر تار اپنی مقرہ شرح ہی سے قعرش ہوتا ہے، اس رفتار میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، نظم الہی کا بھی یہی حال ہے، یہاں بھی ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوتی ہے، اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہے، اپنا مقروضہ کام انجام دیتی ہے، اس کو کامل ملد پر انجام دیتی، اور اپنے صحیح وقت پر انجام دیتی ہے۔

حضور حق یا قرب حق کے مفہوم میں نظم الہی بھی شامل ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے قریب ہیں، اقرب ہیں، ساتھ ہیں، نظم الہی حکمت حق ہی اس کے ساتھ موجود ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں تو اس کا ظہور بھی قطعاً ہو کر رہیگا۔

جب ہم اپنی دعائیں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ
ہیں، تو ہیں اس امر کا تحقق ہوتا ہے کہ معیت حق نہ صرف رحمت ہے، بلکہ حکمت بھی ہے، نظم بھی ہے،
لہذا ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوگی، اور اپنے ٹھیک وقت اور ٹھیک مقام پر ہوگی، اور اگر ہم اس
یقینِ صادق کو قلب سے ہٹنے نہ دیں، تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔
عارف رومی نے اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا ہے:

رو دیدہ بپوش تا دلت دیدہ شود ذرا دیدہ جهان دگر ت دیدہ شود

گرتوز پسند خویش بیرون آئی کارت ہمہ سر بسر پسندیدہ شود

اگر دیدہ دل سے حکمت الہی نظر آنے لگے، اگر دل نظم الہی کا مشاہدہ کرنے لگے، اس یافت و
شہود میں وہ جا بھی ہے، تو پھر عارف کا ہر کام پسندیدہ ہی ہوگا، اپنے وقت پر ہوگا، اپنے مقام
پر ہوگا، اور ہر وقت وہ یہی کہیگا کہ "الخیر فیما وقع" جو ہوا وہ ٹھیک ہوا،

ہر چیز کہ ہست آنچنان می باید و آن چیز کہ آنچنان نمی باید نیست

صرف یہ کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں، اللہ معنا بلکہ ہر زندگی میں منشاء الہی ہی کی
تکمیل ہو رہی ہے، ہمارے دل، ہمارے اعضاء اور ہم خود سرتاپا حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں،
اس منشاء الہی کی بنیاد نامتناہی حکمت و رحمت پر قائم ہے، یہ سرتاپا حکمت ہی، رحمت ہی، یہیں
خیر برتری کی طرف لجا رہی ہے، اس کو ارادۃ اللہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مرضی مولیٰ بھی کہا
گیا ہے، حق تعالیٰ کے ارادے سے توافق ان کی رضا سے راضی ہونا، رضا ازو، رضا بدو، رضادو
اعراض عن الاعتراض، حفظ حال، قیام فی امتثال اللہ اس کی تعلیم تو ہمارے رہبر اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے ہمیں دی ہے، حق تعالیٰ کے ارادے، منشاء، مرضی سے زیادہ بہتر، زیادہ تقصیر زیادہ
حسین و جمیل، زیادہ شاندار کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نیک انجام و شاد کام ہے، وہ شخص جس نے
اپنے ارادے سے حق تعالیٰ کے ارادے کے خلاف کام نہ لینے کا ارادہ کر لیا اور باقائے بند کہا۔

اَرِیدُ اَنْ لَا اَرِیدُ میں نے ارادہ نہ کرنے کا ارادہ کیا۔

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے معروضہ کیا ہو۔

اللھم انقلوبنا وناصینا و
جوارحنا بیدک لہم لکننا منہا
شیئا فاذا فعلت ذلک، فکن
انت ولینا واهدنا الی سوا
السبیل لہ

حق تعالیٰ! ہمارے دل ہم خود سرتاپا اور ہمارے
اعضاء، آپ ہی کے قبضہ میں ہیں! آپ نے ہمیں اُن
میں سے کسی چیز پر بھی اختیار (کامل) نہیں دیا ہے،
پس جب آپ نے یہ کیا ہے تو آپ ہی ہمارے مددگار رہیں
اور ہمیں سیدھی راہ دکھاتے رہیں۔

جس کی شب روزیہ دعا ہو کہ

اللھم انی ضعیف فقو فی رضاک
ضعفی وخذ الی الخیر بنا صیتی
فاجعل الاسلام منتہا رضائی

حق تعالیٰ میں کمزور ہوں پس اپنی مرضیات میں میرا ضعف
اپنی قوت سے بدل دیجئے، اور کشتاں کشتاں مجھے خیر کی
طرف لے جائیے، اور اسلام کو دینی ہر امر میں آپ کے
سامنے تسلیم خم کرنے کی خوئی میری پسند کا منتہا بنا دیجئے

جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو دیدیتے ہیں، نرم اور ملائم اور لچکیلے ہو جاتے ہیں،
ان کے ارادے کے آگے تسلیم ختم کر دیتے ہیں، ان کی رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہو جاتے
ہیں تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہوتے ہیں، زبان وحی نے اس
کی توثیق کی ہوا انّ اللہ رجلا یرضی برضاہم و یغضب بغضبہم کل انہم یرضوا برضاہ و یغضوا بغضبہ

ہرچہ خواہی آں کند گر ہرچہ خواہی آں کنی

اچہ گوئی یشود گر ہرچہ گفت او یشوی

جب مقام رضا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں پرہیز نہیں رہتی کہ زندگی میں ہم پر کیا گزر رہی ہے،
یا گزرنے والی ہے، کیونکہ ہم چلنے لگتے ہیں کہ انجام ہر چیز کا خیر ہے، خیر اب بھی اور ہمیشہ کے لیے
بھی، اسی لیے شیخ جیل نے جان کر کہا تھا کہ

لہ ترویج الغیب - لہ تردی عن ابی ہریرہ و کثر العیال عن جابر -

الرضا بالقضاء والراحة الكبرى و
 الجنة العالمية المنفردة في الدنيا
 وعلّة محبة الله بعد المومن فمن
 احبه الله لم يعد به في الآخرة له

قتلے الہی سے راضی رہنا دنیا میں بڑی راحت کا
 سبب ہے گو یا جنت عالیہ ہے اور علیہ مومن کے ساتھ
 حق تعالیٰ کی محبت کا باعث ہے، اور میں سے حق تعالیٰ
 محبت کرتے ہیں اس کو دنیا میں تکلیف دیتے ہیں اور نہ
 آخرت میں۔

قرب حق میں زندگی بسر کرنے اور اس پر یقین صادق حاصل کرنے کا کہ ہماری زندگی میں مراد
 الہی کی تکمیل ہو رہی ہے، نتیجہ خوف پریشانی فکر اور بے شمار خرابیوں کا کال دفتیہ ہے۔ ہم کو اس
 سے اس عارف کامل کا نقطہ نظر حاصل ہو جاتا ہے جو زندگی اور اس کے ہجوم و غموم، افکار و
 پریشانیوں پر ہنستے ہوئے نظر ڈالتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پس پردہ حکمت مطلقہ و رحمت
 مطلقہ کام کر رہی ہے اور اپنے شاندار منشاء و مراد کی تکمیل کر رہی ہے اور وہیں خیر برترین کی طرف
 لے جا رہی ہے۔ سائے جہان کو بھی وہ اگر برف سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہے تو گھبراتا نہیں کیونکہ وہ جانتا
 ہے کہ خورشید کی ایک نظر سے یہ ہماری برف پگھل جائے گی۔

گر جہاں پر برف گرو دوسرے سر
 تاب خور بگدا ز دیش از یک نظر (روحی)

اس لئے وہ اپنے ساتھیوں سے عجیب امید افزا لہجہ میں کہتا ہے۔

سوئے نومیدی مرو کامید است سوئے تاریکی مرو خورشید است
 بے خوف زندگی بسر کرنے کا راز تم نے دیکھا بس یہ ہے کہ

(۱) قرب حق میں زندگی بسر کرو کیونکہ

عمر خوش در قرب جان پروردن است عمر زانغ از بہر سرگیں خوردن است

(۲) حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں نرم اور ملائم بن جاؤ، تاکہ ارادۃ اللہ جاری ہو جائے، رضائے حق

تمہارا مقام ہو، "قیام فی ما قام اللہ" حق تعالیٰ نے جہاں تمہیں کھڑا کیا ہے وہیں کھڑے رہو، رضا
 بالاعطا، حفظ حال تمہارا شیوہ ہو، ہر حالت میں خوش رہو، تضادم بالقضاء سے بچو۔

لے خوف اللیب

جن تجربات سے گزر رہے ہو، ان پر خدا کا شکر کرتے رہو کہ ان کا تمہیں موقع دیا گیا، ان ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے، دنیا کو روح ساز، وادی کہا گیا ہے، یہاں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے تختہ نغمے بیدار کئے جاتے ہیں۔ ان پر ہر حال میں شکر واجب ہے۔ کرب و بلا دونوں کی ایک سی قیمت ہے۔

یہ الفاظ دیگر جن چیزوں سے تمہیں خوف ہو، ان ہی سے پیار کرو، تو خوف سے تمہیں ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔

بس زبون و سوسنہ یا شی و لا

گر طرب را یازدانی از بلا

دارے جان

”بازگشت ادم بطیبی دکاں مرہم دل دارم و دارے جان“
 آفت و بلا، غم و حزن، اندوہ و درد کے دفع کرنے کا طریقہ جس کی تعلیم خاص طور پر صوفیائے
 کرام نے دی ہے، جو قرآن و دین قرآن سے ماخوذ ہے، یہ ہے کہ بلا کے نزول کے وقت نظر منہلی یعنی مبتلا
 کرنے والے پر تکیہ جائے، اور وہ حق تعالیٰ ہے۔

مَا آصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (سورہ تغابن - ۱) اللہ کے حکم کے بغیر کوئی مصیبت نہیں پہنچتی
 قُلْ لَنْ يُصِيبَكَ إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا (سورہ توبہ - ۶) کہہ جسے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے
 اور یہ ایمان و اذعان تو حاصل ہے کہ ”فعل جلیل حقیقی ہمہ از جمال است“ اللہ مجید و مجتہد الجمال،
 ہاں فرق صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ جمال جلال کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور دوسری جگہ
 جمال جمال ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس ایک عاشق کے الفاظ میں

”بجز انکسلاں و بدیتِ نعم و گم شدن و حیراں ماندن در التذاور انہا کار سے نباشد“

یعنی حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مشاہدہ میں مصغمل ہو جانے اور اس کی لذت میں گم اور حیران ہو جانے کے
 سوا کوئی دوسرا کام نہیں!

دوسرے الفاظ میں نزولِ بلا کے وقت قلب کو بلا پر مرکوز کرنے کے بجائے اسکو ”جمع ملک و قوی“
 کے ساتھ منہلی یعنی حق تعالیٰ پر مرکوز کرنا چاہیے اور اس کے جلال کو جمال ہی کی ایک شان اور ایک طور جان
 کر اس کی یاد، اس کے شکر سے اس قدر بھر دینا چاہیے کہ لذتِ دید کے سوا کسی اور چیز کا خیال ہی قلب
 میں نہ آسکے! کسی پختہ کار نے اس کیفیت کو یوں ادا کیا ہے:

وصل تو چون دست داد ملک جهان گو مباش لعل تو یوں حاصل است جو ہر جاں گو مباش

عاشقِ رؤے تو نیست طالبِ دنیا و دین آرزوئے جاں توئی، کون و سکان گو مباش
گردشِ گردوں اگر قطع شود گو بشو حاصلِ فطرت توئی، دوزِ زمان گو مباش
بے تو نیرزد جوے ہر چہ بود در جہاں مایہِ جان ما توئی، سود و زیاں گو مباش

اس دید کا نتیجہ وہی ہے جو قرآنِ عظیم میں یوں بیان کیا گیا ہے :

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ (سورہ فتح - ۱)

وہی ہے جس نے قلوبِ مومنین میں اطمینان پیدا کیا تاکہ اور بڑھ جائے ان کا ایمان اپنے ایمان کے ساتھ۔

کیا یہ طریقہ آسان ہے؟ قابلِ عمل ہے؟ جب مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جو فہمدرہ میں اعصاب کی جوگمختی ہے اس پر تھوڑے کی ایک ضرب پڑی، سو اس میں اختلال پیدا ہو گیا۔ تلخی، بلا سے دل خون آلود ہو گیا۔ خوف و حزن کا تسلط قلب و دماغ پر ایسا ہو گیا، کہ کچھ بھی سوچنے نہ لگا۔ اس رنجِ زواں کے طوفان میں نفس و قلب و روح سب غرق ہو گئے۔

ہاں یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن کامل علاج صرف ایک ہے اور وہ **فَقِرُّوْا إِلَى اللَّهِ** اور **تَبْتَئِلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً** پر عمل کرنا! نزلِ بلا کے وقت قلب کی توجہ کا حق تعالیٰ کی طرف ہو جانا ہے۔ جو بلا میں مبتلا کرنے والے ہیں۔ اور خود مصیبت و بلا کی طرف سے ہٹ جانا ہے۔ صوفیہ کے الفاظ میں "مستانہ وار ایک حملہ کرنا ہے اور علم سے لکل کر معلوم تک جا پہنچنا ہے؛ یا عاشقِ وارفتہ کے الفاظ میں معاملہ کی صورت کا یہ ہو جانا ہے،

قبل و محراب من ابروئے دلدار است و پس! این دل شوریدہ را بایں چہ و بآں چہ کار (مناظر)
عمل کے لئے علم ضروری ہے۔ علم قائدِ عمل ہے۔ یہاں تھا سے لے لکس علم کی ضرورت ہے۔ نبی کے تمام صفات کے معرفت کی ضرورت ہے۔ نبی حق تعالیٰ ہیں۔ ہر بلا کا ظہور حق تعالیٰ ہی کے علم و حکم سے ہو رہا ہے اور حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، رحیم و کریم ہیں، لطیف و رؤف ہیں، محسن و منعم ہیں حق تعالیٰ کی ان صفات کی وجہ سے ان کی رحمت کی امید کا ہمارے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے اور حسن ظن کا قائم

۱۰ ایک حملہ مستانہ مروانہ بکر دیم از علم گزشتیم و بہ معلوم رسیدیم

ہو۔ ملازمی اور یہی ظن شیخ جبلی کے الفاظ میں "حوالہ کر دن مقاصد خویش بر سابقہ امر عنایت
جناب الہی ست، و نظر قلب است بسوئے حق بے تطبیح فوادو بے تمنیہ ارواح و نفوس، یعنی اپنے تمام
مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایت سابقہ کے حوالے کرنا ہے اور قلب کی نگاہ کا ان پر حجم جانا ہے۔ ایسی
حالت میں قلب سے طبع اور روح و نفس سے تمام تمنائیں نکل جاتی ہیں اور ہم صحیح اٹھتے ہیں۔

تو دردی! بغم این وائل کہ پروازد؛ بجائے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پروازد؛

زناز نیست ترا فرصت و مرز نیاز کموں بجال دل ناواں کہ پروازد؛

صوفیہ کرام کی اصطلاح میں یہ "جذبہ خواص" ہے یعنی "توجہ قلب بسوئے حق مع القطاع

عالمواہ" قلب کا حق کی طرف متوجہ ہو جانا اور غیر حق سے کٹ جانا، غیر حق سے خالی ہو جانا ہے۔

دل یادت دیدہ کہ مقیم ہوائے تست (شمس تبریز)

یعنی "لَا مَرَادَ وَلَا إِزَادَةَ" کا مقام کہلاتا ہے۔ اس مقام کا انسان "جلال محبوب کو جمال

محبوب سے بہتر خیال کرتا ہے، درد و الم کو انعام سے زیادہ تصور کرتا ہے۔ جانتا ہے کہ جمال و انعام میں

محبوب کی مراد اپنی مراد کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہے اور جلال و ایلام میں خاص محبوب ہی کی مراد ہے اور اپنی

مراد کے برخلاف "ثنتان بینہما" اس سے قلب کی کشمکش دائمی طور پر محبوب ہی کی طرف ہوتی ہے

دنیا و آخرت کی نعمتوں سے اس کا دل بہا ہو جاتا ہے، اس کو تمام احوال و مشاہدات سے یکسوئی دے نیازی

حاصل ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ ہی سے دائمی آرام و آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو قرب المقصود

وصال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

گشتہ ام در جہاں و آخر کار

دلبرے برگزیدہ ام کہ مسپرس

(حافظ)

دوسرے الفاظ میں اس حالت قلبی کو "فقر" سے تعبیر کیا جاتا ہے جس پر آن حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کیا ہے "الفقر فخری" فقر، میں قبلہ توجہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی چیز

نہیں ہوتی۔ اسی فقر سے "غنا" پیدا ہوتی ہے جو حق سے کامل نیاز پیدا ہو جانے کی وجہ سے

خلق سے بے نیاز ہوجانے کا نام ہے۔

اُن کس کہ ترا شناخت جان را چہ کند فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

دیوانہ کئی ہر دو جہانش بخششی ! دیوانہ تو ہر دو جہاں را چہ کند

یہ حال تو منتہیوں کا ہے، ان کی نظر ذات بحت پر ہوتی ہے۔ ان کا قلب ماسوا اللہ سے

فارغ و خالی ہوتا ہے مقصود و مطلوب بجز واحد مطلق کے کچھ نہیں رہتا۔ تمام مقاصد ان کے

سینہ سے نکل جاتے ہیں اور ان کی ساری ہمت حق تعالیٰ کی رضا مندی کے حصول میں صرف ہوتی

ہے۔ زندگی کا مقصد ان کے نزدیک بس یہی ہے اور اسی طرف خلق کو وہ بلا تے ہیں

سر رشتہ دولت لے ہرادر یکف آرد وین عمر گرامی بہ خسارت مگذار

دائم ہمہ جا با ہمہ کس در ہمہ کار می دار ہفتہ چشم دل جانب یار

بلدیوں کا حال اس کی بالکل ضد ہے! یہ اپنے خدا کو زندگی کے مصائب سے نجات

پانے کے لئے استعمال کیے ہیں، گو یا کہ وہ ان کی خواہشوں اور تمناؤں کے پورا کرنے کا ایک لہ

ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس سے دعا کرتے ہیں۔ ان کا مطلوب و محبوب ان کی اپنی

تمناؤں ہیں۔ ان کا سینہ ان کی اپنی خواہشوں اور آرزوؤں سے بھرا ہوتا ہے۔ ہر خواہش پر ان کا

دم بھکتا ہے، تلخیوں سے ان کا دل پر خون ہوتا ہے۔ دراصل یہی آرزو و ارمان ان کے معبود ہیں!

مصائب میں گرفتار ہونے کے بعد خوف و حزن لو ازم قلب ہو جاتے ہیں۔ ان سے جب یہ کہا جاتا ہے

کہ اپنے سینے سے مقاصد کی نئی کرد اور قلب کی توجہ کو حق تعالیٰ پر مرکوز کرو، اپنے مصائب سے نظر

اٹھاؤ اور حق تعالیٰ پر اس کو قائم رکھو کہ یہی راحت جان کے حصول کا واحد طریقہ ہے۔

مکن رغبت یہ چیزے ورنہ حالت بے صفا گرد

بہ رغبت اُنچہ خواہی عاقبت برہان بلا گرد

بات تو ان کی سمجھ میں آتی ہے لیکن اس پر عمل ان کے لئے ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ

ناممکن نہیں، اس کا آسان طریقہ ہم بتا سکتے ہیں اور وہ یہ ہے: مصائب کے نزول کے وقت

تجربہ کی طور پر خدا کی طرف توجہ واقعی ابتدا میں شکل ہے۔ ایسے وقت قرآن کریم کی آیت پر توجہ مرکوز کی جاسکتی ہے۔ مثلاً اس آیت کو لیجئے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (اپنے رب کے حکم پر صبر کر کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)

اس آیت کے مفہوم کو سمجھ کر کہ حق تعالیٰ ہماری حالت سے واقف ہیں، ہم ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور جو خیر دست پر قربان ہو جاتا ہے وہ سب سے لے کر پیر تک جان ہی جان ہو جاتا ہے۔ ہم اس آیت کی تکرار کرتے جائیں تو ہمارا دل شوریہ رفتہ رفتہ ساکن و مطمئن ہوتا جاتا ہے اور روح کو بتدریج روشنی و فہم عطا کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہمیں یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے، اب بھی اور ایک گھوڑ سال بعد ہی!

مبتدی کے یہ بات گو سمجھ میں نہ آئے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہمارا کام نزولِ بلا کے وقت صرف اتنا ہے کہ قلب کو حق تعالیٰ سے مربوط کر لیں اور اس طریقہ سے سکینت و اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مصیبت خواہ کتنی ہی بڑی ہو، قلب کی سنبھال حاصل چیز ہے اکل ہیں سولی ہی دی جانے والی ہو ہمیں آج صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ قلب کی وسعتوں میں حق تعالیٰ کو گھیر لیں اور ان کے سوا کسی اور کی جگہ نہ چھوڑیں۔

در دل بجز کے شاید کہ بود درخسانہ اگر ہزارہ باشد شاید!
اس کا طریقہ ابتدا میں یہی ہے کہ کسی موزوں آیت پر توجہ کو پوری قوت سے مرکوز کر دیں ابتدا میں ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارا قلب گویا ایک مینا یا تارہ ہے جس میں شور و غوغا، جھج و پکانہ کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں اس سے بچ نکلتا ناممکن معلوم ہو گا لیکن اگر ہم آیت کریمہ کی تکرار کرتے جائیں تو رفتہ رفتہ شور میں کمی ہوتی جائے گی۔ ہمیں ہمت و استقلال سے کام لینا ہو گا کیونکہ جوں ہی خیال آیت پر چھٹنے لگے گا پھر مصیبت کا تصور ہمیں پریشان کرنے لگے گا اور ہمیں پھر شروع سے کوشش کرنی پڑے گی۔ ایسا معلوم ہو گا کہ گویا ہم ایک عمیق غار میں ہیں، جس کی تمام دیواریں چکنی اور پھسلنی ہیں، ہم اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پھسل کر نیچے گر رہے ہیں۔ گھری گھری پڑھ رہے ہیں اور

یاں بھپس کر گر رہے ہیں۔ بہر حال ہمت و استقامت کی آخر میں جیت ہوگی اور ہمیں معلوم ہوگا کہ توجہ آیت پر جم رہی ہے اور خدا کی طرف نظر اٹھ رہی ہے اور سکون و اطمینان کی ایک لہر باطن قلب سے سراٹھا رہی ہے۔

اس حالت یا مقام پر پہنچنے کے بعد ہماری تمنا صرف یہ ہوگی کہ حق تعالیٰ وہی کریں جس میں ہماری خیر ہو
 ما کار خود بسیار گرامی گزاشتیم گر زنده سازد ار کشد رائے درای دوست
 اور ہماری زبان سے بے اختیار نکلے گا اللہم خیر لی و اخلوق لی ولا تکلف لی الی اختیار
 رسول کریمؐ نے ہمیں یہ دعا سکھلائی ہے کہ اللہم لا تکلف لی نفسی طرفہ عین او اقل من
 ذلك "موتی ہیں ایک لحظہ کے لئے یا اس سے بھی کم عرصہ کے لئے، ہمارے اپنے نفس اور اس کی تمناؤں
 کے حوالہ نہ کر۔" ہمیں اپنی تمناؤں کی تکمیل کی کوشش کے بجائے اور زندگی کے معاملات کو اپنی رکن
 کے مطابق سنوارنے کے بجائے رضائے حق کا طالب بن جانا چاہیے۔ احکام شریعت کی رعایت اور
 اخلاص و توجہ حق کا دوام ہی ہماری دولت ہے۔ ع

ایں دامتہ باش گو دگر ہج میباش!

تو چوں گوئی دیریں میداں بیندیش کجا تو ای رسید از کوشش خویش
 برو تسلیم چوں گان شو زمانے مگر یابی ز حال خود نشانے

بہت سے لوگ ایسے بھی نظر آئے جو زندگی کی کسی تکلیف کو دور کرنے کے لئے برسوں درد
 و رقت کے ساتھ دعائیں کرتے رہے۔ آخر میں تھک کر اور "میر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے" کہہ کر
 انہوں نے رضا یا عطا اختیار کیا۔ فوراً ہی ان کے حالات میں ایک ایسا تغیر پیدا ہوا جو ان کی آرزوؤں
 و تمناؤں سے بھی زیادہ بہتر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دعائیں مرضی حق کے مطابق نہ تھیں، اور
 انہوں نے کبھی قلب کی گہرائیوں سے نہیں کہا تھا۔

رضیت باللہ ربنا میں اللہ کی ربوبیت سے راضی ہوں۔

انہوں نے ربوبیت کے بوجھ کو اپنے ہی مکرور کا ندھوں پر اٹھالیا تھا اور اپنے کاموں کے خود رب

بن گئے تھے۔ اور جب بالآخر انہوں نے عسوس کیا کہ اس سے تو کام نہیں چلتا اور

من بدست دوست و ادم اختیار خویش را

کہہ کر انہوں نے توافقی یا تقیفا پر اپنے نفس کو آمادہ کر لیا اور

بگرہ اشہ ام مصلحت خویش بدو گر بکشید و در زندہ گنبد او داند

کہہ کر حضرت کریم سے تقاضا اچھوڑ کر حسن ظن سے کام لیتا شروع کر دیا تو ان کی ساری الجھنیں سلجھ

گئیں اسی لئے تو کسی عارف نے کہا تھا کہ

سالک را دو حال باید یکے سو خلق بے تکلف دیگرے ساختن بے تصرف۔ کما قیل

کمال عاشقی پروانہ دارد

کہ چیز از سو خلق پروانہ دارد

یعنی نہ کسی سے لڑنا ہے نہ جھگڑنا، ہیں صرف جانتا ہے، کائنات کے حوادث و مہم

واجب الوجود جل شانہ کے ارادہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے فعل سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ہمد

اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر ان حوادث کو اپنی مراد میں سمجھنا چاہیے اور ان سے

لذت حاصل کرنی چاہیے، اگر بندگی ہے تو یہ نسبت ضرور پیدا کرنی چاہیے۔ ورنہ زندگی سے پاؤں نکالتا اور

اپنے مولیٰ جل شانہ سے مقابلہ کرتا ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے:

مَنْ لَمْ يَرْضَ بِقَضَائِيْ وَلَمْ يَصْبِرْ عَلٰی

بِلَادِيْ فَلْيَطْلُبْ رِبَا سَوَائِيْ وَيَخْرُجْ

مِنْ تَحْتِ سَمَائِيْ ۝

جو میری قضا سے راضی نہیں اور میری آواز سے صبر

تہیں کرنا وہ میرے سوا کسی اور تہیہ کو پتلا کرے اور

میرے آسمان کے نیچے سے نکل جائے۔

ہماری زندگی ایک روحانی کائنات میں بسر ہو رہی ہے، روحانی قوانین کے یہ زیر تصرف و حکمرانی ہے،

روحانی قوتیں اس کو چلا رہی ہیں! تمام حوادث حق تعالیٰ ہی کے فعل سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ہر تجربہ میں

حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں۔ صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر، نظر

لے مکتوبات مجددانہ تالیف ج ۱، مکتوب ۵۹

ان کے نقل پر جا کر قلب کو ساکن و مطمئن رکھیں اور لائق دید سے غفلت نہ رہیں۔ غم و الم پر دل و نفس سے بے رغبتی کرنے، ہمارے اہلکے کو ادا دہی میں تبدیل کرنے ہیں۔ ان تخیلوں کا مقصد ہمارے قلب سے ساری تخیلوں کو دور کرنا ہے۔ اس کا ذکر یوسف عاشق شیبانی نے الفاظ میں منقولاً کیا ہے:

من ترا غمگینا دہم کریبان کنم تاکتہد چشم بلیت نہبان کنم
 لہاں نحوث نم کہ مکروہ نہی بلکہ تاگیری و ذوق پاشنی
 زان حدیث تلخ می گویم ترا تا ز تخیہا فرو شویم ترا
 و ز تلخی بچوں ہر پیرہنوں شوی پس ز تخیہا ہمہ بیرون شوی

اس ساری گفتگو کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھ لے کہ ہمیں اپنے فرائض زندگی کی ادائیگی میں جدوجہد نہیں کرنی چاہیے، تسلی کی زندگی بسر کرنی چاہیے، نہیں، یہاں تسلی حرام ہے، اللہ تعالیٰ حرام نہیں مروانہ طور پر اٹھانا چاہیے۔ زندگی کے تمام فرائض کو جو اتار دینا متعلق ہے ادا کرنا چاہیے۔

شیر شو شیرانہ در صحرانے شیرانے پاستے نہ

مرد شو مروانہ پسند تا صحاں یا گوش گیر

یہی عبادت زندگی بسر کرنی چاہیے۔ لیکن اسی دوران میں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں کچھ وقت پر صحیح مقام تک پہنچانا چاہیے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کچھ ایسے ہی بل کر کام کر رہے ہیں کہ انکا نتیجہ غیر مطلوبہ پراپتا ہو رہا ہے، عساف طور پر نظر آتے گت ہے کہ من قولی کا درست کرم ہادی رہی کر رہا ہے، وہ حالت میں ترتیب و تقاضا پیدا کر رہے ہیں، غلظت کی گئی تر رہتا جاتا ہے اس حالت میں ہم عقل و دانش کے پرستانوں سے مخاطب ہوا کرتے ہیں:

دل اندر زلف لیلیٰ بند و کار از عقل مجنون کن

کہ عاشق را زبالہ دارد مقالات غصہ تری

قل خو طر من امانہ و نیکو و کنت استعانون من سوتی منہ اول تھوین (ک۔)

قرآن اور علاجِ حُزن

بے غلٹہمازیستن نازیستن باید آتش در تہ پاز بیستن
 لیستن اس گونہ تقدیر خودی است از ہمیں تقدیر تعمیر خودی است (اقبال)

ابتلا دیا آزمائش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلا ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزوں کے روک لیے جانے یا فنا کر دیے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول میں مشکلات کے پیدا ہونے سے، غلٹہ سے، درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار پٹو سے یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہ خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے، اور ابتلا کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی تنگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص عام رشتوں اور راجتوں کا نزول ہوتا ہے اور جو شخص ابتلا سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و ذہنی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور نادانستہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہیں چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہیں چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ

دوام باز سوزِ نا تمام است چو باہی جز تہش بر ما حرام است
 محمد ساحل کہ در آغوش ساحل تہید یک دم در گد دوام است (اقبال)

اپنے اس دعوے کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لیے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں، اور کائناتِ فطرتِ انسانی کے چند کلی و جزوی قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔

یک تنقیہ نارغ می باید کرد؛

انسان، احتیاج کا دو سلا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقیدی سے احتیاج

پیدا ہوتی ہے یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ حاجتمند ہے، فقیر ہے، اور دردتجویہی ماسی
 فقر و احتیاج کا، اور فطری طور پر وہ اس درد کی دعا چاہتا ہے۔

عالم ہمہ در دست و دعا میخوابد از خوانِ کرم برگ و لورا میخوابد
 کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویشِ غذا شہ آشہا میخوابد (صحابی استرآبادی)

اب اس عالم اسبابِ دُئل میں جس کی تشبیہ ابھار سے دی جاسکتی ہے، مجاہدہ اور عمل
 ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کیے جاسکتے ہیں، جو اپنی بنیاد و اساس کے طور
 پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل سے علوحدہ ہو کر نافع نہیں
 ہو سکتا، اس لیے ہم انہیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوے
 کی تائید کرینگے۔

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے کہ درد و غم، سوز و الم اس کی
 ماہیت میں داخل ہیں، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایقان
 ہے کہ کائنات کا مبدی حق تعالیٰ ہیں جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہیں، وہی اس کائنات
 پر حکمراں ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت انہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہذا یہ کائنات منظر ہے خیر و
 حکمت کا، پھر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اور ہر زندگی میں انسان جو جلتا
 رہتا ہے، اس میں کوئی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا نمایاں پہلو ہے؟ ان ہی واقفانِ راز کا بیان
 ہے، کہ اہل ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے۔ اس کی توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش
 کی جاسکتی ہے۔

(۱) درد و غم، سوز و الم تجویہ ہے، جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا، بخاکِ خلاق اور ان
 سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآن حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے:-

مَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا
 كَسَبْتُمْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ

تم کو جو کچھ مصیبت پہنچی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں
 کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو

کثیر۔ (پ ۲۵۶) درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

أَوْلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ
مِثْلَهَا قُلْتُمْ أَلَيْ هَذَا أَقْلُ هَوَمِينَ
عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ۗ

اور جن وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس سے دو
چند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی، آپ فرمائیے
کہ یہ تکلیف تم کو تمہاری طرف سے پہنچی۔

ماخبط کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ اِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ
عَلَيْكُمْ يَوْمَ تَمَّا سَيُحْشَرُ فِيهَا أَعْمَالُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ
وصوفیک اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ

إِنَّ جَمِيعَ الْوُجُودِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ مِنَ الْأَعْمَالِ فَانظُرُوا كَيْفَ تَكُونُونَ
فَإِنَّ الظِّلَّ تَابِعٌ لِلشَّائِخِ فِي الْعُجْبِ وَالِاسْتِقَامَةِ (شیخ ابوالنجاہ)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسا ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے، اس لیے ذرا اپنے اعمال پر
نظر رکھنا، کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی
ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہوگا جس نے توقع کی ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا
ہو تو اس نے محال کی تمنا کی۔ مَنْ طَلَبَ اسْتِقَامَةَ الظِّلِّ مَعَ عُجْبِ الشَّائِخِ فَقَدْ سَرَّاهُ
المَحَالَّ۔ اس لیے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھٹکے جا رہے نتیجہ
ہے تمہارے ہی اعمال بدکا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ
تکلیف سے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے، تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت
کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے
کہ فوراً یاد نہ آئے، لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز
تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائیگا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار

لَا تَمَاسِي أَعْمَالِكُمْ أَحْصِيهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَيُحْسِنُ لِلَّذِينَ وَجَدَ غَيْرًا فَلَا يَلُومَنَّ الْآخَرَ

سے کام لیا جائے اور دیانتِ فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے کہ اللہم علی لا علیہم ملامت چھپ رہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن میری ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں ۶

زادہ طبع من اندر آنا نہ خصمان من اندر (خاقانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگیگا کہ اعدیٰ عدوک نفسک التي بین جنیباک تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے ذنوب پہلوؤں میں ہے! دردِ عالم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے، یدلک کسبتا و فوک نغزیہ جو مصیبت و آفت، درد و غم و گناہوں کی عقوقیت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے کہ انسان نزولِ بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بکس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جنوع و فرع کرتا ہے، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، مقامِ شکوئیٰ میں داخل ہو جاتا ہے، اور مقامِ صبر سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہام باطل سے تحلیل کرے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے، ظلمتوں سے نکل جائے، غم و الم کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائیں گی، اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگیگا۔

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں ان کا وجود اس پر اسرارِ کائنات میں بے معنی نہیں، بشرِ محض نہیں، یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لیجانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں

لہ قول شیخ اکبر۔ تیرے ہاتھوں نے کمایا، اور تیرے منہ نے پھونکا،

کہو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کے لیے ضروری ہیں، اقبل نے اسی مفہوم کو یوں لدا کیا ہے
 جہانِ ماکر جز انگارہ نیست ایسا انقلابِ صبح و شام است
 ز سوانِ قضا ہوارِ گرد ہنوز این پیکر گلِ ناتمام است
 سوانِ قضا پیکرِ خاکی کے نقص و تحدید کو، کجی و خامی کو غمِ عالم کے انگارہ سے دور کرتا
 جالت ہے، اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لیتا ہے!

(۲) بعض دفعہ دردِ عالم، سوز و غمِ معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں قائم کیے جاتے،
 مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکفیر و تھیں ہوتی ہے، شہوتوں اور لذتوں
 کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوجِ عالمی کی مخالفتوں سے قلبِ مردہ ہو جاتا ہے،
 درد و غم، سوز و غمِ نفس سے ظلمتوں کو رفع کرتے ہیں، مردہ قلب کو چلاتے جگاتے ہیں، حق تعالیٰ کی
 طرف اس کا رخ پھیرتے ہیں، جو نورِ مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رخ کر کے نورانی ہو جاتا ہے، اور
 گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا، ہر تھیل
 دوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان
 سے جڑ جاتا ہے، ارتباط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ موثر تطہیر کے لیے کوئی اور شے نہیں، اور بلا
 آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر۔

ایں بلا کے دوست تطہیرِ شام است (دک)

ہی مقصود کو پیش نظر رکھ کر علامتِ روم درد و غم (یعنی) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں،
 اور اس کو سالک کے لیے مفید قرار دیتے ہیں۔

چونکہ قبضِ اند تو درستی بسطیں تازہ باش و چینِ بطنِ جوہیں
 چونکہ قبضے آیت کے ماہد تین صلحِ ملت آئیں دلِ مشو

اس خیال سے صوفیائے کرام نے بلا و مصیبت کو حق کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے۔
 انعامِ محبوب با انعامِ محبوب، بلہی عطا ہے، اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است و

از عطا مال بدن خطا است

کے ز آزار تو بیزار شود جان حسین زخم چوں از تورسد باہمہ آزار خوشم
بلا و غم حیب تکفیر و تمحیص کے لیے آتے ہیں تو اس کی صفات علامت یہی ہے کہ مبتلا ہونے پر غم و غصہ
نہیں کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور ہمسایوں کے سامنے اپنی مصیبت پیش
کر کے شکوئی و شکایت نہیں کرتا، صبر کر کے بے حساب اجر کا امیدوار رہتا ہے۔

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لیے بھی نہیں آتی بلکہ ارتقاع درجہ
اور بلوغ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے، جنہوں
نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصغی ہیں، جن میں ربط حق قائم ہے، دیکھا
جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، چنانچہ 'الْبَلَاءُ لِلْوَالِدِ الْأَوْسَطِ' لادوستوں کے لیے
ہوتی ہے، مشہور خاص و عام بھی ہے، اس قانون کو رازدانِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں
بیان فرمایا ہے۔ اذ احب اللہ عبداً ابتلاہ فان صبرا اجتباہ وان رضی اصطفاہ یعنی
جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے
تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں، اور اگر راضی ہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لیے حضرت
معروفؑ فرمایا کرتے تھے:

لیس بصادق فی دعواہ من لہم جو اپنے مولا کی بار سے لذت نہیں لیتا وہ سچا غلام

یتلذذ بضر ب مولاہ۔۔۔ ہی نہیں!

اس مفہوم کو کسی عاشق نے ان سریلیں لکھیں ہیں اور لکھا ہے:-

جان طلب آرزو کردم از دو و اطلب گفت اگر تو عاشقی صبر کن و در صفا طلب

یار ہے کہ بر نمرت تیغ زند تو دم مزین سرفیاض یار کن ایچ نہ خون بہا طلب

محب سے مراد یار شوتا شود او بہ کام تو با

قابل التفات نیست عاشق مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضادات و قابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ منازلِ عالیہ تک رسائی کے لیے درد و غم لاپرواہی و لازمی ہے۔ تصدق جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، درد و الم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیت کیسے ہے، نفس کی تحدیدات سے رہائی پر دائم اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہیں، صفاتِ حسنہ کا پیدا کرنا مشقتوں کا برداشت کرنا ہی، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں تو انسان تمغہ محسوس کرنے لگتا اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد و غم کو وہ فطرۃً گروہ سمجھتا ہے، لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے کہ

عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُۤ اٰیٰتًا لِّمَنْ يَّشَاءُ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيۡمٌۭ عَلِيۡمٌ
فِيۡهِ خَيْرٌۭ لِّمَنْ يَّشَاءُ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيۡمٌۭ عَلِيۡمٌ

اس میں خیر کثیر رکھی ہوا

اولیاء پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لیے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ انہیں اپنا قرب عطا کرتے ہیں، فقر و نیستی میں انہیں مبتلا کرتے ہیں، درد و حزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کثر من کنوز الجنۃ لا یصلی الا باولیاءک۔
عشاقِ ملاکی اہمیت و قیمت سے واقف ہوتے ہیں مستانہ دار وہ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ:

دردہ قدح درد کہ آن می باید

تلخ مست عجب لیک سے خوشگوار است

کبھی وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ

بفقر و نیستی یک دور درہ خوش می باش

کہ یار خود ز کرم عذر خواہ ما میگرد

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر ہر توستے جانان

کی وجہ سے ہی، تن اگر تکلیف میں ہو، لیکن جان جاناں کے مرا کے مطابق ہو اور اس کے جہاں سے
کیف لغوز، تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت! اسی لیے بلا میں یہ عوام کا لانعام کے خلاف:
(۱) کسی غیر کے آگے شاکہ نہیں ہوتے، اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے
کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْفَرُوْا عَنكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔

ستم گشاں محبت دم از فغاں بستند گزہ ز جبہ کشادند و بر نیاں بستند
(۲) اپنے باطن میں اتہام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمت بالغہ میں انہیں کوئی
شک نہیں ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہیں۔

بادرد بساز ہوں دولے تو نم در کس منکر کہ آتشکے تو نم
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی شکرانہ بدہ کہ خون بہا تو نم
(۳) انہیں یقین کامل ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لیے اختیار کی وہی ان
کے لیے دین و دنیا میں اچھی ہے۔ ۶

صلا ح ما ہم آفت کاں تراست صلا ح

”حدیث الولی“ میں اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس
کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ
تو نگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صانع نہیں کر سکتی، اگر میں اس کو فقیر کر دوں تو یہ
فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا
کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اس کو غنی کر دوں تو غنا اس کے ایمان کو فاسد کر دے
اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی
اگر میں اس کو بیمار کر دوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے
کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اس کو تندرست
رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے، مجھے اپنے بندوں کے احوال سے

پوری آگاہی ہے، اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں۔
 حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسن تدبیر، تضاد و اختیار
 سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں، اور ہر حال میں رضا بالعطارد اور حفظ حال "ضروری سمجھتے
 ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ۶

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہیں، اسی لیے گو وہ "طبعی" غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن "عقلی سرور"
 سے ان کے قلب خالی نہیں ہوتے! یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "صندوں کی جمع کا یہ منہ"
 ان ہی کو آتا ہے! رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ہر عالم ہمہ درداست و دوامی خواہد
 یہ درد یا تو گناہوں اور بدکرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لیے وارد ہوتا ہے، یا رفع
 درجات کے واسطے فائدہ کیا جاتا ہے، ہر حال

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ﴿۲۰﴾ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔

کے کلی قانون کا کوئی استثناء نہیں دکھائی دیتا، انسان کی سناری عمر محنت اور دکھ، غم و اندوہ
 میں گزرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بیقرار کے ماتھے ہے جس کی آہستہ
 ہی میں بیچ و تاب ہے۔ چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے۔

چہ پرسی از کجا ہم چہستم من؟ خود چہیدہ ام تازہستم من

دریں دریا چو موج بیعت برآم اگر بخورد نہ بچم بیستم من

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا وہ درد و غم، سوز و الم ہے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت
 کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوت حیات کی توفیر ہے، اسی مقصد کو پیش
 نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس
 کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ کر

عارفِ رومی نے سرایا تھا۔

چوں بدانتی کہ نسیل کیستی
 فارغی گرمی و گر زیستی
 قطرہ نوری سراپا نور باش
 بگذرا ز غم و ایشام سرور باش

فانهم و تدابرا

زندگی میں غم کیوں آتا؟

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بارہویں اجلاس ۱۹۶۷ء

میں پڑھا گیا تھا۔

اگر غم زاپوا آتش دود بوسے جہاں تار یک بوسے جاودانہ

دریں گیتی سرا سر گر بہ گردی خرد مندے نیابی شادمانہ (شہید مجلی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سر تا پا احتیاج ہے، لہذا انسان غم کا پتلا ہے۔ لَقَدْ

خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ۔ رفع احتیاج ہی کے لیے وہ شب و روز حیران و سرگرداں رہتا

ہے، تمام اسباب و علل کو کام میں لائے، درد کی دوا چاہتا ہے، احتیاج کا سلسلہ لاتنا ہی

ہوتا ہے۔ ایک احتیاج کی تسلی ہوتی ہے، تو دوس دوسری پیدا ہو جاتی ہیں بلکہ غم و الم برابر

جاری رہتا ہے، لہذا کلیتہً یہ قرار پاتا ہے :-

عالم ہمہ دردست و دوا میخواید از خوانِ کرم برگِ نوا میخواید

کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویشِ غذا شہہ اشہتا میخواید (سحابی استرابادی)

اس کلیتہً کا استثناء الشاذ کا معدوم کا حکم رکھتا ہے۔ جس کسی سے پوچھیے "میانِ دل چسپیت"

جواب ملیگا، "درونِ سینہ سوزے و تپے؟ اگر پوچھا جائے "تن چسپیت" کہیگا، "غم ورنج

و بلا را ہرنے" کسی اور سوال کا استعارے کے بغیر خود کہہ اٹھیگا، القصد بہ قصدِ جاں مابستہ صغے

مرگ از طرفے و زندگی از طرفے۔

دل چسپیت! درونِ سینہ سوزے و تپے تن چسپیت! غم ورنج و بلا را ہرنے

لے معارف میں جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

القصد بقصد جان، ما بستہ صفی مرگ از طرفی و زندگی از طرفی (رومن نوری)
 مرضِ غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کلیتہً بھی مسلمہ ہے، کہ ہر مرض
 کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہے، کچھ دیر کے لیے آپ میرے ساتھ
 چند نسخوں پر غور کیجیے، ایک زمانہ سے میں نے ان کا اپنی ذات کے لیے اور دوسروں کے
 لیے بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، میں پورا نہ نصیحت کے لیے نہیں کھڑا ہوں چند
 اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقل روشن کو متوجہ کرونگا، اگر یہ اصول آپ کی سمجھ میں
 آجائیں اور آپ ان کے استعمال پر راضی ہو جائیں تو شفا یابی یقین درہ تضرع اوقات کی معافی
 کا خواستگار ہوں غم کا جہتی یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہے، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات سے
 ہوتی ہے۔ اس علاج کے مختلف اجزاء ہیں، پہلا جزو:

(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین: اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں (اور اسی صورت
 میں میرا آپ سے روئے خطاب ہے) تو آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ خدا ہمہ خیر ہے، خیر مطلق ہے،
 خیر محض ہے، نیز وہ ہمہ توان یا قادر مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے کہ ہر شے کا صدور خدا سے
 ہوتا ہے، زندگی کا صدور خدا ہے، اس لیے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے، اگر معاذ
 اللہ خدا خیر محض نہ ہوتا تو اس سے شر کا صدور ممکن تھا یا اگر خیر مطلق ہونے کے باوجود قادر
 مطلق نہ ہوتا تو سمجھا جاسکتا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے میں مجبور ہے، لیکن خدا کو خیر مطلق و قادر
 مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے، نہ نقل کے، بتائے
 مقدمات کے صحیح مانتے کے بعد منطقی نتیجہ سے گریز کیسے ممکن ہے؟ اور مقدمات کی توثیق
 مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے، لہذا

ہر چینی محض خیر و حکمت است گر تراز و رحمت و کر رحمت است
 زانکہ ناپید عسل باطل از حکیم فعل حق باطل نباشد اے سلیم

یہ دلیل تو میں نے اہل عقل کے لیے دی ہے، اہل عشق جن کی صفت ”یومنون بالغیب“ ہے

مبدر کائنات کو خیر محض ملتے ہیں، اس کے گرویدہ ہوتے ہیں (اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ) اور زندگی کے خیر پونے کا انہیں راسخ یقین ہوتا ہے۔ علاجِ غم کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کریں کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے، زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتیجے اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی "اشدستی" و خود گزینی کی وجہ سے آپ بیک وقت جنتِ قنوطیت، یا اس، غم و اندوہ کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے! اس معاملہ میں "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لیے رنج و الم میں گرفتار رکھیں گی، اقبال کی تہدید بھول نہ جائیے!

سُن لے تہذیبِ حاضر کے گرفتار غلامی سے برہنہ بے یقینی
جب ہم بے یقین کر لیں کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہیں، اور ہمیں ان سے خوشی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور پھر خوشی کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہیں، شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے، مذہبی زندگی کے تجربات کا جو میں آپ پر فاش کر رہا ہوں!

محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے، بلکہ مسلمہ نفسیاتی اصول پر اس کی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار میں تغیر پیدا کرتے ہیں، قنوط و یاس خوف و حزن پیدا کرتے ہیں، اور یہ وہ سلبی جذبات ہیں جو قوائے عملی کو مفلوج بناتے ہیں، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہوں تو سیرت اور قسمت کے سیر و ہونے میں بالی کیا رہتا ہے، کیونکہ نفس کا یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقامِ عمل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اعمال عادات کا یقین کرتے ہیں، عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے اور سیرت ہی تو قسمت ہے، انسان کی زندگی میں وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے، جب اس کو اس امر کی یافت

ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا ہے اس کی ذات ہی میں اس کے آلام کے اسباب پنہاں ہیں اور وہیں راحت و شادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے؛ آفتاب کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھہرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بے وقوفی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اس کی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے اور خدا ظالم بن کر لائق عبادت کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو لائق عبادت و استعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے، اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑیگی، اور اسی کو تمام مصائب و آلام کا مبدی قرار دینا پڑیگا۔ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنَ نَفْسِكَ۔

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد تم حیات کے ساتھ یقین کر لو کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی اور اس کے واقعات و تجربات اچھے، نقص، کجی، یا شر نہیں ہے، تو تمہاری ہی ذات میں ہے، مصائب کے نزول کے وقت قضا و قدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالفضل سے کام لو، اس احساس کو قلب میں نہ آنے دو کہ تم پر ظلم ہو رہا ہے، اور تم قابلِ رحم ہو، کیونکہ اس احساس کے ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگو گے، اور اپنے کو بے خطا و بے قصور قرار دو گے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے! اپنی ذات کو بے خطا و بے قصور سمجھنا جب کہ وہی تمام سور کا مبدی ہو، کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے، ایسی صورت میں کیا اصلاح نفس کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ کیا ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند نہیں ہو جاتا؟ جو شخص اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو، اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو۔ اپنی ہی تقدیر کی شکایت میں ہمیشہ مصروف رہتا ہو، اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے کہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی سے پتھر گرا دیا جائے تاکہ اس کو بھی نجات ملے اور دنیا بھی خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔ اقبال ایسے ہی بد بخت سے خطاب

جام تو فریادی بیدار و تنگ	اے زبور چرخ ناہنجار تنگ
سینہ کو پہلے سپیم تاکجا	نالہ و فریاد و ماتم تاکجا
لذتِ تخلیق قانونِ حیات	در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
شعلہ در بر کنِ خلیلِ آوازہ شو	خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو
ہست در میدانِ سپر انداختن	با جہانِ نامساعد ساختن
می شود جنگِ آزما با آسماں	گردہ سازد با مزاجِ او جہاں
میدہ ترکیبِ نو ذرات را	بر کند بنیاد موجودات را
روزگارِ نو کہ باشد سازگار	میکند از قوتِ خود آشکار
ہمچو مرواں جاں سپردنِ زندگی است	در جہاں نتوان گر مردانہ تر بیت

یقین کی اساس قائم ہونے کے بعد عمل کی مشید عمارت اٹھائی جانی چاہیے، اب تک ہم نے اس امر پر زور دیا کہ یقین درست کرنا چاہیے، یقین کہ زندگی اپنی چیز ہے، اور زندگی کے واقعات و تجربات اپنے ہیں، ان کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا، اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جس کو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جاسکتا ہے۔

(۲) عمل، سبذ غم احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو، اور ساری احتیاجات کو رفع کر سکے، عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی صورت میں غم و اندوہ سے متاثر نہ ہونے کا بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؛ بات بڑی آسان ہوتی اگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہو جاتیں، اور وہ محض صحت و راحت کی زندگی بسر کر سکتا، عمل کے دوسرے نتائج ہو سکتے ہیں کامیابی یا ناکامیابی، عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دنیا اپنا سر جھکاتی ہے، مجاہد خطرہ ہی کی زندگی کو حقیقی معنی میں زندگی سمجھتا ہے، اگر خواہی حیات اندر خطر زنی ناکامی سے یہ ایوس ہو

نالہ و فریاد، سینہ کو بی اور ماتم نہیں کرتا، کیوں؟ اس کے چند یقینات و عقائد میں ان ہی کی تحلیل سے علاجِ غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائیگی۔

جہادِ زندگی کو جہادِ اکبر سمجھتا ہے، دشمنوں سے جنگ اور میدانِ کارزار کا جہاد و قتال اس کے نزدیک جہادِ اصغر ہے۔ اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوگا اور باطل کو شکست ہوگی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لیے جہاد کرتا ہے اس لیے اس کو یقین ہے کہ خدا سے نصرت و تائید کا پانا اس کا حق ہے۔ **كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ** اس وعدہ اور یقین کی وجہ سے "احساسِ کمتری" یک نخت اس سے مفقود ہو جاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابلِ مدافعت قوت کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام حول و قوت من اللہ ہے، لا حول ولا قوۃ الا باللہ! وہ صرف اللہ ہی کو عامل اور موثرِ حقیقی سمجھتا ہے، اور خود کو امین و خلیفہ، قوت و اثر و حرکت میں وہ اللہ ہی سے استعانت کرتا ہے، اور اسی کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتا ہے، ذل و افتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت و استعانت میں وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے، اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، یعنی نہ مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے، اور نہ ان کے سامنے سرِ نیاز جھکا رہتا ہے کفی باللہ وکیلا اس کا ماننا ہے، فاتخذ وہ وکیلا اس کا اصولِ عمل **قُلِ اللّٰهُ كُفُوٌّ ذُرِّيَّتِهِمْ** اس کا طریقہ کار جسبے اللہ اس کا راحتِ جان کلمہ، ایک لفظ میں وہ موجد ہوتا ہے، اور لا الہ الا اللہ کا قائل و مصدق و عامل۔

اس یقین و عقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں، کامیابی یا ناکامیابی، کامیابی میں وہ شکر کرتا ہے، کیونکہ وہ اس راز سے واقف ہے جو ایک مسلمہ تقیاتی اصول پر مبنی ہے کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قوتِ عمل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور تسخیرِ کائنات آسان ہو جاتی ہے۔ **لَئِنْ شَكَرْتُمْ** اور **زِيدَنَّ كُفْرًا** کا قطعی وعدہ اس کو سرور کرتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا

اور خلق کی طرف اس کی نسبت نہیں کرتا، گو خلق ہی کے ہاتھ سے نعمت ملتی ہے، لیکن بعض بمنزلہ اسباب و آلات و ادواتِ نعمت ہوتے ہیں، قائم و مجری و موجد و فاعل و مسبب صرف اللہ ہی ہوتا ہے، اس لیے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمہیں تمہارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے تو تمہاری نظر اس خادم کی طرف نہیں جاتی جو یہ ہدیہ تمہارے یہاں لے کر آیا ہے، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گزار ہوتے ہو، جس نے تمہیں یہ بھیجا ہے۔ منعم حقیقی اللہ ہے العاطی اللہ۔ وَمَا يَكْفُرُ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ اس ادراک سے نعمت زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہے، جس کو بصیرت محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس راز کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے :

النعمۃ وحشی فقید ما بالشکر نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کا بندھو۔
تفسیر ہے باری تعالیٰ کے اس قول کی کہ لَنْ شَكَرْتُمْ اَنْزَلْنَا نَكْمًا۔

موجد جب اپنی جدوجہد میں ناکام ہوتا ہے تو ریاس و حزن، خوف و الم کا شکار نہیں ہو جاتا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے واقف ہوتا ہے جو دفعِ غم کے لیے اکسیر ہے، اور جس کو بصیرت محمدیہ نے دریافت کیا ہے، وہ کیا ہے؟ یہی کہ بلاؤں پر صبر کر کے سے بلائیں نعمتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، ذرا نفسیاتی نقطہ نظر سے اس قانون پر غور کرو، مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کوئی اور پہلو ذہن اختیار بھی کر سکتا ہے؟ حزن و ریاس سے تو اسے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں، مصیبت کے مقابلے اور برداشت کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تردد و فکر بھی عمل کے قاتل ہیں، تشنّت اور پریشانی کو بڑھاتے ہیں، گنگہ و شکوہ تو نامردی کی صریح علامت ہے، "کلبیت" استہزاد و استخفافِ غم کی دار و نہیں، بلاؤں کے نزول کے وقت جب انسان حق تعالیٰ کی گزشتہ عطاؤں کو یاد کر کے صبر کر لیتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت کر لیتے ہیں، مستغنی کر دیتے ہیں، اب بارِ غم سبک ہو جاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ انہی بلاؤں میں عطاؤں کو پاتا ہے۔

خود بلا و ابتلا کی ماہیت کے متعلق مجاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، یہ ہمارے کسی نہ کسی نقص کو رفع کرتی ہے، اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں خشکی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے اور درجات میں ترقی دیتی ہے، یہ بظاہر شر ہے، لیکن دراصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعات زندگی کے ذریعہ معلوم حقیقی ہیں ہر روز سبق دے رہا ہے، اگر ہم میں عقل ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی میں ایک حکمت ہے اور ایک خاص عظمت، سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دنیا کی کوئی اور شے ہمیں نہ یہ درس حکمت دے سکتی ہے اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کر سکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے ایک اہم سبق سکھاتی ہے، اگر تم اس کی تحقیق کرو اور جو شخص کہ اس شے میں جو بظاہر شر معلوم ہوتی ہے، خیر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ واقعات کا محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کے لیے ایک صبارِ فنا مرکب ہے جو اس کو بہترین کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

بلا کی شدت اگر کہیں بالکل ہی مغلوب کر لے، اور اس کے خیر اور فائدہ کے جزر سے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھے تو پھر نہیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملیگا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی کریگا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومن صابر کے حق میں وارد ہوتی ہیں، اگر تم میں ایمان ہے اور ایمان کا ذوق بھی موجود ہے، تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہو جائیگا، صابرِ خدا کا محبوب ہونا ہے **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ**۔ درد مند صابرِ خدا کی معیت کا ادراک کرتا ہے، کیونکہ **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ**، اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد و غم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چھین کو کم کر دیتا ہے، اور واسطہ پر حکم **رَبِّكَ يَا غَافِرًا** کا حکم اور بشارت تو اس کو نقص میں لے آئے کہ لیے کافی ہے! مشہور ہے کہ کسی عاشق پر میرا دارِ شانوںے تازیانے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی، جب سوائے تازیانے لگا، تو اس نے آہ کرنی شروع کی، پوچھا گیا کہ اس آخری تازیانے پر آہ و بکا کیسی؟ کہا جس کے

سبب مارکھائی ہے، وہ ننانوے تازیانوں تک یہاں نماشاہوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لیے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اس وقت میں نے درد محسوس کیا! ۵

بازد بسا زچوں دولے تو منم در کس منگرگ آشنکے تو منم
گر بر سر کوئے عشق باکشتہ شوی شکرانہ بده کہ خوئے بہا تو منم (جامی)

صبر پر استقامت پیدا ہو جائے تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر درد محسوس کرنے لگتا ہے، کہ بلا از دوست عطا است و از عطا نالیدن خطا است، البلاء کثر من کنوز الجنة لا یعطی الا باولیائہ کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب یہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے، اور نہ جزع و فرح کا،

ستم کشان محبت دم از قفاں بستند گرہ رجبہ کشاند بر زبان بستند
سج سے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تقویٰ ہے اس کے سوا کچھ نہیں ۵
تسلیم منی شوی از ان غم گینی تسلیم شو ہر آنچه آید پیشیت
رضا با العطا اور حفظِ حال سے نہ صرف غم ہی دور ہو جاتا ہے اور فرح و سرور کے درونے کھل جاتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ بھی قطعی راضی ہو جاتے ہیں، اور جانتے ہو کہ ان کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟

آنا نکر رضا حق بجاں میجویند در را و رضا کے اولسری پویند
ہر یک ہمہ آن کند کہ حق فرماید حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

قال علیہ السلام ان الله رجا لا یرضی برضاہم و یغضب بغضبہم کما انہم یرضوا
برضاہم و یغضبوا بغضبہم

ہر چہ خواہی آن کند گر چہ خواہی کنی
انچہ گوئی بشنود گر چہ گفت او بشنوی

اے درد! تو بھی کیا نعمت ہے، تیری برداشت نے مجھے کیا سکھایا!

دردہ قدح درد کہ آن می باید

دردیکہ ز قست بیشتر می باید

تخت عجب لیک بس خوش خوار است

ہر چند ہی خرم دگر می باید

قرآن اور علاج غضب

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۶۲ء میں پڑھا گیا۔

تا بتوانی خستہ گرداں کس را بر آتش خشم زوش مستان کس را

گر راست جاوداں طمع میداری می رنج همیشه و مرخاں کس را (عطار)

انسان کی مادی و روحانی ترقی میں جو شے سب سے زیادہ مانع و مزاحم نظر آتی ہے

وہ جذبہ غضب ہے اس آتش فشاں جذبہ کے اشتعال کے وقت انسان انسان نظر

نہیں آتا، بلکہ وہ ایک سمیٹ نار کا منظر پیش کرتا ہے جو دغائی آگ سے پڑے، جس میں

سوائے خوفناک آوازوں اور جاں سوز چنگاریوں کے کچھ نہیں نکلتا، اسی لیے اہل غضب

پنا نسب شیطان سے ملاتے ہیں کیونکہ اسی نے تو کہا تھا کہ حَلَقَتِنِي مِنْ نَارٍ۔

خبر اچھیں تندی و سگر کشی نہ پندارم از خاک از آتشی!

ایک غضبناک شخص کو اعصابی تناؤ کی حالت میں دیکھ کر حضرت حسن نے خوب فرمایا

تھا کہ ایسے شخص کو غصہ میں اتنا اچھلتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اب کی اچھال میں تو دو درخ

میں جا پڑیگا۔ اس قابل نفرت جذبہ کے تسلط کے وقت انسان کی صورت پاگل یا درندہ

کی سی ہو جاتی ہے، دماغ اور اعصاب سیاہ دغانات سے بھر جاتے ہیں، نور عقل تاریک

ہو جاتا ہے، خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے، دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس تاریکی میں اس

کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی دوستی اور محبت کے پاک رشتے، قرابت اور رحم کے مقدس

نار عزت و حرمت کے قیمتی روابط ایک ہی ضرب میں پاس پاس کر دیے جاتے ہیں،

یہ معارف فروری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

تند خو کا دنیا میں کوئی دوست نہیں، پاگل اور مجنوں کا کوئی دوست کیسے ہو سکتا ہے، اس کی قسمت میں سوزش و تپش لکھی ہوتی ہے، اسی سوز و غم کی وجہ سے وہ اطمینانِ قلب اور طمانیتِ خاطر سے محروم ہوتا ہے، اور جب قلب مطمئن نہ ہو تو بدن کیسے تندرست رہ سکتا ہے، اس جہاں فانی میں شاداں زندگی کے نسخے کے یہی دو اجزاء تو ہیں، صبح و تندرست بدن اور مطمئن و آزاد ذہن تندخو ان دونوں سے محروم! اس کی سیاہ بختی و سیاہ روئی میں کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے، اب سوز و تپش، غم و ہم، رنج و حزن کے سوا اس کے ہاں ذخیرہ کس چیز کا ہوتا ہے؟

سوز و تپش بقسمت ہر تندخو بخورد برق از زبان حال مراجعہ جستہ گفت
 غم و غضب کا جذبہ ہر بڑائی کی کنجی ہے، (حضرت جعفر صادقؑ) یوقوفی کی جڑ ہے، مسرت و شاداںی کا قاتل ہے، ایمان سوز ہے، اور طمانیت کش، اسی لیے جب بنی نوع انسان کے عمن اعظم آنحضرت صلعم (فداہ ابی و امی) سے کسی نے درخواست کی کہ مجھے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے ذرا ساعل بتلا دیجیے، تو آپ نے فرمایا لا تغضب یعنی تو غصہ نہ کر، جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو یہی جواب دیا گیا، اور تیسرے مرتبہ کے سوال کا بھی یہی جواب ملا، کسی دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کسی گھونٹ کا پینا اس قدر محبوب نہیں جس قدر کہ پی جانا غصہ کا۔

قرآن کریم نے الْكَافِرِينَ الْغَيْظَ وَالْعَاقِبِينَ عَنِ النَّاسِ کی تعریف کی ہے، اور ان کے اتباع کی تخریص و تاکید۔

کیا اس خونخوار جانستاں جذبہ سے نجات ممکن ہے؟ علمائے نفسیات کا کیا خیال ہے؟
 قرآن کریم نے کیا طریقے تعلیم کیے ہیں؟ کیا علم کی تصحیح عمل میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ریاضت و عبادت و عبادت کو جو کر سکتا ہے! انہی چند اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے
 ہشدار کہ وہ خود بخود گم نہ گئی؟

سقراط نے ایک ازلی صداقت کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا تھا کہ نیک علم ہے "یعنی علم صحیح ہی سے نیک عمل پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ علم زبان ہی کی حد تک محدود نہ رہا ہو، بلکہ قلب میں بھی اترا ہو، تعین کے درجہ تک پہنچا ہو، جو شخص علم کو زبان ہی کی حد تک محدود رکھتا ہے۔ اس کو زبان سنت میں "علم باللسان" اور "جاہل بالقلب" کہا گیا ہے، اس کا شمار ان واعظوں میں ہوتا ہے جن کی شکایت حافظ نے اپنی اس مخلوق الذکر شعر میں کی ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب منبری کنند

چوں بخلوت میروند آن کار دیگر می کنند

علم صحیح بہر حال ضروری ہے، اور پھر اس کے مطابق عمل ہو تو فلاح انسان کے ہاتھ چوتی ہے، جذبہ غضب کی تعدیل کے لیے بھی یہ دونوں ضروری ہیں، اس لیے ہم یہاں ان ہی دو کے متعلق دو باتیں عرض کرتے ہیں:-

۱) علم صحیح :- یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسان کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے اور کسی چیز کو مبغوض و مکروہ، وہ محبوب چیز کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے، اور اس کے تحفظ کا خواہاں و مہتمم ہوتا ہے، اور مکروہ شے سے بھاگتا ہے، اور اس کو دفع کرنا چاہتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے، وہ اسی پر معمول ہوا ہے، جب اس کی مخالفت کی جاتی ہے تو اس کو غصہ آتا ہے، بذات خود غصہ بری چیز نہیں، یہ مدافعت کا آلہ ہے، تحفظ حیات کے لیے ضروری ہے، استمرار نسل کے لیے ناگزیر ہے، تنازع البقا میں اس کا خاص مقام ہے، اس کے بغیر ارتقا میں نسل انسانی کا بقا ممکن نہ تھا جس طرح کائنات خارجی میں عنصر آبی ضروری ہے اس کے عدم سے اختلال رونما ہوتا ہے، اسی طرح فطرت انسانی میں جذبہ غضب بھی ضروری ہے، اس کے فقدان سے تباہی پیدا ہوتی ہے، موت لازم آتی ہے، اب غضب کے تین درجے ہوتے ہیں:-

۱) تفریط: یعنی کمی، یہ بالاتفاق مذموم ہے، ایسے ہی آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے۔

امام شافعی نے کہا تھا کہ جس شخص کو غصہ دلاسنے سے بھی غصہ نہ آئے وہ "گدھا ہو" حمیت و غصہ کا بالکل نہ ہونا بھی سخت بُرا ہے، اگر کسی شخص کی بیوی اس کے ساتھ خیانت کیے فحش کا ارتکاب کرے، اور وہ علم سے کام لے تو بتاؤ کیا یہ عقلاً، شرعاً و عرفاً سخت مذموم نہیں! غصہ کا صحیح موقع پر استعمال ضروری ہے، حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کی صفت اشد علی الکفار قرار دی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جَاهِدِ الْكُفْرَ وَاللَّيْثِيْنَ وَأَعْلَظْ عَلَيْهِمْ، ظاہر ہے کہ شدت و غلظت غضب کے بعد رونما ہوتی ہے، لہذا قہر و لطف اندر محسوس خود نکوست جائے گل گل باش بنائے خار خار

(۲) افراط: یعنی زیادتی، یہ بھی بالاتفاق مذموم ہے، اسی سے نجات کے طریقوں پر یہاں غور کیا جا رہا ہے، جب غضب عقل و دین کی سیاست و قربانی سے نکل جاتا ہے تو انسان درندہ بن جاتا ہے، تمام دنیوی و روحانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے، جنون کا تسلط اس کے دماغ پر ہو جاتا ہے، اہل غضب کی فرست میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے، جن کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ ۶

سایہ جن میں یہ انسان رہا کرتے ہیں

(۳) اعتدال: یہ درجہ محمود ہے، یہاں انسان کا غصہ عقل کی قربانی میں ہوتا ہے، یونین کا مطیع ہونا ہے، اس کے اشارہ کا منتظر ہوتا ہے، جہاں حمیت شرعاً واجب ہوتی ہے وہاں وہ شدت سے کام لیتا ہے، اور جہاں اس کا پی جانا ضروری ہوتا ہے وہاں وہ حد و اعتدال سے نہیں بڑھتا، اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ایسے موقع پر ۶

ہرگز اسلام نیست او چو دست

ظاہر ہے کہ ہم یہاں غضب کے استیصال کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اس کے اعتدال کی ہم غنیمت ہیں، افراط و تفریط کو رفع کرنے کے وسط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، کہ خیر الامور اوسادہا۔

دیکھو غصہ کا کوئی معروض ضرور ہوتا ہے یعنی اس کا تعلق کسی شے سے ہوتا ہے، اب اس معروض کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔

(۱) ایک وہ جو سب کے لیے ضروری اور لازمی ہے جیسے غذا، لباس، مکان، صحت، جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے تو شعلہ غضب ان کے تحفظ کے لیے بھڑک اٹھتا ہے، حفاظت ذات و بقائے نسل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر جاندار اپنے دشمن کا مقابلہ کرے اور ضروریات زندگی کے تحفظ میں شدت و قوت کا استعمال کرے اور نہ وہ صفحہ ہستی ہی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیگا، اور یہ فطرت کا مقصود نہیں، مجاہدہ اور ریاضت سے اس قسم کے غصہ کو محو کرنا ممکن نہیں، اور نہ ہی اس کی کوشش ہی کرنی چاہیے، کیونکہ یہ خلافِ فطرت ہے، اور غیر اختیاری، غیر اختیاری شے پر حکم اخلاقی لگایا نہیں جاسکتا، ہاں یہاں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز، ظلم و ستم ناروا ہے اور تکلفِ علم و برداشت کرتے کرتے تحمل کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے۔

(۲) غصہ کے معروض کی دوسری قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں، جو بعض کے لیے تو ضروری ہیں، اور بعض کے لیے غیر ضروری جیسے صنّاع کے لیے آلات و اوزار اور عالم کے لیے کتابیں، اگر ان محبوب اشیاء کو نقصان پہنچتا ہے، تو رنج ہوتا ہے، اور نقصان پہنچانے والے پر غصہ آتا ہے اس قسم کے غصہ کا بھی بیخ دین سے استیصال نہیں کیا جاسکتا لیکن مجاہدہ سے غصہ کی شدت باطن میں باقی نہیں رہتی اور صبر کی خو پیدا ہو سکتی ہے، اور سختی صبر کا احساس کم ہو سکتا ہے۔

(۳) غصہ کے معروضات کی تیسری قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں، جو کسی کے لیے بھی ضروری نہیں، جیسے مال و جاہ، خدم و حشم یہ عادتِ محبوب ہیں، لیکن قطعاً داخلِ ضرورت نہیں، یعنی ضروریاتِ زندگی میں ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ "تعیّناتِ محض" میں شامل

۱۔ مقالہ سر اجیاء العلوم باب غضب۔

ہوتے ہیں، جو غیظ و غضب ان کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے وہ ریاضت و مجاہدہ سے قطعاً قابل استیصال ہے، ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق اسی قسم سے پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم غصہ کی نفسیات پر غور کر کے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا انبعاث محبوبہ اشیاء کے فقدان یا ضیاع سے ہوتا ہے، تو ہمیں ایک صداقتِ کلیہ کا صحیح وجدانی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیظ و غضب کا اصل مبداء حُب اشیاء ہے، جس طرح تمام حزن و ملال کا مبداء بھی یہی حُب اشیاء ہے، نیز تمام حق و جہالت کا بھی مبداء یہی ہے، رفع غضب کے لیے صحیح پوچھو تو تبدیلِ مزاج کی ضرورت ہے، جیسا کہ عارفِ روم نے فرمایا تھا کہ انما التذہب بـ تبدیل للزاج اس تبدیلی کے لیے تنقیہِ دماغ ضروری ہے، جس کا انحصار تزکیہ قلب پر ہے۔ اس کے لیے چند قرآنی اور نفسیاتی حقائق پر تجریدِ ذہنی کے ساتھ غور کرو، تم مال و دولت کو جو تمہارے قبضہ میں ہے، اپنی ملک سمجھتے ہو، کیونکہ تم اس پر متصرف ہو، اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو، اپنی مرضی سے ذخیرہ کرتے ہو، اپنے مالک ہونے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا، ناگہان تم بیمار ہو جاتے ہو، دولت تمہیں حالتِ صحت میں جان سے زیادہ عزیز تھی، لیکن جب درد کی شدت تمہیں بے قرار کرتی ہے، تو مال تمہیں مارا نظر آنے لگتا ہے، تم اضطرار کے ساتھ طبیب کو طلب کرتے ہو، علاج معالجہ پر بے دریغ خرچ کرتے ہو، اسی چیز سے مفارقت گوارا کرتے ہو جو تم کو بہت زیادہ پیاری تھی، اب تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ محبوبہ شے صحت ہے، یعنی درد و الم سے رہائی، اور سکون و آرام کا حصول، لیکن باوجود تمہاری تمام سعی و کوشش کے تمہیں صحتِ بدنی اور راحتِ قلبی حاصل نہیں ہوتی، تمہارے طبیب کا نسخہ اثر نہیں دکھلاتا، طبیب کے ابلہ ہونے کا تم کو یقین ہو جاتا ہے، اور تمہیں خون ہوتا ہے کہ یہ کہیں اصل کی پیش قدمی کی علامت نہ ہو، اس سے زیادہ قابلِ طبیب تمہارا علاج میں مصروف ہوتے ہیں، تیرہ ہڈی ٹخنوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن تمہارا درد بڑھتا

جانتے، اضطراب و اضطراب میں ترقی ہوتی ہے، تمہارا مال تمہاری جاہ و حشمت تمہارے
 خادم و نوکر اپنے تمام ذرائع کا تم استعمال کر رہے ہو، لیکن ان سے تمہیں کوئی فائدہ کوئی
 نفع حاصل نہیں ہو رہا ہے، تم اپنی تکلیف اپنے دردیں کسی قسم کی کمی نہیں پاتے، اب تمہیں
 یاد پڑتا ہے کہ تم نے کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سنا تھا کہ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا
 وَلَا مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا، الفاظ تمہارے ذہن میں ہیں، معنی کا تمہیں کھلا فہم حاصل نہ
 تھا، وچران میں ان کا تحقق نہ ہوا تھا، ان کے مصداق سے بے خبر تھے، اب شاید تمہیں پہلی
 دفعہ روشنی نظر آرہی ہے، جہل کی ظلمت دور ہو رہی ہے، اپنی ہی ذات میں معنی کا تحقق ہو رہا
 ہے اور خود کو نہ نفع پر قادر پارہے ہو، اور نہ ضرر کے دفع کی قوت ہی کا تمہیں احساس ہو رہا
 ہے، پھر تم مالک کس شے کے ہو؟ تمہاری مالکیت سے تمہیں کیا فائدہ؟ اپنی محبوب ترین
 جان سے تکلیف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، درد کی شدت میں رتی بھری نہیں کر سکتے، مال
 تمہیں اس لیے محبوب تھا کہ اس سے درد کا ازالہ ہوتا ہے، راحت حاصل ہوتی ہے،
 پھر یہ کیا ماجرا ہے، اس کا اثر کہاں گیا؟ جب مال کے اثرات تمہارے اختیار میں نہیں تو
 ایسے بے اثر مال کو لے کر کیا کرو گے؟ یہ تو محض ایک بارگراں ہے، اس سے تو کمر ٹوٹی ہی،
 یہ پھر اتنا عزیز اتنا محبوب کیوں ہو؟ بیچ پوچھو تو یہ تمہاری ملک بھی نہیں، یہ حق تعالیٰ کی
 ملک ہے **لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (پ ۲۸، ۱۲۶) اور وہی اس کے حقیقی مالک
 ہیں۔ **لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا** (پ ۶) یہ تمہارا مغالطہ تھا کہ تم
 اس کو اپنی ملک سمجھ رہے تھے، اور اپنے کو اس کا مالک جان رہے تھے، بیچ پوچھو تو تمہاری
 کوئی چیز ہی نہیں، تم اپنی ذات کے لحاظ سے فقیر محض ہو، اور حق تعالیٰ ہی غنی و حمید ہیں۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (پ ۶، ۳) حق تعالیٰ کے اپنی
 عنایت اور رحمت سے تمہیں دولت دی، عزت دی، مال و دولت تمہارے پاس امانت
 ہیں، تم امین ہو اس سے زیادہ نہیں، مالک و حاکم حق تعالیٰ ہیں، تمہیں حق امانت کا احساس

ہونا چاہیے، استردادِ امانت کا جب وقت آئے تو تمہیں خوشی کے ساتھ اس کو مالکِ حقیقی کے سپرد کر دینا چاہیے، جانتے ہو استردادِ امانت کے مواقع کونسے ہیں؟ ان کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، لیکن اتنا یاد رکھو کہ جب تمہاری دولت پر آفت آتی ہے، وہ تمہارے ہاتھوں سے چھین لی جاتی ہے، اور تم اس کو بچا نہیں سکتے، اور تمہارے قلب کے تار ٹوٹے جاتے ہیں تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم اپنی ملک سے محروم ہو رہے ہو، تو تمہاری نارِ غضب بھر تک اٹھتی ہے، یہی وقت اس علمِ صحیح کے تھضر کا ہے، کہ تم محض امین ہو، مالک نہیں، مالکِ حقیقی استردادِ امانت چاہ رہا ہے، متاعِ غیر پر تمہارا اختیار نہیں، تمہارا فرض ہے کہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ امانت کو جوالہ کر دو، غیظ و غضب کا کوئی موقع نہیں، بلکہ خوشی کا مقام ہے، دیانت دار امانت کے استرداد کے وقت ضیقِ محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے قلب کو سرور و مسرت ہوتی ہے کہ اس نے اتنا عرصہ امانت کی حفاظت کی، شرائطِ مقررہ کے تحت اس پر متصرف رہا، اور بالآخر وقت مقررہ پر مالکِ حقیقی کے ہاتھ امانت سپرد کر رہا ہے۔

ہاں کیا تم جانتے ہو کہ تم پر ان بلیات کا نزول کیوں ہے؟ تمہارا مال تمہاری دولت آفتوں کا نشانہ کیوں بن رہی ہے، اور تم غیظ و غضب کی آگ میں کیوں جلیے ہو؟ کیا اس کا بڑا سبب یہی "خیانت فی الامانت" تو نہیں، جہاں تم نے اپنے علم کی تصریح کی، اپنے کواہن جانا، اور امانت کے تصرف میں خیانت کو ترک کیا، اور شرائطِ معینہ کا خیال رکھا کہ فوراً تمہارے قلب کی حفاظت کر دی جاتی ہے، اب وہ غصہ کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے، اپنے فقر و امانت کا علم ہو جانے کے بعد وہ اپنی حاکمیت کے وہم سے بھی نکل آتا ہے، حاکمِ حقیقی وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتے لگتا ہے، ان الحکمہ لا یلہ الا اللہ کا اس کو یقین پیدا ہو جاتا ہے، اپنے حکم کی خلاف ورزی پر اس کو آگ نہیں لگتی، اس کا شعلہ غضب نہیں بھڑک اٹھتا، جب چاہے خاتمہ ہو جاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر جذبہ غضب کا بھی استیصال ہو جاتا ہے، اگر

مجھ پر وجدان میں یہ بات کھل جائے کہ میری ذات فقیرِ محض ہے، مالک نہیں ملوک ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، رب نہیں مربوب ہے، مولیٰ نہیں عبد ہے، ہاں اگر اس حقیقت کا محض تعلق علم نہیں، وجدانی تحقق ہو جائے تو اب میری نظر میں غضب کے سارے معروضات فنا ہو جاتے ہیں، مال و جاہ خدم و حشم کا تعلق میری ذات سے باقی نہیں رہتا، فقیر کو ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس ذات کے لوازمات ہیں، جو غنی و حمید ہے جو مولیٰ و رب ہے، جو مالک و حاکم ہے۔

حق تعالیٰ ہی الہ ہیں، لا الہ الا اللہ، وہی معبود ہیں اور مستعان اور تم سب عبد اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے ذلیل ہے اور فقیر، اس کی نسبت ذل و افتقار حق تعالیٰ ہی سے ہے کسی غیر سے نہیں، وہ غیر اللہ کی نسبت سے غنی ہے، اور حق تعالیٰ کی نسبت سے فقیر، غنی کا فقیر سارے عالم سے مستغنی ہوتا ہے، جب قلب مومن پر اس توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے، تو وہ ساری دنیا سے اور دنیا کی تمام محبوب و مرغوب چیزوں کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے۔

رفت آنکہ بقبلہ بتاں رو آرم
حرفِ غم شاں بہ لوحِ دل بنگارم
آہنگِ جہاں جاودانی دارم
حسنے کہ نہ جاوداں ازو بیزارم (جامی)
اور تم او پر یہ دیکھ چکے ہو، کہ غیظ و غضب کی اصل و منشا حبِ اشیاءِ فانیہ ہے، لا الہ الا اللہ سے قلب کا تزکیا اور روح کا تجلیہ ہوا کہ حبِ اشیاءِ فنا ہونی اور اس حب کے فنا ہوتے ہی غضب کی بھی بیخ کنی ہو گئی!

(۳) مجاہدہ :- اس علم صحیح کے حصول کے بعد اب تمہیں مجاہدہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے، مجاہدہ علم کے قلب میں نفوذِ سرایان کے لیے ضروری ہے، مجاہدہ سے علم کا استقرار ہوتا ہے، تلویں جاتی ہے، تمکین پیدا ہوتی ہے، مجاہدہ ہدایت کے راستوں کو کھولتا ہے، حصولِ مقصود کا یہی واحد ذریعہ ہے، تمہارے سامنے جو علم صحیح اوپر پیش کیا گیا ہے، اس پر تدریس ضروری ہے، تفکر لازمی ہے، فجر کا وقت اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے،

اس وقت اعصاب رات کی استراحت کی وجہ سے تازہ دم ہوتے ہیں، قلب کو سکون ہوتا ہے،
 دماغ افکارِ دنیوی سے نسبتاً خالی ہوتا ہے، ایسے وقت تمہیں زندگی کے کاروبار شروع کرنے
 سے پہلے اس ازلی وابدی صداقت پر غور کرنا چاہیے، اس کو قلب کی گہرائیوں میں اتارنے
 کی کوشش کرنی چاہیے، کہ مالکِ حاکم حق تعالیٰ ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، ہر چیز ان ہی
 کی ملک ہے، وہی رب ہیں اور وہی مولیٰ، ہم ان ہی کے فقیر ہیں، انہی کے در کے سائل ہیں،
 وہی ہمارے معبود ہیں، وہی مطلوب، وہی محبوب، وہی مقصود ان کو رکھ کر میں کسی چیز کا محتاج
 نہیں، میں غنی عن اشیء ہوں، ہر شے سے برتر، مجھ ہی سے ارشاد ہوا ہے،
 لَکِیْلًا تَأْسُوْا عَلٰی مَا فَاٰتَکُمْ ۝ تاکہ جو چیز تم سے جاتی ہے تم اس پر رنج نہ کرو، اور جو
 وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاکُمْ ۝ چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔
 (پہلے ۱۰)

کیونکہ

عالمِ بطنیلِ راست موجود ایم زکائیات مقصود!

جوں جوں تمہارا مراقبہ، تمہارا تفکر و تدبر عمیق ہوتا جائیگا، تمہارا نقطہ نظر بدلتا جائیگا، اور یاد رکھو
 کہ نقطہ نظری کے بدلنے سے خودی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور خودی کے انقلاب سے کائنات
 کے چار سو بدل جاتے ہیں۔

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیرا

عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے (قبال)

اسی انقلاب مزاج سے تمہارے قلب سے اشیاءِ فانیہ کی محبت محو ہوتی ہے، اور غصہ کا بیٹی ہی
 مسما رہو جاتا ہے، جب تک تم نے اپنے کو مالک و حاکم جانا، امانت میں تم نے خیانت کی،
 مین نہیں غاصب ٹھہرے، غاصب کو جہاں کہاں امن و چین لینے دیتا ہے، تم میں اور
 کائنات میں توافق نہیں مخالف و متنازع قائم ہو گیا، اب ہر واقعہ تمہارے غصب کو
 بھڑکائیگا، جب تم نے اپنا نقطہ نظر بدلا، حق تعالیٰ کو مالک و حاکم جانا اور خود کو ان کا

مملوک و محکوم، آدابِ امانت سے واقف ہو گئے، تو آپ کائنات میں اور تم میں تو افرق پیدا ہو جائیگا۔
اس تو افرق کے بعد انبغاثِ غضب کا کوئی موقع نہیں پیدا ہو سکتا۔

تسلیم نہی شوی اذ ان غم گینے تسلیم شو ہرا سچہ آید پیشت!

اس لئے تمہیں دورانِ تفکر میں رضا بالقضاء کے اعتبارات پر خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔ دیکھو مدبرِ امر در حقیقت کون ہیں؟ حق تعالیٰ ہیں *يُدَبِّرُ الْأُمُورَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ*، جب وہ مدبر ہیں جب امر و حکم ان ہی کا چل رہا ہے، تو ان کی تدبیر کے ساتھ حسنِ رضا درکار ہے نہ کہ عصبہ و غضب! دیکھو، حق تعالیٰ کی ذات کامل، ان کے صفات کامل، ان کے افعال کامل اور خود ہی خالق (*خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ*) تو آپ بات تمہارے ذہن میں جم جانی چاہیے کہ ع ہرچہ از دوست می رسد تیکو است

دیکھو حق تعالیٰ مومن پر رحیم ہیں *كَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا*، اب اگر تم میں ایمان ہے، اسکی حفاظت تم نے کر لی ہے تو اب ہر واقعہ تمہارے لئے نشانِ رحمت ہی پیش آئیگا گو بصورتِ قہر کیوں نہ نظر آئے کیونکہ حق تعالیٰ تم پر رحیم ہو کر تمہارا نقصان روا نہیں رکھتے، جب اس صداقت پر تم غور کر لو گے اور تمہارے قلب پر وہ مسلط ہو جائیگی، تو بے اختیار تمہاری زبان سے یہ پُرترتم الفاظ نکلنے لگیں گے۔

خواہی ز وصال شادمان دار مرا خواہی ز فراق بہ فغان دار مرا

من باتونہ گویم کہ چساں دار مرا ناساں کدلت خوست چساں دار مرا (خیم)

یہ مجاہدہ کا انجام ہو گا، لیکن اس غایت کا حصول یکدم نہیں ہوتا، تمہیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے اور بہت و استقلال سے قدم بڑھانے جانا چاہیے۔ کامیابی بالآخر مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے، اور *كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرَ الْمُؤْمِنِينَ* کا وعدہ اس کے لئے پورا ہو کر رہتا ہے۔

اندیں رہ می تراست وی خراش	تادم آخر دے فاش میباش
دوست دارد دوست این آشتنگی	کوشش بہرودہ بہ از خفتگی
کار کے کن تو و کابل میباش	اندک اندک خاک چہ را می تراش
چون رہا ہے می گئی ہر روز خاک	عاقبت اندر رسی در آب پاک
چون نشینی بر سر کوئے کسے	عاقبت بینی تو ہم روئے سے

دُعا کا فلسفہ

ہم دُعا اذ تو اجابت ہم نہ تو ایمنی از تو ہجابت ہم نہ تو
 دعا حق تعالیٰ سے مانگ ہے اور مانگنا یہ جانتا ہے کہ وہ اپنی قدرت مطلقہ کا ہماری
 زندگی میں ظہور فرمائیں! ہمارے ضعف میں ان کی قوت کا ظہور ہو، ہمارے فقر میں ان کی غنا
 کا ظہور ہو، ہماری ذلت میں ان کی عزت کا ظہور ہو، ہمارے عجز میں ان کی قدرت کا ظہور ہو،
 اسی صورت میں یعنی حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کے ظہور ہی کی وجہ سے ہماری دعا قضا یعنی تقدیر
 کو بھی پھیر سکتی ہے **لَا يَرْدُ الْقَضَاءُ إِلَّا اللَّهُ عَاءُ** (رداء الترمذی) اسی وجہ سے دعائے بڑھ کر
 حق تعالیٰ کے یہاں کوئی چیز بزرگ تر نہیں لیس **شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللَّهِ مِنَ الدُّعَاءِ**
 (رداء الترمذی و حسنہ) اسی بنا پر دعا ہر بلا سے بچاتی ہے، خواہ وہ نازل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو
إِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَهَذَا كَمَا يَنْزِلُ اور اسی کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے
 فرمایا **فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللَّهِ بِاللَّهِ عَاءُ** اس لئے کہ خدا کے بند و دعا کرو (رداء احمد الترمذی)
 ہمیں اپنے ضعف، فقر، عجز و ذلت کا بد ہی احساس ہے، اس احساس و وجدان کے باوجود
 اگر ہم دعا کے ساتھ قادر مطلق ہستی کی طرف نہ اٹھائیں یعنی اس کی قدرت کا اقرار اور اپنے عجز
 کا اعتراف نہ کریں تو یقیناً یہ چیز حق تعالیٰ کے رضا کا باعث نہ ہوگی۔ (رداء الترمذی)
 دنیاوی زندگی میں جب ہم کسی دوست سے کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم
 اس سے مل کر اپنا کام بتلاتے ہیں اور اس صورت میں ہمارا کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی
 طرح جب ہم حق تعالیٰ سے کچھ عرض کریں تو ہمیں ایک بنیادی صداقت کو مان کر عرض کرنا پڑتا
 ہے اور وہ بنیادی صداقت یہ ہے، حق تعالیٰ قریب ہیں، مجیب ہیں، **إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُجِيبٌ**

(سورہ ہود) وہ ہمارے قریب ہیں اور سن رہے ہیں۔ اِنَّهٗ سَمِيعٌ قَرِيْبٌ (سورہ سبا) ان کی رحمت ہم پر محیط ہے، قریب ہے اِنَّ رَحْمَةً اِلٰهٍ قَرِيْبٍ (اعرات)

ایمان کی زندگی کا آغاز اسی وجدان سے ہوتا ہے: اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ! وہ ہماری رگ

جان سے زیادہ قریب ہیں۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِمْ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰، ق ۱۶) دعا کے وقت ہم

کمی بہری اور غائب ہستی کو نہیں پکار رہے ہیں، ہم اس ہستی کو پکار رہے ہیں جو سمیع و بصیر ہے

اور ہم سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمًا وَلَا غَائِبًا، اِنَّكُمْ تَدْعُوْنَ

سَمِيْعًا بَصِيْرًا. وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ اَقْرَبُ اِلَىٰ اِحْدِكُمْ مِنْ عُنُقِ

سَرَاخِلَةٍ (متفق علیہ)

ہماری زندگی کا پہلا قدم حق تعالیٰ کے حضور و شہودِ کامل یقین و اذعان ہے! بجائے

اس وہم و امید کے کہ ہم زندگی کے کسی آخری مرحلہ پر حق تعالیٰ کے قرب و حضور کا تحقق کر سکیں

ہیں، آج ہی کامل ایمان و اذعان کے ساتھ کہنا چاہیے۔

حق تعالیٰ آج میرے قریب ہیں، اقرب ہیں، محیط ہیں، ساتھ ہیں، اُن کے وعدے سچے ہیں،

اُن کے ہاتھ فضل و کرم سے پُر ہیں، اُن کی نعمتیں کامل و دہرا ہیں، ان کی رحمتیں وسیع و کشادہ ہیں،

وہ مجھے ہر تجربہ سے سلامتی و امن کے ساتھ نکال کر خیر کثیر کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔

يٰۤاَعَالَمٰبِيْ وَيٰاَقْرِبٰۤا مَتٰى وَيٰاَسٰهَدٰۤا عَلٰى

مَوٰعِيْدِكَ صٰاَدِقَةً اِيٰدِيْكَ فَاَصِلْهُ، نِعْمَتِكَ سَابِغَةٌ رَّحْمَتِكَ وَاَسِيعَةٌ

اَنْظُرْ اِلٰى مِيْنِكَ بِنَظْرَةِ رَحْمَةٍ يٰاَذَ الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ

ہم اب حق تعالیٰ سے اسی طرح باتیں کر سکتے ہیں جس طرح بچہ اپنے باپ سے باتیں کر سکتا ہے!

تجربہ سے، ادب سے، بجز وانکسار سے، پورے اعتماد و وثوق سے عرضِ مدعا کر سکتے ہیں! وہ ہمارے

ساتھ بالذات حاضر و موجود ہیں۔ اِنَّ اِلٰهًا عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شٰهِيْدٌ! وہ ہر چیز کے ساتھ حاضر ہیں،

اُن سے کوئی چیز جو معلوم کی جاسکتی ہو یا دیکھی جاسکتی ہو غائب نہیں ہو سکتی۔ اُن کا ارشاد ہے:

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ
 قُرْآنٍ وَلَا تَعْلَمُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ
 شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ
 رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي
 السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا
 فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (پ ۱۱۷ ع ۱۲)

تم جس حال میں ہوتے ہو، یا قرآن سے کچھ پڑھتے
 ہو یا تم لوگ کوئی اور کام کرتے ہو، جیسا میں
 مصروف ہوتے ہو، ہم تمہارے سامنے ہوتے ہیں اور
 تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ
 نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے
 چھوٹی ہے یا بڑی۔ مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے۔

اس ارشاد سے یہی صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ بالذات حاضر ہیں،
 اس لئے وہ ہمارے ہر حال، ہر فعل اور ہر مصروفیت کو بالمشاہدت جانتے ہیں، یہیں اپنا حال روشن
 کرنے کے لئے کسی مشقت، کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں، وہ ان حالات کے شاہد ذاتی ہیں فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا
 - تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں! جب ہمیں کوئی حاجت ہو تو ہمیں اس حاجت کو
 ان کے سپرد کر دینا چاہیے۔ اور پھر اس کی طرف سے اپنی توجہ کو ہٹالینا چاہیے اور ان کی ذات
 مبارک پر اپنی پوری پوری توجہ مبذول و مرکوز کر دینا چاہیے اور اس امر کا یقین کر لینا چاہیے کہ
 ان کی کمال قدرت کا ظہور ہو رہا ہے اور ان کا ابادہ ہمارے خیر ہرگز کے ظہور میں کاہن فرما ہے،

اربابِ عالمِ عظیم و زبانِ سوالِ نیکت۔

در حضرتِ کریم تقاضا چ حاجت است

سچی دعا اجابت حق کا تحقق ہے: حق تعالیٰ قریب و مجیب ہیں اور فرماتے ہیں اَجِبْ

دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا (بقرہ آیت ۱۸۶) جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں

اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ فَلْيَسْأَلْ يَتُوبَ اِلَيْهِ وَيُؤْتِ مَن يَشَاءُ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ط

اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دعا عبادت ہے، تمہارے رب سے کہتا ہے، کہ تم

مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا (رواہ احمد و ابی السنن) اسی وجہ سے دعا کے وقت اجابت کا

قوی یقین رکھنا چاہیے، اَدْعُوا اللَّهَ وَانْتُمْ مُوقِنُونَ بِاٰلِهٰتِكُمْ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَبْلَ هٰذَا كٰفِرًا

فرمایا تھا کہ جس چیز کی بھی تمہیں خواہش ہو، اس کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کرو اور جب دعا کرو تو اس کے قبول ہونے کا یقین رکھو اور وہ چیز تمہیں حاصل ہوگی۔

دعا کے وقت سب سے زیادہ اہم یہی چیز ہے کہ ہم حاجتِ حق پر یقین رکھیں اور اچھی طرح مان لیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کوئی مسئلہ نہ چھوٹا ہے نہ بڑا، ان کے لئے ہر چیز آسان ہے، وہ ہر شے پر قادر ہیں اِنَّ تَسِيْرَ كُلِّ عَسِيْرٍ عَلَيْكَ يَسِيْرٌ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ بِالْاِحَابَةِ جَيْرًا مِّمَّا اَعْمَلُوْا وَلِعَمَّ اَلْنَصِيْرُ! اس لئے کامل یقین و وثوق کے ساتھ ہمیں اپنے قلب کے رُخ کو حق تعالیٰ کی طرف پھیر دینا چاہیے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہماری حاجت سے واقف ہیں اور اس کی تکمیل فرماتا ہے، جب حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں تو پھر ہمارے تمام خوف بے بنیاد ہیں، فضول ہیں، ذرا اس شخص کا تصور تو کرو جو ایک سرسبز و شاداب وادی سے گذر رہا ہے، لیکن یہ غم اس کو کھلے جا رہا ہے کہ اس کے سامنے تو ایک دریا ہے اور وہ اس کو عبور نہیں کر سکتا حالانکہ دریا پر پل بھی ہے اور وہ نہیں جانتا! یا اس شخص کا تصور کرو جس کے ساتھ سفر میں ایک دانا و بیٹا قوی و عزیز دوست ہے جو راہ و رسم منزل سے بخوبی واقف ہے، جو اس سفر کا کامل نقشہ بنا چکا ہے اور یہ یقین دلا چکا ہے کہ اس سفر میں کوئی اتفاقی حادثہ تک پیش نہیں آئے گا، اس پر کامل اعتماد کیا جاسکتا ہے، اس پر بھی یہ مسافر پریشان ہے!

مومن کا قلب احمقانہ خوف سے خالی ہوتا ہے وہ "خَلَّ اللّٰهُ كَوْمَضْبُوْطٍ يُّكْرَمُ كَرِهَمَتْ و مردانگی سے زندگی کے میدان میں قدم اٹھانا جاسکا اور کل کے مسائل اس کو پریشان نہیں کرتے، وہ حق تعالیٰ پر کامل توکل و اعتماد رکھتا ہے:

قُلْ لَنْ يُصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ
لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ط (۹، توبہ ۵۱)

کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ خدا نے ہمارے لئے لکھ دی ہو وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

اجابتِ دعا کے یقین کے ساتھ اپنی حاجت کا رسازِ حقیقی کے سامنے پیش کرنے کے بعد دعا

کی قبولیت پر ہمیں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، یہ جان کر کہ کوئی جدید ایجاد، نہ برق نہ
مقطعات، نہ ذرہ ہائے اندر اس قوت کا کرداروں حصہ بھی پیدا کر سکتی ہے جو ہم میں حق تعالیٰ
کی لامتناہی قدرت پر بھروسہ کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے، ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اس
شکر کے ادا کرنے سے ہمارے شعور کے مقفل دروازے کھل جاتے ہیں اور ہم اس قابل ہو جاتے
ہیں کہ حق تعالیٰ کے لاحد و انعامات کو قبول کر سکیں اور ان کی نعمت سابقہ و رحمت واسعہ کا
منظر بین سکیں! حق تعالیٰ کا شکر نہ صرف ان نعمتوں پر جن کا ہم نے اپنی گذشتہ زندگی میں تجربہ
کیا ہے، بلکہ ان بے شمار نعمتوں پر جو ہماری آئندہ زندگی میں ظاہر ہونے والی ہیں، ایک کامل نژاد
شاد و با مراد زندگی میں داخل ہونے کا سب سے زیادہ یقینی اور سب سے زیادہ آسان طریقہ ہے،
ہیں نہ کسی چیز کی فکر کرنی چاہیے نہ کسی چیز کا غم، حق تعالیٰ کی قدرت کا ملہ پر یقین ان کی گذشتہ و
آئندہ نعمتوں پر شکر مشکلات کے پہاڑوں کو اڑا کر بکھیر دے گا اور زمین کو ہمارا میدان کر چھوڑے گا۔

يَسْفِهَارِي نَسْفًا فَيَذُرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا! (طہ: ۱۰۵)

غم دعا پر ہمیں کہنا چاہیے،

اَمْتَ غِنَايَ فِي كُلِّ كَرْبَةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ! ہر بڑے غم میں تو ہی میرا فریاد ہے، خدایا تیرا شکر!
وَأَمْتَ رَجَائِي فِي كُلِّ شِدَّةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ! ہر سختی میں تو ہی میری امید ہے، خدایا تیرا شکر!
أَرْجُو الْخَيْرَ قَتِيرَةً وَأَخَافُ الشَّرَّ اور تجھ سے خیر کی امید رکھتا ہوں اور تو آسان کر دیتا ہے
اور ہر شر سے ڈرتا ہوں۔

فَتَعْرِفَهُ فَلَكَ الْحَمْدُ! اور تو اس کو دفع کر دیتا ہے، خدایا تیرا شکر!
وَأَرْبِيئِي التَّنِيَّاتِ فَلَكَ الْحَمْدُ! خوشی کے مارے میرے اگلے دامت و کھلا دیتا ہے، خدایا تیرا شکر!
يَبْدِي مَوْتِي وَحَيَاتِي فَلَكَ الْحَمْدُ! میری زندگی و موت تیرے ہاتھ ہے، خدایا تیرا شکر!
حق تعالیٰ کی ذاتِ قادس پر بھروسہ، اس سے پیدا ہونے والی مسرت و شادمانی تمام مصائب
و آفاتِ زندگی کا کامل علاج ہے، اسی لئے کہا گیا ہے،

شادی جاوید کن از دوست تو!
تا نہ گنجی ہجو گل در پوست تو!

• شادی جاوید" یا دائمی خوشی اس وجہ سے کہ حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، نِعْمَ
الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ" اچھے مولیٰ اور اچھے مددگار ہیں، لامتناہی قدرت و قوت کے مالک ہیں
ہم اپنے اسی یقین و جہان کا اظہار کرتے ہیں، اس کی تکرار کرتے ہیں اور اس قوت سے تکرار کرتے
ہیں کہ تمام شرکی قوتیں جو ہمارے خلاف صفا آ رہی ہیں، راہ قرار اختیار کرتی ہیں اور بالآخر فنا
ہو جاتی ہیں یہی ہمارا نعرہ جنگ ہے،

وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ!

إِنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا!

إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّرَاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينِ!

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ!

كَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَلِكَ قَدِيرًا!

کسی حاجت کے وقت اگر ہمارے قلب کی نظر حق تعالیٰ کی قوت و قدرت پر جم جائے تو اس
قوت کا اظہار ہم میں ہونے لگتا ہے! دیکھو، جس چیز کا بھی ظہور ہماری زندگی میں ہوا ہے،
اسی وقت ہوا ہے جب ہم اس سے واقف ہوئے ہیں اور اس کو قبول کیا ہے۔ یہ ایک کلی نفسیاتی
قانون ہے! یہ کلی بھی ہے اور ضروری بھی، اس کا اطلاق ہر تصور پر، ہر مادی شے پر ہوتا ہے، جو
ہمارے علم میں آئی ہے، یا ہماری ملک بنی ہے، اسی لئے یہ چیز اہل عقل و اہل نقل دونوں کے نزدیک
مسلم ہے کہ جب ہم حق تعالیٰ سے کوئی چیز مانگتے ہیں تو ہمیں اجابت کا یقین کرنا چاہیے، یعنی یہ
یقین کرنا چاہیے کہ ہمیں وہ چیز مل چکی اور صرف اسی صورت میں وہ چیز ہماری ملک بن جاتی ہے
یہی تفسیر ہے اَدْعُوا اللَّهَ وَانْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ کی۔

حق تعالیٰ قادر و قوی ہونے کے علاوہ رحیم و دود بھی ہیں، رؤف و رحیم بھی ہیں، غفور و

رحیم بھی ہیں، رحمن و رحیم بھی ہیں، البر الرحیم بھی ہیں، إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا اُن کا محبت بھرا ارشاد ہے، یہ جان کر ہم اپنے قادر توانا، رؤف و رحیم مالک کی بیشمار نعمتوں و رحمتوں کو شکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں تاکہ اُن کا کامل ظہور ہماری زندگی کی ہر جہت ہر پہلو میں ہو! محبت و شکر سے سرشار روح بے اختیار چیخ اُٹھتی ہے۔

اے جان من، جانان من، صد جان من قربان تو!

بے لطف تو من قرار نہ تو اتم کرد احسان ترا شمار نہ تو اتم کرد

گر برتن من زباں شود ہرے یک شکر تو از ہزار نہ تو اتم کرد (ابوسعید ہمدانی)

اسی نکتہ کو شیخ جیلی نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا تھا:

اہل ولایت می دانند کہ حضرت حق تعالیٰ جمیع مایحتاج الیہ اینہارا جہتاً ساخته

و مقرر نموده است پس بسبب علم خویش از رنج تقاضا فارغ اند پس بہتر است

کہ رجاء در حق اینہا حسن ظن یا بدگفت نہ تقاضا، حسن ظن بحضرت حق تعالیٰ معرفت

جمیع صفات باری است و امید یافت و رحمت اوست از جہت اوسمانہ تعالیٰ

نہ از جہت بندہ، زیرا کہ صفاتش حسن و کریم و رحیم و لطیف و رؤف و رؤف و رؤف است

حسن ظن بحضرت حق تعالیٰ حوالہ کردن مقاصد خویش بر مسالکہ امر عتایت جناب الہی

است و نظر قلب بسوئے حق تعالیٰ بے تطبیح نواد و بے تمیز آرد اح و نفوس

(منقول در جواہر علیی صفحہ ۳۲۶)

یعنی اولیاء جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کی تمام احتیاج کی چیزیں ہتیا کر دی ہیں اور مقرر فرمادی

ہیں، اپنے اس علم کی وجہ سے وہ تقاضا کے رنج سے فارغ ہو چکے ہیں، لہذا بہتر ہے کہ اللہ کے حق

میں رجاء یا امید کو حسن ظن سے تعبیر کریں نہ کہ تقاضے سے! حق تعالیٰ سے حسن ظن ان کے تمام

صفات کی معرفت ہے، ان کی تہی و بہر بانی و رحمت سے امید ہے، یہ حق تعالیٰ کی جہت سے،

نہ کہ بندہ کی جہت سے، کیونکہ حق تعالیٰ کی صفات حسن و کریم و رحیم و لطیف و رؤف و رؤف ہیں

اور حق تعالیٰ سے حسن ظن کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایت سابقہ کے
حوالہ کر دیا جائے، اور قلب کی نگاہ اُن پر جم جائے، ایسی حالت میں قلب سے طبع اور رُوح و نفس
سے تمام تمتا میں نکل جاتی ہیں، "لقد ہم حجج اُتھتے ہیں :

تو دردِ دلِ بغمِ این و آن کہ پردازد بجائے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پردازد

ز نازِ نیتِ ترا فرصت و مرا ز نیاز کُنوں بحالِ دلِ تاواں کہ پردازد

اوپر کے ارشادات سے معلوم ہوا :

(۱) دعا پر ہم مامور ہیں، اَدْعُوْنِي نِيْزَ فَعَلِيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِاللّٰهِ عَا! اور دعا قہری

ہے، ہماری قدرت کا تقاضا ہے۔

(۲) دعا کے بعد ہیں اس کی اجازت پر اس کے قبول ہونے پر یقین رکھنا چاہیے اَدْعُوا اللّٰهَ

وَ اَنْتُمْ مَوْقُوْنٌ بِالْاٰجَابَةِ!

حق تعالیٰ چونکہ محسن و کریم و رحیم، لطیف و رؤف و دودود ہیں، اُن کی نعمتیں و رحمتیں ہم پر

عجیب ہیں، ہماری زندگی میں اُن کا ظہور اُن کے قبول کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک کلی و ضروری

و نفسیاتی قانون ہے، اس کی ہمیشہ پابندی کرنی چاہیے۔ دعا کرتے کے بعد قلب کی نگاہ حق تعالیٰ

کی اُن ہی صفات پر جم جانی چاہیے اور شعور کے دروازے اُن صفات کے ظہور کے لئے کھول دیئے

جاننے چاہئیں، دن کے مختلف اوقات میں قلب کی کشش و نگرائی حق سبحانہ تعالیٰ کی

اُن ہی صفات کی طرف ہونی چاہیے:

مزدک از ہر کس چشم و گوش بر بتدیم تمام چشم و ہمہ گوش کردہ مانا (درد)

(۳) دُعا کے بعد اس کی قبولیت پر ہمیں قلب سے شکر ادا کرنا چاہیے، انسانی تخیل کی بلند ترین

پرواز ہی حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں و رحمتوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو اس نے بنوٴ مومن کے لئے فرام

کر رکھی ہیں۔ وَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرْوٰٓءِ اَعْيُنِيْ

ہاں سے ان اشارات پر عمل کرتے ہوئے اب تم اپنی کسی ضروری حاجت کا تصور کرو۔

(۱) اس کو حق تعالیٰ کے حضور میں پیش کرو، دعا کرو اور کہو: يَا رَبِّ اِنَّكَ مُسْتَكْرِمٌ
مَا تَشَاءُ مِنْ اَمْرِ لَيْكُونَ حق تعالیٰ آپ مقتدر بادشاہ ہیں جو چیز آپ چاہتے ہیں وہ ہو جاتی ہے۔

(۲) دعا کی اجابت پر کامل یقین رکھتے ہوئے اس حاجت کی تکمیل پر منعم حقیقی کا شکر ادا کرتے رہو
(۳) اب اپنی حاجت اس کی مشکل، درد، حزن کا خیال مت کرو، بلکہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ

پر نظر رکھو کہ وہ اس حاجت کی تکمیل کر رہی ہے۔ نفس و قلب و روح کی تمام قوتوں کے ساتھ حق تعالیٰ
کی قدرت کاملہ کو اس حاجت کی تکمیل کی صورت میں نمایاں ہوتے ہوئے دیکھتے رہو! تمہاری دعا،

مرتبہ غیب میں اب بھی مستجاب ہو چکی ہے۔ اگر تمہاری نظر اس اجابت حق پر جمی ہے اور زبان سے
اس کی تکمیل کا تم شکر ادا کرتے رہو تو اس کا ظہور مرتبہ غیب سے مرتبہ ظہور میں بھی نمایاں ہو جائیگا۔

الہ سعیدہ کی بات سُنو، وہ حق تعالیٰ کے ارشاد کی نقل فرماتے ہیں:

در حضرت ما دوستی یکدل کن ہر چیز کہ غیر ماست از ایلہ کن

یک صبح با خلاص بیا بر در من گر کار تو بر نیاید انگ گل کن

اس طریق سے دعا کرتے رہو تمہیں گلہ کا موقع نہ رہے گا۔ یا تو تمہارا مقصود حاصل ہو جائے گا

یا مقصود ہی بدل جائے گا اور تم مستانہ وار صبح اٹھو گے

نی خواہیم بود زلف تو زنجیر زہے دیوانہ اعلیٰ اقل کہ ماہیم

۵ حضرت سعید بن المسیب تابعی رح کا قول ہے کہ جو شخص ان کلمات کو پڑھ کر اس کے سے کا شکر کرے

دعا کرے تو وہ دعا قبول ہوگی! کس جانتے والے سے وہ دعا نہیں سکے! زمین کے گوشوں سے دعا قبول ہوتی ہے۔

دعاء اور دفع بلا

اگر آپ کا کوئی عزیز، آپ کا محبوب آپ سے ہزاروں کوس دور غم و الم میں مبتلا، بلاؤ مصیبت میں گرفتار ہو اور آپ سے دعا کا طالب ہو تو آپ جانتے ہیں کہ دعا کے ذریعہ اس کی تائید کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ جو طریقہ خود ہیں اپنی بلا و مصیبت خوف و حزن کو دفع کرنے میں کام آتا ہے بالکل وہی اس محبوب کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے! اس کی تفصیلات اجمالی طور پر یہاں پیش کی جاتی ہیں، ممکن ہے کہ یہ آپ کی سمجھ میں آجائیں اور آپ کو اپنی ان باطنی ربانی قوتوں کا علم ہو جائے جن سے آپ اب تک بے خبر تھے، ان کے استعمال سے آپ خود کیفیت و سرور حاصل کریں اور دوسروں کی بھی راحت و آسائش کا باعث بن جائیں۔

زیر شہدیک انگشت برائیم بابت از لذت اگر بخونہ گردی قفت کن

ایک نامعلوم خطہ زمین میں ایک کشف مصروف تحقیق ہے اور یکایک راستہ بھٹک جاتا ہے، اب وہ پختہ کار خوب جانتا ہے کہ اس حالت میں اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے کہ وہ جو اس باختہ نہ ہو جائے، اس کے اوسان جاتے نہ زمین، مٹی گم نہ ہو جائے! اس کو خوب معلوم ہے کہ اگر خوف کے ماتے آپ اس کی عقل جاتی رہے تو پھر اس کو کبھی رات نہ نہیں ملتا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہلاک ہو جاتا ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اس نے اس وقت اپنے قلب کو سنبھال لیا، اس کو خوف و مہراس سے آزاد رکھا، پرسکون دل جمع اور مطمئن رات سو سکتا ہے کہ اس کو راستہ مل جائے اور وہ ہلاکت سے بچ جائے۔

بالکل ہی حال تمام مصائب اور مشکلات کا ہے، سب سے پہلے ہمیں اپنے قلب کو خوف و

پریشانی سے بچانا چاہیے، جب ہم پر بلاؤں کا نزول ہوتا ہے، درد اور غم کے باوجود اُمنڈاٹے میں تو سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی معیت کا احساس کر کے اپنے دل کو خوف سے محفوظ کر لیں، خوف دور ہوا اور ہم نے ذاتی نفع و ضرر کے خیال سے بلند ہو کر اپنے آپ کو غائب کر کے کہا کہ "حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" اور تاہاں کے الفاظ میں دنیا کے اچھے اور بُرے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر دیا کہ :-

دنیا کے نیک بُد سے کچھ تاہاں نہیں ہر مجھ کو غم

گریوں ہوا تو کیا ہوا اور دلوں ہوا تو کیا ہوا

تو اب حالات میں تغیر ہو جاتا ہے، اور حیرتناک طریقہ سے ہمیں تمام بلاؤں سے نجات مل جاتی ہے اور مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا مِّنْ أَمْرِهِ يُسْرًا کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم اپنے محبوب کی خواہ وہ ہم سے قریب ہو یا دور ہو، اس کے بارے میں پریشان اور خوف زدہ ہو کر بند نہیں کر سکتے، خوف و پریشانی سے بچنے اس کی مصیبت کم ہونے کے اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ ہم اپنی مسموم ذہنی فضا سے اس کو بھی متاثر کرتے اور اس کے خوف و پریشانی میں اور ضائع کر دیتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمیں اس کی طرف سے بے پرواہ ہو جانا چاہیے اور اس کا غذا مالک ہے کہ بے فکرین ہوں وہ درد و تکلیف میں مبتلا ہے اور ہمیں اس کی مدد کرنی ضروری ہے، وہ ہم سے کوسوں دور ہے اور جسمانی خدمت کا ہمیں کوئی موقع حاصل نہیں، اس کی خدمت کا روحانی طریقہ ہی اختیار کیا جاسکتا ہے اور وہ دعا اور تقویٰ ہی ہے، ہم اس کے لیے اس طرح دعا کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اپنے لیے دعا کر رہا ہے اور معیت و نصرت حق کا اس طرح ادراک کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اس کا ادراک کر رہا ہے۔

اس طریقہ کے استعمال میں سب سے زیادہ اسی شخص کو کامیابی حاصل ہوتی ہے جو جستی اور پریترگا رہے، توحید کے میدان کا مرد ہے، امتثالِ امورِ الہیہ میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے، خواہی سے جتنب ہے اور فسق و فجور سے تائب، اس کی دعائیں بلا کا اثر ہوتا ہے اور حق تعالیٰ

نے اسی کے متعلق تو فرمایا ہے کہ میں اس کا ہاتھ، آنکھ، کان پاؤں ہو جاتا ہوں کنت سمعہ
الذی یسمع بہ ونبصرہ الذی یتصربہ ویدک الی یطس بہا ورجلہ الی یمشی بہا
(الحديث رواہ البخاری)

بہر حال پہلی چیز یہ ہے کہ ہم خود اپنے خوفزدہ اور پریشان قلب کو سکون و جمعیت عطا
کریں اور اس کے انتشار و پریشانی کو رفع کریں، جب ہم اپنے محبوب کے متعلق بڑی خبر
پہنچے تو ہمیں چاہیے کہ فوراً بھولے فقیر والی اللہ حق تعالیٰ کی طرف گریز کریں کیونکہ تمام چیزوں
کا اختیار ان ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی پناہ دیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں کوئی کسی
کو پناہ نہیں دے سکتا۔ قل من بیدہ ملکوت کل شیء وهو مجیر ولا یجار علیہ لکنتم
تعلون (پ ۵۶) تمام اہل اللہ کو اس امر کا تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی مصیبت کو ابتداً
حق تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور خلق کو اس کی اطلاع نہیں دیتا تو بہت جلد نصرت
الہی اس کو دور کر دیتی ہے اور اس کے قلب کو سکون اور طمانیت عطا کرتی ہے۔

یہ شاید ابتدا میں ہمارے لیے آسان نہیں جب ہم پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہو تو ہمارے
قلب کے تار ٹوٹنے لگتے ہیں، ہماری نبضیں چھوٹنے لگتی ہیں، ہمارے خیالات میں بلا کا انتشار اور
نشئت پیدا ہو جاتا ہے، خوف سے ہماری زبان سوکنے لگتی ہے، ہماری آنکھوں میں اندھیرا
چھانتا ہے!

یاد رکھو یہی وقت ہے رجوع الی اللہ کا، یہی وقت ہے قلب کو ظلمت سے نکال کر نور
کی طرف رجوع کرنے کا، سلبی و تنزیہی خیالات سے اس کو چھڑا کر ایجابی تصور کی طرف مائل
کرنے کا، اور حق تعالیٰ سے زیادہ کس کا خیال نورانی اور ایجابی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے حضور
انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت ان پاکیزہ الفاظ کو دہرانے کی تاکید فرمائی ہے :-
لا الہ الا اللہ العلی العظیم لا الہ الا اللہ رب العرش العظیم، لا الہ الا اللہ رب السموات
وہی العرش الکریم

لہ نور صفحہ ۳۲۲ پر دیکھیے

تم چاہو تو ان الفاظ کی تکرار کر سکتے ہو جو تمہارے کرب کو رفع کرنے میں اکیسر کا حکم رکھتے ہیں: اللہ اللہ ربی لا اشرك به شیئا پھر یہ الفاظ دہرائے جاسکتے ہیں، یا حتی یا قتیوم بوحمتك استغیث۔

یہاں یہ نفسیاتی اصول یاد رکھنا چاہیے کہ خوف و غم کا مقابلہ ان کی سطح پر رہ کر نہیں کیا جاسکتا، اس سطح میں ان کی قوت ناقابلِ مذاخہ ہوتی ہے، اس میں ان سے نجات پانے کے لیے اس سطح سے بلند ہو جانے کی ضرورت ہے۔ جب ہم حق تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے ہیں، ان کے اسماء و صفات کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو کر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں شکر کا گزر نہیں، جہاں سوائے ذات کے سرور و سکون کے کوئی اور چیز نہیں اور اس ذات کے اس سرور میں کافی حصہ مل جاتا ہے۔

قطرہ نوری سراپا نور باش بگڑا ز غم دائم مسرور باش (نوی)
ادعیہ باثورہ کی تکرار کے ساتھ تمہیں حق تعالیٰ کی محبت و احاطت کا اور اک بھی واضح طور پر کرنا چاہیے حق تعالیٰ نے تمہیں اپنی محبت کا یقین دلایا ہے۔ **هُوَ مَعَكُمْ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** جہاں کہیں تم ہو حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہیں، وہ تم پر محیط ہیں، ہر شے پر محیط ہیں، کوئی شے ان کے احاطے سے خارج نہیں، وکان اللہ بکل شیء محیطاً (پ ۵۷) الا انہ بکل شیء محیط (پ ۵۶) حق تعالیٰ ہر جا حاضر موجود ہیں، تم اپنا منہ جد نظر پھیرو وہیں ذات حق موجود ہے۔ **فایمنا تو لو اقم وجہ اللہ۔**

آنکھیں جو ہوں تو میں ہر مقصود پر جگہ بالذات ہر جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

(ذو بیضیہ صفحہ ۳۲۵) لہ رعاہ بخاری و مسلم و ابو عوانہ و نسائی و الترمذی و ابن ماجہ و غیر ہم ابن حبان نے اشاور زیادہ کیا کہ پھر اس کے بعد دعا کو ہے۔

دعا شیشہ صفحہ ۳۲۵) لہ رعاہ ابو داؤد و النسائی و ابن حبان بخرانی نے تین بار ان کا کتنا زیادہ کیلئے و آخر جب ابن ماجہ ایضاً حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ لیتے اہل بیت کو جمع کیے فرمایا کہ تم میں جب کسی کو غم یا کرب پہنچے تو کہے۔ **اللہ اعلم** ابن مسعود فرماتے ہیں کہ حضرت صلیم کو جب کوئی غم ہوتا تو یہ الفاظ دہرائے۔

حق تعالیٰ خود ہم سے بہت قریب ہیں، اقرب ہیں، ہرگز بعید نہیں، دور نہیں! وہ اس کاہیں پورا یقین دلا رہے ہیں **مَنْ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ** یعنی ہم رگِ جان سے زیادہ قریب ہیں، اپنے سے دور کیوں سمجھ رکھا ہے! اپنے جہل کو دور کرا اور ہم سے قریب ہو جا! خوابِ جہل از حرمِ قرب مراد اور فگندہ ورنہ نزدیک تر از دوست کے ہیچ نمدید

حق تعالیٰ کے ان ارشادات پر یقین و ایمان رکھ کر خوف و غم، کرب و رنج کے وقت ہمیں اپنے نفس کو یقین دلانا چاہیے کہ۔

حق تعالیٰ اس جگہ حاضر و موجود ہیں الا انہ بكل شیء عیبط
 حق تعالیٰ قطعاً میرے ساتھ ہیں ہو معکم ایما کنتم
 حق تعالیٰ قطعاً میرے قریب ہیں۔ ان ربی قریب مجیب
 حق تعالیٰ قطعاً ہر جہت میں موجود ہیں فایما تولوا فثم وجہ اللہ

تواب

حضورِ حق رحمت ہے، حضورِ حق مسرت ہے، حضورِ حق امن و طمانیت ہے۔ اس مراقبہ و تدبیر سے حق کا ادراکِ انفس و آفاق میں قائم ہونے لگتا ہے اور ادراکِ حق کے قیام کے ساتھ خوف و حزن، غم و کرب و الم سب فائب ہو جاتے ہیں کیونکہ قلب ان کی سطح سے بہت بلند ہو جاتا ہے اور سکون و مسرت و امن و طمانیت کی لہریں اندر سے اٹھنے لگتی ہیں حق کو اپنے ساتھ پا کر وہ ان میں مشغول ہو جاتا ہے اور ان سے راضی اور جب وہ حق سے راضی ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اس طرح جب ہم نے اپنے خوف و حزن کو دور کر لیا اور حق تعالیٰ کی یافت و شہود کی بدولت قطرہ نور بن گئے، ذاتِ الہی کے سرور سے لطف اندوز ہونے لگے تو ہم اب اپنے دور افتادہ مجبور محبوب کی دعا کے ذریعہ مدد کر سکتے ہیں، ذرا احتیاط کے ساتھ اس طریقہ پر غور کرو۔

ہیں اس کی جانب سے یافت قائم کرنا ہے، اگر اس کی جان خطرہ میں ہے، اگر وہ بلاؤں میں گرفتار ہے تو جب ہم اس کا خیال کریں گے تو ہمارے قلب میں وہی تاریکی پیدا ہوگی جس میں وہ گھرا ہوا ہے۔ جب ہم نے اپنی تاریکی یافت حق کی وجہ سے دور کر لی تو اب ہمیں اس کی تاریکی اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور جس طرح اپنی تاریکی رفع کی تھی بالکل اسی طرح اس کے خیال سے پیدا ہونے والی تاریکی کو بھی دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ توصیفات ظاہر ہے کہ دوست کے غم سے ہمیں غم ہوتا ہے اس کی بے چینی ہمیں بے چین کرتی ہے۔ جب اس کے خطرے یا ضرر کا خیال قلب میں پیدا ہوا کہ قلب کی کیفیت بدلنے لگی اور اسی کیفیت کو حزن و خوف و کرب سے تعبیر کیا جاتا ہے، قلب کی کیفیت کو جب تم نے حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کے تذکرے سے حق تعالیٰ کی ذات کی یافت سے ان کے حضور و معیت و احاطت و قرب و قربیت کے ادراک فی الائنس و الافاق سے دور کر لیا کہ تمہارے محبوب کا خوف و حزن خود اس کے قلب سے ہٹ گیا اور چین و سکون کی کیفیت کا ظہور ہونے لگا۔

اپنے دور افتادہ محبوب کی مدد کرنے کا روحانی طریقہ بس یہی ہے کہ پہلے اس کے غم و مصیبت کے بوجھ کو اپنے کانڈھوں پر اٹھانا چاہیے اور اس کا درد اپنے قلب میں پیدا کرنا چاہیے اور پھر حق تعالیٰ کے ذکر اور ان کی یافت کے ذریعہ امن و طمانیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور اس طرح یہ بوجھ خود بخود اٹھ جاتا ہے اور اس کو بلا و مصیبت سے نجات مل جاتی ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز!

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے محبوب کو حق تعالیٰ کو تفویض کر دینا چاہیے۔ ہمیں اس کی صورت کو ذہن میں مستحضر کر کے حق تعالیٰ سے یوں معروضہ کرنا چاہیے، حق تعالیٰ میں نے ان کو آپ کے سپرد کیا، تفویض کیا انہیں نور اور نورانی کر دیجیے غافیت و امن عطا فرمائیے ان کی ضروریات کی تکمیل کیجیے، ربنا علیک توکلنا، حسنا اللہ و نعم الوکیل، نعم المولیٰ

ہیں اس امر کا بھی شدت کے ساتھ استحضار کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہماری اور ان کی زندگی کے ہر واقعہ کا بذات خود تعین فرما رہے ہیں اور بشارت رحمت تعین فرما رہے ہیں۔ اس استحضار ہی سے امر واقعہ کا تحقق ہوتا ہے پہلے سے اور ان کے لیے بھی انکے عند ظن عبدی بی سے اس کی تائید ہوتی ہے، حالات میں آسانی اور سہولت پیدا ہونے لگتی ہے حق تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن تقویٰ ہے اور متقی کی مراد حق تعالیٰ قطعاً پوری کرتے ہیں ۶

می دہیزداں مراد متعینین! (رہمی)

ومن یتق الله يجعل له من امره يسرا سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے اور من یتق الله يجعل له مخرجا اس پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔

امداد کے اس روحانی طریقے کے متعلق یہ بات واضح طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ کشف ضرر حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، مخلوق میں نہ اس کی قوت ہے اور نہ طاقت لا قوۃ الا باللہ حق تعالیٰ ہی فاعل ہیں اور مخلوق محض آلات، موثر حقیقی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، باقی اولیٰم و خیالات اوان یمسک الله بصر فلا کاشفت له الا هو وان یرد بخیر فلا راد لفضلہ یصیب بہ من یشاء من عبادہ وهو الغفور الرحیم (پ ۱۱۶)

یعنی اگر تم کو حق تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائیں تو بجز ان کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہیں تو ان کے فضل کا کوئی مہلنے والا نہیں وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والے ہیں جاتی نے اسی عقیدہ کے تحت فرمایا ہے:-

حق فاعل ہرچیز حق آلات بود تاثیر زالت از محالات بود

ہستی کہ موثر حقیقی است بکسیت باقی ہماہ اولیٰم و خیالات بود

جب ہم اپنے قلب میں اپنے محبوب کا درد لے کر مواجہ حق میں آجاتے ہیں تو حق ہی کے

نور سے ہمارا اور ہمارے محبوب کا درد رفع ہو جائے، فاعل و موثر قطعاً حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں
اور ہم محض وہ آلات جن کے ذریعہ ان کا فیضِ کرم جاری ہوتا ہے۔

اے سیرتو در سینہ صاحبِ راز پیوستہ در رحمت تو بر ہمہ باز
ہر کس کہ بدرگاہ تو آید بیساز محروم ز درگاہ تو کے گرد باز

اشرار حج

حج زیارت کردن خانہ بود حج رب البیت مردانہ بود (رومی)

صوفیائے کرام نے ہمیشہ مذہب کے ظاہری رسوم سے زیادہ ذور اس کی باطنی روح پر دیا
ہے، دین محمدی کی یہی دو حیثیتیں ہیں: ظاہری و باطنی!

”نیکی و طاعت کے ظاہری افعال سے قلب پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں ان
کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت یا تصوف کا مقصود اور مذہب
البعین ہے۔“

قرآنی تعالیمات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصل چیز ظاہری رسوم نہیں بلکہ باطنی روح ہے۔ دیکھو
قرآنی کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے وضاحت فرمادی ہے کہ:

”ذکر بانی کا گوشت حق تعالیٰ کے پاس پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ تقویٰ یا پارسائی ہے۔“

یعنی حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی محض قربانی کرنے یا خون بہا دینے سے نہیں حاصل ہوتی جب
تک کہ اس قربانی کا مدار حق تعالیٰ کی محبت، ان کی رضا جوئی، اور ان کی قرب طلبی نہ ہو ایسی
طرح دوسری جگہ واضح فرمایا گیا ہے کہ:-

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجْهَكُمْ قِبَلَ

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ

آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَخَرَّ عَلَىٰ

تَبَعٍ يُعْزِزُ كَيْفَ شَاءَ اللَّهُ هَاتَا ۗ لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لِحُومَهَا وَلَا دِمَائِهَا وَلَكِنْ يَنَالَ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ

یعنی محض کسی سمت کو قبلہ بنا کر اس کی طرف منہ پھیر لینے سے انسان کے اندر نیکی نہیں پیدا ہو سکتی

جب تک کہ اس کی بنیاد اللہ اور آخرت کے یقین و ایمان پر نہ ہو!

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیے کہ قرآنی تعلیمات اور اسلامی تصوف کی رو سے دنیا میں جس طرح انسانی روح بغیر انسانی جسم کے نہیں پائی جاتی اور اس کے روحانی افعال کا اعتبار بغیر جسمانی افعال کے نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا میں خاص خاص افعال یا جسمانی حرکات اور احوال کے بغیر روح کا ارتقا اور اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اسی لیے صوفیائے کرام نے باطن کے ساتھ ظاہر کی حفاظت پر پورا زور دیا ہے اور مستقدمین صوفیاء نے تصوف کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "وہ نام ہے تعمیر ظاہر و باطن کا" بالفاظ دیگر دونوں کی اصلاح و درستی ضروری ہے، نہ ظاہر بغیر باطن کے اور نہ باطن بغیر ظاہر کے درست ہو سکتا ہے۔ ظاہر عنوان ہے باطن کا، جب کسی ظاہری افعال شروع عمدی کے خلاف ہوں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کا باطن موافق و مطیع ہوگا، ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کا، کیسے ہو سکتا ہے کہ باطن درست ہو اور اس کا اثر ظاہر پر نہ پڑے، یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح ظاہری افعال کا اثر باطن پر چرتا ہے بلکہ ہر ظاہری عمل باطن کو متاثر کرتا ہے۔ ولیم جیمس جیسے ماہر نفسیات نے تو اس حد تک زور دیا ہے کہ "اگر تم باطن میں کوئی کیفیت یا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس کی ظاہری صورت پیدا کرو، تمہارا باطن متاثر ہوئے بغیر وہ نہیں سکتا" جیمس لینگ نظریہ کی تفصیلات کے آج کل جامعات کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔

حج کے تمام اعمال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر من جنس کا طرہ امتیاز حق تعالیٰ کی شہیر محبت ہے (الذین امنوا اللہ حبش اللہ) اپنے معشوق و محبت کے جذبہ کو جو اس کے قلب کی گسائیوں میں نہاں ہے ظاہری اعمال و اشکال میں ہویدا کر کے تاکہ

"اس کے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے، وہ بلند آواز سے بلیک کہتے ہوئے نعرے

لگاتے اور ان نعروں سے محبت کی چھپی دلی آگ کو بھڑکاتا ہے!

چنانچہ شاہ عبدالعزیز اپنی تفسیر میں ابراہیم طویل علیہ السلام کے حج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”باز ایشان را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را طالع شہداء ساختہ دیوانہ وار و عاشق کردار برائے گرد
گشتن خانہ محبوب خود بر ہنہ سر و بر ہنہ تن و بر ہنہ پا اثر و لیدہ مو، پریشان حال و گرد آلودہ از شام
بر زمین مجاز رسیدہ گلے بر کوہ و گاہے بر زمین رو بہ سوسے خانہ کردہ عاشادہ شہداء... گرد خانہ تجلی
آشیانہ او طواف کنند و بار بار کہناتے آن را بہ پوستہ و بلیندہ“

دیکھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے کو سرگشتہ و شہداء
بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے محبوب کے گھر کے گرد
ننگے سر تنگے پاؤں، اچھے ہونے بال، پریشان حالی کے ساتھ گرد میں لٹے ہوئے زمین
مجاز میں پہنچیں، اور وہاں پہنچ کر کبھی پہاڑ پر، کبھی زمین پر محبوب کے اسی گھر کی طرف
رُخ کر کے کھڑے ہوں..... اسی تجلی خانہ کے ارد گرد گھومیں اور اس کے گوشوں
کو چومیں چاہیں»

حج کے مناسک سے عشق و محبت کا یہی جذبہ ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر طواف کعبہ صفا
و مروت کے درمیان سعی، مزدلفہ کی آمد و رفت، عرفات میں قیام، منیٰ میں ذبح و قربانی، و تلبیہ و
احرام وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے۔

اعمالِ حج کے ان ہی باطنی اسرار کو ہم یہاں امام الصوفیہ حجۃ الاسلام حضرت غزالیؒ کے
اشارات کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں: **زین شہد یک نگشت سنا نم بلبت از لذت اگر محو نگردی تعفت کن!**

حق تعالیٰ کے گھر کی زیارت کا شوق عاشق کے قلب میں بھر نکل اٹھتا ہے! جس قلب
میں اس ”شاہِ خوابان“ کا عشق نہیں وہ مرد ہے ایایوں کیسے: **دل کہ فارغ شد ز عشق آن نگار
سنگ استخوانی شیطانش شمارا**

عاشق کی نگاہ میں اب دنیا کی ساری لذتیں ہیچ نظر آئے لگتی ہیں۔ سال و دولت، جاہ و عزت دوست و احباب اپنی دلخیزیاں کھودیتے ہیں! "زندے" کا عشق اس کو مردوں کی محبت سے بیزار کر دیتا ہے اور وہ صحیح اکتھال ہے۔

عشق با مردہ نیا شد پائیدار عشق را با حئی جان افزائے دار!
عشق زندہ در روان و در بصر ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ ترا
عشق آن زندہ گزین کو باقیست وز شراب جان فرایت ساقیت
عشق کن بگرمی کہ جملہ انبیاء یافتند از عشق او کار و کیا!
غرق عشق شو کہ غرق است اندریں عشق کے اولین و آخرین؛ (ردی)

اہل و عیال، دوست و احباب سے رخصت ہو کر جب وہ سوار ہوتا ہے تو اس کی نظر میں دارِ آخرت کی سواری آجاتی ہے، وہ اپنے جانے کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے جس پر سوار ہو کر اس کو ایک روز آخرت کی طرف کوچ کرنا ہو گا اور وہ جانتا ہے کہ یہ دن کچھ زیادہ دور تو نہیں ہو سکتا۔ ۶۰ کیں عمر بیک چشم زدن نقش بر آب است!

جب احرام کے لیے چادر خریدتا ہے تو اس کو وہ دن یاد آتا ہے جب اس کا تہ بے جان کفن میں لپیٹا جائیگا اور وہ ہے جس و حرکت پڑا ہو گا! اب اس کا ساتھ دینے والے نہ دوست احباب ہونگے اور نہ اہل و عیال صرف ایمان و عمل صالح ہی اس کے ساتھ جائینگے! وہ اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

يَا مَنْ بَدُنِيَا دَامَتْ عَلَيَّ قَدْ عَرَّكَ طَوْلُ الْأَمَلِ
الْمَوْتُ يَا قِيَّ بُغْتَةً وَالْعَبْرُ صَدُوقٌ لِلْعَمَلِ (حضرت علی)

سوچئے کہ احرام کی چادر تو خانہ کعبہ کے قریب پہنچ کر باندھنی پڑیگی، ممکن ہے کہ یہ سفر پورا نہ ہو سکے اور راہ ہی میں موت آجائے لیکن حق تعالیٰ سے ملاقات تو کفن میں لپیٹے ہوئے ہی ہوگی! کفن کی اس چادر پر نظر کر کے شکستہ دلی کے ساتھ حق تعالیٰ سے عرض کرتا ہے:۔

اللَّهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِمَاءِ الثَّلَاجِ وَ
 الْبُرْدِ وَنَقِّ قَلْبِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ
 الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ
 بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ
 الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (بخاری، عن عائشہ) فاصلہ کر کے جیسا کہ مشرق و مغرب میں تو نے
 جب اپنے شہر سے باہر نکل آتا ہے تو سوچتا ہے کہ اس نے اپنے اہل و عیال اور وطن سے جدا
 ہو کر ایسا سفر اختیار کیا ہے جو کسی طرح دنیا کے اور سفروں کے بالکل مشابہ نہیں! اس سفر سے
 اس کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، ان کے گھر کی زیارت ہے، ان کی رضا و خوشنودی ہے، حق تعالیٰ
 ہی کی پکار ہے، ان ہی کی توفیق سے، ان ہی کے شوق دلانے سے، ان ہی کے حکم پر وہ قطعِ علاقہ
 و ترکِ خلائق کر کے ان کے دربار کی طرف دیوانہ وار چل پڑا ہے، اس کی زبان پر ہے:-
 بِسْمِ اللَّهِ، مَا شَاءَ اللَّهُ، حَسْبِيَ اللَّهُ، لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ، اللَّهُمَّ إِلَيْكَ خَرَجْتُ أَنْتَ

اخروجتني!

من کہ باشم کہ براں خاطر خاطر گذرم لطفنامی کنی اے خاکِ دلت تاج سرم (عائشہ)
 اس کو حق تعالیٰ سے پوری امید ہوتی ہے کہ وہ اس سفر شوق میں اس کے ساتھ ہونگے اس
 کے نگہبان اور مددگار ہونگے، وہ حق تعالیٰ ہی کی دستگیری و رہبری سے اپنی منتہائے آرزو کو
 پائیگا، اپنے مولیٰ کے دیدار سے اپنی مراد کو پائیگا! یہ

من این دستے کہ افشاندم ز کونین بر امانِ تمنا کے تو باشدا (حزین)

سوچتا ہے کہ اگر وہ منزل مقصود کو پہنچے بھی نہ پایا اور راستہ ہی میں طعمہ اجل مسمی ہو گیا، پھر

بھی وہ تبارہ بارہ ہوگا! کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے:

وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا لِي

اللَّهُ وَاسْتَوَلَىٰ لِقَدِيدِ كَالْمَوْتِ الشَّارِعِ رَسُلِ كِي طَرَفِ هَجْرَتِ كَرَدِ نَحَا، پھر اس کو

فقد وقع اخيرا على الله " ايكے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ

ہاں، اس راہ میں موت بھی اچھی! کہہ سکیگا! ۵

حاصل عمر نثار رہے یارے کرم! شادم از زندگی خویش کہ کلمے کرم

اسی فکر و ذکر، اسی ولولہ و جنون میں وہ میقات پر پہنچ جاتا ہے، کپڑے اتارتا ہے اور احرام

کی چادریں باندھتا اور اوڑھتا ہے، ماسوا سے آزاد ہو کر حج اٹھتا ہے؛

لَيْتِكَ اللَّهُ لَتَيْتِكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَتَيْتِكَ!

آنکھوں سے اس کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، دل سے سرو آہیں نکلتی ہیں، اور زبان سے یہ چیخ:

مار از خاک کویت پیرا ہن است برتن! انہم ز آب دیدہ صد چاک تابدا من (جالی)

جاتا ہے کہ لبیک کی یہ پکار حق تعالیٰ کی اس پکار کے جواب میں ہے کہ:-

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَذِخْرُكُم مِّنْ ذُنُوبِهِمْ وَأَنذَرْنِي يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ سَمِعَتْ بِمَرَأَىٰ آلِ كُرَيْشٍ إِذْ يَبْعَثُونَ عِزْرَةَ

اور اس کا خیال عرصہ قیامت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے کہ جب صور بھونکا جائیگا

اور لوگ اسی طرح پکارے جائیں گے اور وہ اپنی قبروں سے نکل کر میدان قیامت میں جمع ہونگے اور

حق تعالیٰ کی پکار کا جواب دینگے پھر ان میں سے بعض مقبول ہونگے اور بعض مردود! ابتدا میں

تڑوہر ایک کو ہوگا، خوف ورجا ہر ایک کے سینہ میں ہوگی! دل ہی دل میں حق تعالیٰ سے کہتا ہے کہ

کارے بجزگتہ نذاریم یا حنیظا عذرتے بخیراہ نذاریم یا حنیظا!

ہر چند روسیہاہ و گنہگارو مجرم جزدعتت پناہ نذاریم یا حنیظا! (جذاب)

تو بے استغفار، تسبیح و تہلیل سے ندامت و شوق، رجا و خوف میں اس کی ہر ساعت بسر ہوتی ہے۔

دل میں حسرتوں کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ راہ کی صورتیں بدداشت کیے بڑھتا جاتا ہے! کہیں کہتا ہے:-

اشد افسوس قدر و مقصود دگر ہے پیک خیال راہ میں تھک تھک کے رہ گیا

جدہ کا قیام، ساتھیوں کی پریشانی اس کو متاثر نہیں کرتی، وہ تو "مخو خیال" یاڑ ہے؛

وہ تڑی گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مرنے لگے ہے یہ مری زمین نیاز مٹی کہ ہمان صری مٹی دھری ہی

انتظار کی ساعتیں گزرتی جاتی ہیں اور وہ بیابانی میں گنگناٹا جاتا ہے:-

نظر ہے وقفِ غم (انتظار کیا کہنا کھنچی ہر سانسے تصویر یار کیا کہنا۔ مگر مراد آبادی)

اب قافلہ کہ معطلہ میں داخل ہو رہا ہے! حرم مامون میں پہنچ رہا ہے! امنِ داخلہ کا ان امانا

کی نوید اس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ "بلد امین میں داخل ہو کر دمِ حیات اٹھتا ہے:-"

ذرہ خاکم و در کوئے توام وقت خوش است ترسم اے دوست کہ پاوے نہ بزدنا کا ہم! (حافظ)

آگے بڑھ کر جب اس کی نظر بیت اللہ پر پڑتی ہے تو رب البیت کی تجلی سے اس کے ہوش و حواس

گم ہو جاتے ہیں۔

آمد خیرے ز آمد نو من بعد خبر نماند مارا!

وہ بیت "کو نہیں، گویا" رب البیت کو دیکھ رہا ہے!

آنکھوں میں رٹے یا رہے، آنکھیں میں رٹے یا رہے

ذرہ ہر آفتاب میں، ذرے میں آفتاب ہے!

اسی ذوق و خوق کو لیے ہوئے وہ طواف کے لیے بڑھتا ہے، اس کے قلب میں تقسیم، خوف ورجا،

عشق و محبت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، اس کا جسم فائز کعبہ کے طواف میں مصروف ہوتا ہے

لیکن اس کی روح رب البیت کے گرد گھومتی ہے، اس کا دل حضرت ربوبیت کا طواف کرتا ہے،

ان پر فدا ہوتا ہے، نثار ہوتا ہے، چھتا ہے،

یک جان چہ متاھست کہ ساریم فدایت

انا چہ تو ان کر دکہ موجود ہیں است!

جب حجرِ اسود کو بوسہ دیتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ پر بیت کر رہا ہے۔ اظہارِ

فرمانبرداری، عہدیت و عبودیت کا اقرار کر رہا ہے، حجرِ اسود "بیمین اللہ عزوجل فی الارض من"

ہر حق تعالیٰ کا ماہنا ہاتھ پر زمین پر، یصافہ بها خلقہ کما یصافہ الرجل اخاہ" جس سے وہ

۱۔ سلم بروایت عبد اللہ بن عمرؓ

اپنے بندوں کے ساتھ مصالحتہ کرتے ہیں! وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عرض کرتا ہے:۔

یارب نمم و دست تہی چشم پر آب جاں دادہ و دل سوختہ و سینہ کباب

نامہ سیر، و مگر تہ، کار حسراب از روئے کرم بفضائل خویشم دریاب

پھر کتبہ اللہ کے پردہ کو پکارتا ہے یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ کے دامن کو پکارتا ہے اور ملتزم سے چھٹنا

ہر یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ سے قریب ہو رہا ہے، رور و کر عرض کرتا ہے:۔

تو کریم مطلق و من گدا چینی جزائیکہ نخائیم و در دیگر بنا کہ من بہ کجا روم چو برائیم

ہمہ عمر ہرزہ دویدہ ام غلم کنوں کہ خمیدام من اگر بخلقہ تنیدہ ام تو بردن در نشائیم (بیتل)

آپ کا دامن چھوڑ کر کہاں جاؤں، کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، کس کے قدم پکڑ لوں؟ میری پناہ گاہ آپ

ہیں، میرا بجا و ماویٰ آپ کے سوا کون ہے؟ آپ کے کرم و عفو کے سوا میرا ٹھکانا نہیں! آپ کا دامن

نہ چھوڑونگا جب تک کہ آپ اپنی رحمت سے میری سب کاریوں کو معاف نہ فرمائیں، اور آئندہ

دامن میں پورش نہ فرمائیں! حق تعالیٰ آپ کریم ہیں، و در کریم پیچر و نیاز کے ساتھ آیا ہوں،

دیدہ اشکبار کے ساتھ آیا ہوں، دردِ دل، نالہ جاں آزار کے ساتھ آیا ہوں، اگر آپ دامن عفو

میں پناہ نہ دیں تو کہاں جاؤں، کیا کروں!۔

یارب دلم از بارگنہ مخزون است جاں زار و دل بافکار و جگر پر خون است

ہر چند گستاہ من ز حد بیرون است عفو ت ز گناہ من بے افزون است (درد)

صفا و مروہ کے درمیان جب وہ سعی کرتا ہے تو یہ احساسِ قلب میں لیے ہوئے کہ ایک فقیر،

مسکین، حقیر و ذلیل غلام اپنے آقا، مالک، بادشاہ کے محل کے صحن میں بار بار چکر لگاتا ہے، نظر

کرم کا لٹیچی ہے، زبان پر سوال ہے کہ:

”رب اغفر وارحم و تجاوز عتاتنا تعلم انک انت الاعز الاکرم“

بار بار گھومتا ہے اور آواز لگاتا ہے کہ:

عبیدک بفنائک! مسکینک بفنائک! فقیرک بفنائک! سائلک بفنائک! انت

کریم رحیم الرحمنی و اعفرو لی یا رحیم یا کریم یا غفور!
 جانتا ہے کہ کوئی سائل اس در سے محروم نہیں جاتا، یہ کریم کا دروازہ ہے، اس کو چوکھٹا کھٹاتا ہے
 وہ اپنی مراد کو پاتا ہے :-

گفت پیغمبر کہ چون کو بی درے عاقبت زان در بروں آید سرے
 سایہ حق بر سر بندہ بود عاقبت جو بندہ یا بندہ بود
 چون نشینی بر سر کوسے کسے عاقبت ہمینی تو ہم روئے کسے
 چون ز چاہے مکنی ہر روز خاک عاقبت اندر رسی در آب پاک

عرفات کے میدان میں جب وہ قدم رکھتا ہے اور لوگوں کا ازدحام اور آوازوں کا بلند ہونا
 اور زبانوں کا اختلاف جب اس کو نظر آتا ہے تو اس کو میدانِ قیامت کا منظر یاد آتا ہے کہ اس
 روز بھی ہر امت اپنے نبی کے ساتھ اسی طرح جمع ہوگی اور اس کی پیروی کریگی اور اس کی
 شفاعت کی امید کریگی، اب وہ اضطراب کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور چہچہاتا ہے:

یا من لا یثقلہ شأن سن اے وہ ذات مطلق کہ جس کو ایک حال دوسرے حال
 شأن ولا سمع عن سمیع ولا سے نہیں روکتا اور نہ ایک عرض کا سنا دوسرے عرض
 تشبہ علیہ الاصوات یا کے سننے سے باز رکھتا ہے، اور نہ مشتبہ ہوتی ہیں اس پر
 من لا تغلطہ المسائل ولا آوازیں! اے وہ ذات مطلق کہ جس کو بہت سے سوال
 تختلف علیہ اللغات یا من مغالطہ میں نہیں ڈال سکتے اور نہ مختلف ہیں اس کے نزدیک
 لا یرمد الحاج الملحین و بہت سی زبانیں! اے وہ ذات پاک جس کو ہٹ کرنے والوں
 لا تفجرہ مسئل السائلین کا اصرار رکھتا نہیں دیتا اور مانگنے والوں کا سوال تنگ نہیں
 اذ قنابرد عفوک و حلاوة کرنا ہم کو اپنے عفو کی ٹھنڈک اور رحمت کی حلاوت سے آشنا

رحمتک! کر! (روعات خضر علیہ السلام)

پھر رو کر کہتا ہے :-

الہی! انت انت وانا انا، انا حق تعالیٰ آپ آپ ہیں اور میں میں ہوں! میں گناہوں کی طرف
 العواد الی الذنوب وانت بار بار پلٹتا ہوں اور آپ مغفرت کی طرف بار بار رجوع
 الی المغفرة! الہی ان کنت لا کرتے ہیں! حق تعالیٰ اگر آپ اپنے طاعت والوں ہی پر
 ترحملا اهل طاعتك فالمن رحم کریں تو گنہگار کس طرف ملتی ہوں؟
 من یفرغ المذنبون:

الہی تجتبت عن طاعتك عمدا حق تعالیٰ میں آپ کی اطاعت سے قصداً علیحدہ ہوا اور
 وتوجھت الی معصیتك قصدا آپ کی نافرمانی پر دانستہ متوجہ ہوا، آپ پاک ہیں آپ کی حجت مجھ
 فیحنک ما اعظم حجتك علی و پر کتنی بڑی ہے اور آپ کا مجھے معاف کرنا کتنا بڑا کرم ہے پس جس مشور
 ما اکرم عفوک عنی فبوجوب میں کہ آپ کی حجت مجھ پر ضروری ہوئی، میری حجت آپ کے ہاں
 حجتك علی واقطاع حجتك عنک جاتی رہی، میں آپ کا محتاج ہوں اور آپ مجھ سے بے پروا
 وفقری الیک وغناک عنی الا بے نیاز آپ مجھے معاف ہی فرما دیجیے! اے ان سے بہتر ذات جن کو
 غفرت لی! یا خیر من دعاء جن کو کوئی دعا مانگنے والا پہنچا اور افضل ان میں سے کوئی توقع رکھو والا نہ ہو
 داغ وافضل من رجاء راجع الیہ اسلام کی حرمت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کا
 الاسلام وبن محمد علیہ السلام وسیلہ تیرے سامنے پیش کرتا ہوں، میرے سارے گناہ
 اتوسل الیک فاغفر لی جمیع بخش دیجیے اور مجھے اس موقع سے حاجتیں پہنچی
 ذنوبی واصرفنی عن موقفی هذا کر کے لٹائیے اور جو کچھ میں نے مانگا ہے وہ لاد دیجیے اور
 مقضی الخواتم وھب لی ما سألتم جس چیز کی میں نے تمنا کی اس میں میری توقع پوری
 وحقق رجای فیما تمنیت! کیجیے!

پھر ملا تیرے در و بھرے دل سے!

الہی! اجیرے سامنے اپنی تعریف کیا کرے میں تو اپنے
 الہی من مدحک نفسہ فانی نفس کو طامست کرتا ہوں! الہی گناہوں نے میری زبان
 لا ثم قسی! الہی! افرست للعالمی

لسانی فمالی وسیلۃ من عملی و
 لا شفیع سوی الا علی! الہی انی
 اعلم ان ذنوبی لم یتبق لی عندک
 جاہاً ولا للاعتذار وجہاً ولکنک
 اکرم الا کرہین الہی ان لم اکن اہلاً
 ان ابلغ رحمتک فان رحمتک
 اهل ان تبلغنی ورحمتک سعۃ
 کل شیء وانا شیء! الہی ان ذنوبی
 وان کانت عظاماً ولکنہا صغائر
 فی جنب عفوک! فاغفرہالی یا کریم!

گوئی کردی، پس مجھ کو اپنے عمل کا وسیلہ نہ رہا اور نہ سزا
 امید کے اور کوئی سفارش کرنے والا! الہی مجھے معلوم
 ہے کہ میرے گناہوں نے تیرے نزدیک میری قدر
 کچھ باقی نہ رکھی اور نہ عذر کرنے کی کوئی صورت
 چھوڑی لیکن تو تمام کریوں سے زیادہ کریم ہے! الہی
 اگر میں اس قابل نہیں کہ تیری رحمت تک پہنچوں
 تو تیری رحمت تو شایاں ہے کہ مجھ تک پہنچے! الہی
 تیری رحمت ہر چیز کو شامل ہے اور میں بھی ایک چیز
 ہوں! الہی اگرچہ میرے گناہ بڑے ہیں لیکن تیرے
 عفو کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں! میرے گناہوں سے
 درگزر کرے کریم!

جانتا ہے کہ یہ وہ مبارک مقام ہے جہاں حق تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور ان رحمتوں کو
 وہ قلوب جذب کرتے ہیں جو اس میدان میں موجود ہوتے ہیں، یہ ابدال و اوقات کے قلوب ہیں،
 ان صاحبین کے قلوب ہیں جو حق تعالیٰ کے آگے سربسجود ہیں، ان کے حضور میں دست بستہ
 دولت و مسکنت کے ساتھ گڑ گڑا رہے ہیں! رحمت الہی کے جذب کا اس سے زیادہ قوی و موثر
 کوئی طریقہ نہیں کہ:

ان ابرار کی ہمتیں اکٹھی ہوں اور ایک وقت میں ایک زمین پر قلوب ایک دوسرے
 کی مدد کریں!

اس ادراک کے ساتھ ہی اس کی زبان سے یہ چیخ نکلتی ہے:

عشناکم وادرتوباعنم نروم جز شادو امیدوار و خرم نروم

اے یہ سب دعائیں ایسا رسولم باب نم سے کی گئی ہیں۔ فیخرج۔

از درگہ سچو تو کرتے ہرگز نوسید کے نرفت ومن ہم نروم (ابوسعید)

اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

عفات شریف کے میدان میں آکر یہ سمجھنا کہ حق تعالیٰ نے میری مغفرت نہیں کی،
سب سے بڑا گناہ ہے۔“

رحمت اینجا کہ کند وسعت خود را ظاہر

ہر کہ تقصیر نہ کرد است گنہ گار تراست!

رحمی ہمارے موقع پر احرام باندھتے وقت کے اپنے اس قول کو یاد کرتا ہے کہ:

لبيك لحجة حقا تعبدن او سرفتا

اور محض اپنی غلامی و بندگی کے اظہار کے لیے امر کی اطاعت کا قصد کرتا ہے اور محض تعمیل ارشاد
واقتمال امر الہی کے لیے رمی کرتا ہے، جانتا ہے کہ اس فعل میں نہ تو نفس کو کوئی خطبہ ہے اور نہ عقل
کو اپنی عقل اور نفس کو حق تعالیٰ کے حکم پر قربان کرتا ہے، اور دیوانہ وار اقامت ذکر اللہ
کے لیے شیطان پر کنکر مارتا ہے اور زبان سے کہتا جاتا ہے:-

الله اكبر على طاعة الرحمن و رستم الشيطان تصد يقا بكتابك واتباعا

لسنة نبيك -

جب قربانی کرتا ہے تو جانتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم پر وہ اپنی بھی جان قربانی کے جانور کی
طرح فدا کرنے کو تیار ہوگا بلکہ عاشق کی زندگی تو ہر زمان مردنی ہے وہ اپنی جان کو ہر دم فدا کر ہی

رہتا ہے!

اسے حیاتِ عاشقان در مردگی

ماہا و خوں بہارا یا نسیم

دل نیابی جز کہ دزدل بردگی

جانپ جاں باخشن بشتا لیتیم

یہ میں حاضر ہوں حج کے واسطے حقیقت میں بندگی اور غلامی کی راہ سے (دار فطی در علی بروایت حضرت انس)
لہ انما جعل الطواف بالبيت والسعي بين الصفا والمروة ورمي حماري لا قامة ذكر الله ولا لغيرة يعني طواف
کعبہ اور سعی در میان صفا و مروہ اور کنکر یوں کا پھینکنا ذکر اللہ کے قائم رکھنے کے واسطے مقرر کیا گیا ہے (ابو داؤد و ترمذی بروایت

عاشقان را ہر زمانے میں
 مردن عشاق خود یک نوع نیست
 اور دو صد جان دار داز نور ہدی
 و او دو صد رامی کند ہر دم فدا
 ہر یکے جان راستا ندہ ہسا
 از نبی خواں عشرۃ امثالہا (ردی)
 غم جنج کے اعمال میں دل کا وظیفہ یہ ہے جس کا اجمالاً او پر ذکر ہوا، قلب کی یاد کے ساتھ
 جنج کے اعمال وہی ادا کرتا ہے جس کے دل پر حق تعالیٰ کی محبت و غلامی کا داغ ہوتا ہے اور ہر
 ہے کہ جس غلام کو خود بادشاہ خریدتا ہے اس کا مرتبہ سوا ہوتا ہے۔
 داغ غلامیت کر دیا یہ خسرو بلند
 صدر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

زیارتِ مدینہ

”زیارتِ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور کد مستحبات و افضل قربات سے ہے اور صاحبِ
 قدرت کے لیے قریب واجب کے ہے!“

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محل از وطن!
 خیزم چو گرد، انتم چو اشک، ایم بسرا غلظم بہ تن (راحدی)
 مدینہ رسول کی راہ میں درود کے شغل سے بہتر کوئی شغل نہیں۔
 إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا
 تَسْلِيمًا۔ من صلی علی واحدہ صلی اللہ علیہ عشرًا (مسلم)
 اس راستہ کو درود و سلام کے ورد ہی میں ختم کرنا چاہیے، محبت نبوی کا تقاضا یہی ہے۔
 من مذہبی حب النبی و صحبہ
 وللناس فیما یعتقون ذلہب

لہ وہ ماتدآن، اشارہ بایہ من جاء بالحسنۃ فلیعشر امثالہا (سورۃ الانعام)

تذکرہ مولانا صدیق حسن مرحوم، در الشامۃ الغبریۃ من مولد خیر البریہ ص ۱۲۰

جب مدینہ منورہ کی دیواروں پر نظر پڑتی ہے تو عاشق کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ یہ وہ مبارک شہر ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لیے پسند فرمایا ہے، اور اس کو ان کا دارالہجرۃ بنایا ہے۔ یہ وہ مقام مقدس ہے جہاں آپ نے حق تعالیٰ کے فرائض و سنن مشروع فرمائے، اعدائے دین سے جہاد کیا اور حق تعالیٰ کے دین کو ظاہر کیا، اسی پاک زمین میں آپ نے اپنی زندگی بسر فرمائی، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنے جوار رحمت میں بلالیا اور آپ کی قبر مطہر اس میں مقرر فرمائی، اور آپ کے دو وزیر جو آپ کے احکام کی بجا آوری میں کامل تھے آپ ہی کے پہلو میں آرام فرما رہے ہیں! اس خیال کے آتے ہی وہ فرط مسرت سے چیخ اٹھتا ہے:۔

من ویشرب کہ بہ از نور بود خاک آنجا!	باشد از ہر صہبین سایہ افلاک آنجا!
شرفے خاک رہش راست کہ با بودن آب	از تیمم شود اعضائے وضو پاک آنجا!
بجز رحمت شود آن قطرہ کہ از سے ریزد	چون کند تاب سفر جبہ عرقناک آنجا!
صاحبش راست جنابے کہ ز بس تعظیمش	بال جبرئیل برود خس و خاشاک آنجا!

(مولوی احسان اللہ ممتاز)

جب عاشق رسول مدینہ منورہ کی پاک زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کی زبان سے بے اختیار

نکلتا ہے:۔

اندرد وہاں کعبہ ماکوئے محمدؐ

محراب دل و جاں ضم ابروئے محمدؐ

وہ دیوانہ وار حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

اللہ! ایسے جذبِ محبت کو کیا کروں!

رگ رگ کو جس نے درد بھر ادل بنادیا

ہر قدم پر وہ یہ سوچتا ہے کہ اس مقام پر آتے نامدار کے قدم پڑے ہونگے، قدم اٹھاتا ہے

پھر ٹھہر جاتا ہے، پڑھتا ہے، پھر تقلم جاتا ہے۔

ترے کپے میں ہم کل اس طرح سے جا بجا ٹھہرے
چلے چل کر تھے، تھم کر بڑھے، بڑھ کر ذرا ٹھہرے

اس گلی کے ہر ذرے کو وہ اپنا دل سمجھتا ہے۔ ۶

ہم اس کوچے کے ہر ذرے کو اپنا دل سمجھتے ہیں

تجلیات جب اس کو لگے قدم بڑھانے نہیں دیتیں، تو وہ چنچلتا ہے مہ

پایم بہ پیش از سر این کوئی رود

یا راں خرد بید کہ این جلوہ گاہر کیست (نظیری)

اسی محبت کی تجلی میں وہ دیکھتا ہے کہ: ۶

کوچہ جاناں کا ہر ذرہ چرخِ طور ہے!

اپنے محبوب کا وہ خیال کرتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی معرفت کس درجہ آپ کو عطا فرمائی تھی!

آپ کے ذکر کو کس درجہ بلند فرمایا تھا کہ اپنے ذکر کے ساتھ اس کو ملا دیا تھا، دفعتاً لک ذکرک کی

نویں سے آپ کو سرفراز فرمایا تھا! آپ کی تعظیم کے ترک کرنے پر کیسی وعید فرمائی تھی، گو آپ کی آواز

پر اپنی آواز نہی کے بلند کرنے سے وہ ترکِ تعظیم کیوں نہ ہوا! جبطِ اعمال اس کی سزا تھی! پھر نظامیؒ

کے الفاظ میں وہ اس طرح شاخاں ہوتا ہے ۷

ختم رسل خاتم پیغمبران

شمسہ ز مسندِ مہفت اختران

ہر دو جہاں بستہ فزاک اوست

احمد رسل کہ خرد خاک اوست

از الف آدم و میم مسیح

امی گویا بہ زبان فصیح

روح تو پروردہ روحی فزاک

اے تن تو پاک تر از جان پاک

سایہ شین چند بود آفتاب

اے مدنی برقع و کی نقاب

تاج وہ گوہر آزادگان

اے گوہر تاج فرستادگان

پھر وہ خیال کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان نیک بختوں پر کتنا بڑا احسان فرمایا، جنہوں نے

آپ کی صحبت پائی، اور مشاہدہ جمال، استماع اقوال و ملاحظہ احوال سے سعادت حاصل کی اور اپنے حال پر آنسو بہاتا ہے کہ یہ دولتِ سرمدی مجھے نصیب نہ ہوئی، اور نہ آپ کے اصحابِ کرام کی صحبت ملی! دنیا میں تو آپ کو نہ دیکھا، آخرت میں بھی شاید آپ کی زیارت نگاہِ حسرت ہی سے ہو اور اعمالِ بد کے باعث آپ ہیں قبول نہ فرمائیں کیونکہ آپ کا ارشاد مبارک ہے کہ: "قیامت کے روز کچھ لوگوں کو فرشتے دوزخ کی طرف لے جائیں گے (جن میں اپنی امت کی بعض نشانیاں دیکھ کر ہیں حق تعالیٰ سے عرض کرونگا، حق تعالیٰ یہ میرے لوگ ہیں! حکم ہوگا کہ نہیں، تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کام کیے ہیں! تب میں کہوں گا کہ مجھ سے دو سو اونچے سے دو سو اونچے" (رواہ شیخان)

یہ حال ان لوگوں کا ہوگا جنہوں نے شریعتِ مطہرہ کی توفیر نہیں کی، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر نہ سمجھی اور بدعت کو ترجیح دی اب وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے، اس عید سے کانپ اٹھتا ہے، اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، چیتا ہے۔

ہر چند گناہ بے شمار است صد مرتبہ بے شمار توبہ

در بارگت کم حنہ دایا بادیدہ اشکبار توبہ

گرفت بہ ترأت عسرم کردم نہ بیک دو بار توبہ

شد ہر سر موکنوں زبانی آرم بتو بار بار توبہ (لا اعلیٰ)

پھر عرقِ خجالت میں غرق ہو کر حق تعالیٰ سے التماس کرتا ہے :-

توغنی از ہر دو عالم فقیر روزِ محشر عذر را! پذیر

یا اگر بینی جسام ناگزیر از نگاہِ مصطفیٰ پندار بلیر! (اقبال)

پھر امید ورجا کی موج اس کے سینے میں اٹھتی ہے، وہ اس امر کا احساس کرتا ہے کہ

حق تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے اس کو سرفراز فرمایا، اپنے محبوب کی زیارت کے لیے

وطن سے نکال کر اس مقدس مقام پر پہنچایا، حظِ دنیا یا تجارت اس سفر سے اس کا مقصود

دعا، فقط آپ کی بے پایاں محبت اور آپ کے آثار کے دیکھنے کے شوق ہی نے اس کو وطن
الوت سے نکالا، زندگی میں جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوا تو اس نے اس پر ہی تکیہ
کی کہ آپ کی مسجد مبارک میں حاضر ہو کر آپ کی قبر اطہر کی دیوار پر ہی نظر ڈالے۔

غیبے گر روی بہر رویا روی در مسجد مصفاکن

دوست را اگر نبی توانی دید خانہ دوست راتما شاکن

جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ سامان متیا کر دیے تو اب اس کی رحمت
سے یہی توقع ہے کہ وہ اس کی طرف نظر رحمت سے دیکھینگے، اور اس کے گناہوں کو معاف

فرمائینگے۔۔۔ اندر علم انچہ ترا شاید نیست

اندر کرمات انچہ مرا باید بہت

جب مسجد نبوی میں قدم رکھتا ہے تو یہ سوچتا ہے کہ یہ وہ مقدس جگہ ہے جس کو حق
تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم اور مسلمانوں میں سے اول اور افضل لوگوں کے لیے تجویز فرمایا، جو تہل

عارف روی ہے برترند از عرش و کرسی و خلا

ساکنان مقعد صدق خدا

اور جو حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب و مطلوب و پسند رہے ہیں۔

جانتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حق تعالیٰ کے فرائض ادا ہوتے، اور
کامل عبودیت کے ساتھ ادا ہوتے؛ یہی وہ زمین ہے جس میں تمام مخلوق سے افضل و برتر
لوگ حالت حیات و حالت ممات میں جمع ہیں؛ اب وہ توقع کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس
پر بھی رحم فرمائینگے، اور دل ہی دل میں عرض کرتا ہے:

بضاعت نیاوردم الا امید

خدا یا ز عفوم مکن نا امید

پھر مسجد مبارک میں خشوع و تعظیم سے داخل ہوتا ہے، زبان پر یہ دعا ہوتی ہے:-

اللهم هذا هم رسولك فاجعل لي وقاية من النار واما نانا من العذاب وسوء
الحساب اللهم افتح لي ابواب رحمتك وارزقني من زيارة نبيك ما رزقت
اوليائك واهل طاعتك واغفر لي وارحمني يا خير مسئول -

پھر نیت اعتکاف الی الخروج کر کے روضہ جنت کی طرف بڑھتا ہوا اور محراب نبوی کے
پاس، ممکن ہو تو مصلی نبوی یا اس سے متصل یا منبر کے پاس، اور نہ ہو سکے تو کسی ایک مقام
پر تھیجۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کرتا ہے، پھر اس نعمت عظمیٰ کے حصول پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا
ہے اور رضا، توفیق خیر، قبول اعمال دہلوع مقاصد کی دعا کرتا ہے! دعا کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:

اللهم ان هذه رحمة من رياض الجنة شرفتها وكرمها وعجدها وعظمتها
ونورها بنور نبيك وحبيبك محمد صلى الله عليه وسلم اللهم كما بلغتنا في
الدنيا زيارته وما آثره الشرفية فلا تحرمنا يا الله في الآخرة من فضل
شفاعة محمد صلى الله عليه وسلم واحشرنا في زهرته وتحت لوائه وامتنا
على محبته وملته واسقنا من حوضه للمودود بيد الشرفية شربة هنية
لا نطشاء بعدها انذا انك على كل شيء قدير -

پھر زیارت کی نیت سے نہایت ادب و خشوع کے ساتھ روضہ پاک کے سامنے حاضر
ہوتا ہے، اس کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے آنے، کھڑے ہونے، اور
زیارت کرنے کا علم ہوتا ہے، اور اس کا درود و سلام آپ کی خدمت مبارک میں پہنچتا ہے۔
آپ نے فرمایا کہ:

من صلى علي واحدة صلى الله عليه عشرا (مسلم)

یہ بجز تو صرف زبان سے درود پڑھنے کی ہے، جب وہ خود زیارت کے لیے تمام بدن سے

شہ یہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جو لوگ میری قبر پر آکر سلام کریں گے میں اس کا سلام خود سنوں گا
اور دور سے سلام کرنے والوں کا سلام مجھے پہنچایا جائیگا" (مشکوٰۃ)

حاضر ہوا ہے تو اس کا بدلہ کس قدر عظیم الشان ہوگا:

اب وہ اپنے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے:
 الصلوة والسلام عليك ايها النبي السيد الكريم والبرسوق العظيم والحبيب
 الرؤوف الرحيم ورحمة الله وبركاته الصلوة والسلام عليك يا محمد بن
 عبد الله بن عبد المطلب ابن هاشم يا طه يا نبي يا بشير يا سراج يا مبين
 يا مقدم هجيش الانبياء والمرسلين

يا خير من دفنت في التراب اعظمه
 فطاب من طيبهن القام والاکم
 نفسى القداء لقبرانت ساكنه
 فيه العفاف وفيه الجود والكرم
 انت الحبيب الذي ترحى شفاعتك
 عند المصراط اذا ما زلت القدم

پھر صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر شریف کے پاس حاضر ہوتا ہے اور تصور کرتا ہے
 کہ گویا آپ منبر پر چڑھے کھڑے ہیں اور مجاہدین و انصار آپ کے گرد حلقہ کیے ہوئے ہیں اور
 آپ ان کو خطبے میں حق تعالیٰ کی اطاعت کی ترغیب و ہمت دلاتے ہیں اور نافرمانی سے روک
 رہے ہیں اور ڈراتے ہیں۔

محمد شہنشاہ خیلِ رسل
 درخشاں دردیج عبدمناف
 زا بروش محراب عین لہفتین
 فلک از دریاں در شبنم
 کہ خرد نیشیش چه جز وہ گل
 بانگشت اعجاز مرہ را شکاف
 ز گیسوش اسباب جبل المتین
 فصیحاں ز غوغاش در لبکے

چنان عقده از کار آمنت کشاد
 کہ دریاں دریں کار بر باد دادا (ظہوری)

دل میں توحید پر جینے مرنے کا پختہ عزم کرتا ہے، حضورؐ کی نجات کو قلب میں اور زیادہ واضح
 کرتا ہے، اور آپؐ کی سنت مطہرہ پر ساری عمر عمل کا پورا ارادہ کرتا ہے، اس عقیدے کو پختہ کرتا ہے کہ

حق تعالیٰ ہر حال میں اس کے نگران ہیں۔ "الم يعلم بان الله يرى"۔ اس کے دل کے دوسروں اور خفیہ خطرات و خیالات کو دیکھتے اور جانتے ہیں تاکہ سب کاموں میں ادب کا لحاظ رکھے جیسے کہ کوئی شخص کسی بادشاہ کی نظروں کے سامنے ہے، ہر وقت گردن جھکائے، اور ہر کام میں ادب! اس تقین کو بھی دل میں مضبوط کرنا ہے کہ:

"مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ"

یعنی طاعات کو ثواب سے ایسی نسبت ہے کہ جیسے غذا کو پیٹ بھرنے سے اور گناہوں

کو عذاب سے وہ تعلق ہے جو زہر کو ہلاکت سے!

عزم کرنا ہے کہ اپنے تمام حرکات و سکنات، خطرات و لحظات، لفظات و فلماآت، عذرات و فحرات پر ہمیشہ نظر رکھیں، اور تقویٰ کے اختیار کرنے میں اور ہر برائی سے اجتناب کرنے میں مبالغہ سے کام لیں۔ بحول اللہ و قوتہ

آخر میں اس تسکین بخش عقیدے کو بھی پختہ کرنا ہے کہ رزق کی کفالت خود حق تعالیٰ نے فرمائی

ہے یہ کہہ کر کہ:-

"مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ مَرْئِيَةٌ"

یہ رزق مضمون ضرور ملیگا، جتنا مقدر ہے وہ قطعاً پہنچ کر رہیگا، طلب رزق بطور شرعی کرنا چاہیے اور جو چیز فوت ہو جائے اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے۔

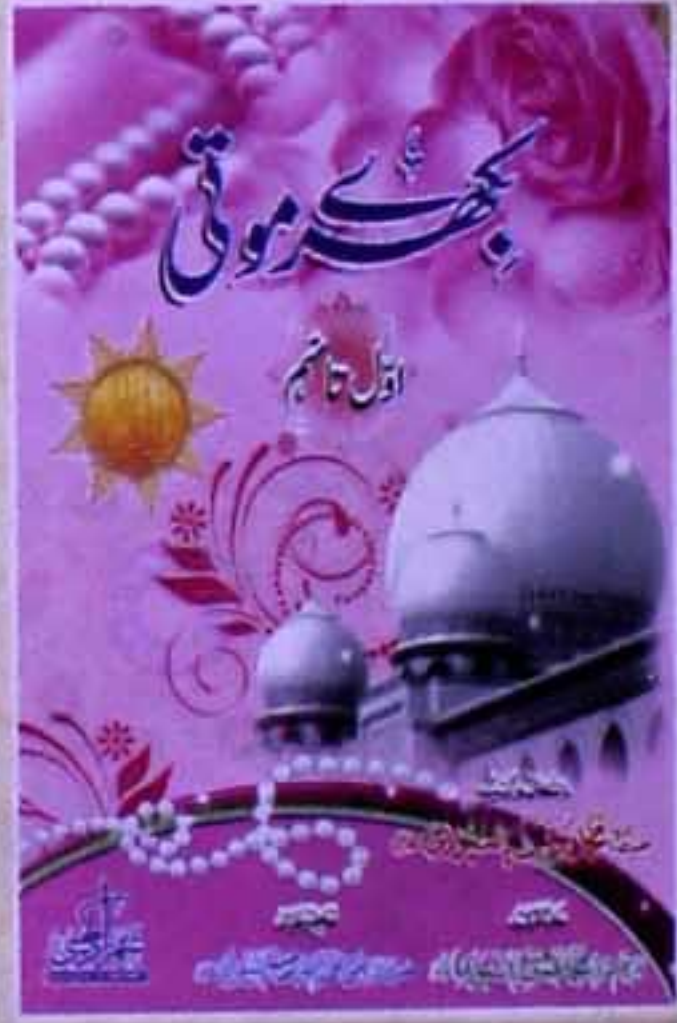
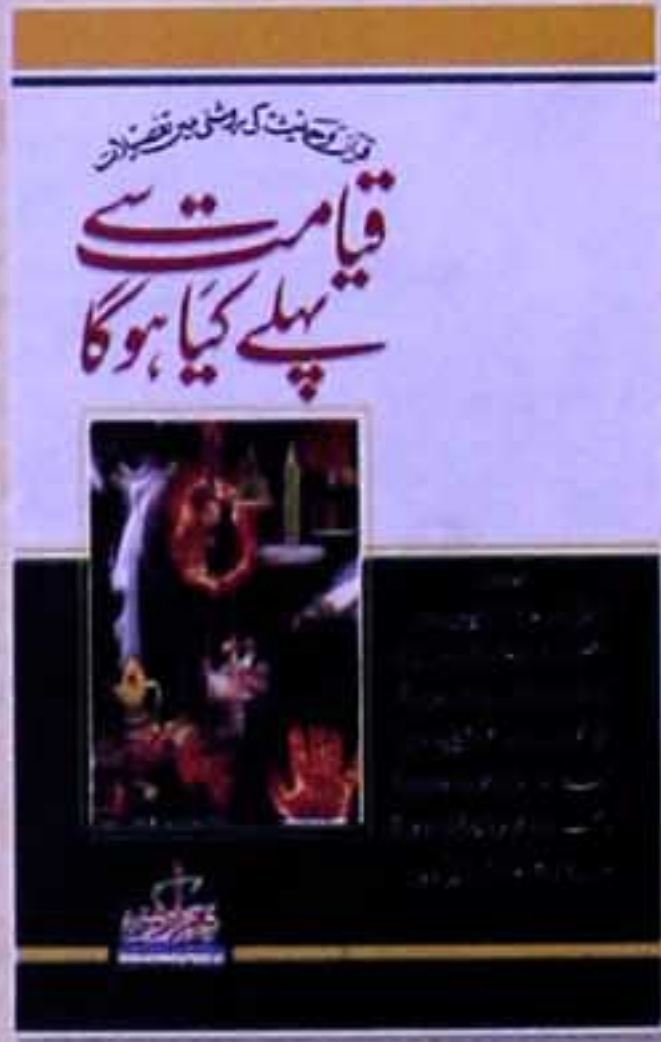
لَكَيْلًا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ

مہر تریف کے س پہنچ کر تصور کرنا ہے کہ کچھ ان ہی میقات پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم زور دے رہے ہیں اور وہ انہیں اپنے قلب میں اتار رہا ہے، اور اپنے تحت شعوری نفس میں انہیں پختہ کر رہا ہے۔

حج و زیارت کے اعمال میں یہ ہے دل کا ولیفہ، جس کے اجمال کا ذکر ہوا۔ اس طرح فارغ

ہو کر حاجی فرط مسرت سے حج اٹھتا ہے۔

نازم بچشم خود که جمالی تو دیده است
 افتم بپیک خود که بگویت رسیده است
 هر دم هزارا بوسه زخم دست خویش را
 کو مانت لافچه لبویم کشیده است



یوسف مارکیٹ • غزنی سٹریٹ
اردو بازار • لاہور
فون 042-37124354 فیکس 042-37352795

پروکریسٹوبکس